ہے رہنمائے خلق عمل جس کے نیک ہیں
کافر ہو وہ عقیدہ میں یا دیندار ہو (ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

مرتبہ
میاں بشیر احمد۔ بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء۔ ایڈیٹر
مولینا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق مینجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

محمد حسن خوشنویس

فہرست مضامین "ہمایوں"

بابت ماہ مارچ ۱۹۳۲ء

تصویر:- جلوہ گاہ

اعلان

ہمایوں کے سالانہ چندے میں مستقل تخفیف

ہمایوں کا سالانہ چندہ اب تک پانچ روپے (علاوہ محصول ڈاک) رہا۔ دسویں سالگرہ کے موقع پر ہم نے نومبر دسمبر کے لئے عارضی طور پر رعایتی چندے کا اعلان کیا تھا۔ اس دو مہینے کے عرصے میں ہمایوں کی اشاعت نے اس سرعت کے ساتھ ترقی کی کہ چند ہی دنوں کے اندر خریداروں میں سابق تعداد کے ایک ثلث کا گرانقدر اضافہ ہو گیا۔

اس واقعہ سے ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ شائقینِ ادب کی ایک عظیم الشان تعداد ہمایوں کی خریداری کی دل سے خواہشمند ہے۔ مگر چونکہ "ہمایوں" کا چندہ اکثر رسالوں سے زیادہ ہے اور ملک کی اقتصادی حالت بے انتہا پست ہے اس لئے اکثر لوگ رسالوں کے زیادہ چندے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

"ہمایوں" کا بلند معیار قائم رکھنے کے لئے ہمیں پہلے ہی مقابلۃً زیادہ مصارف کا متحمل ہونا پڑتا ہے اور اگرچہ موجودہ مصارف کے پیشِ نظر کسی قسم کی مستقل یا عارضی تخفیف کی گنجائش نہیں مگر ہمارا مطمحِ نظر عموماً محض تجارتی نہیں رہا۔ ہمایوں سے اگر زبان و ادب کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ اور ملک کو اس کی ضرورت ہے تو ہم پہلے کی طرح اب بھی ایک حد تک نقصان برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ اس اعلان کے بعد **ہمایوں کا سالانہ چندہ پانچ روپے کے بجائے چار روپے (علاوہ محصول) ہوگا۔**

موجودہ صورت میں ایک کاپی کی کمی ناگزیر تھی۔ لیکن چونکہ جنوری ۱۹۳۲ء سے قبل ہمایوں کے ایک صفحہ میں ۲۳ سطریں ہوتی تھیں اور اب ۲۵ ہیں۔ اس کے علاوہ خط بھی زیادہ خفی ہو گیا ہے اس لئے موادِ مطالعہ پہلے سے زیادہ یعنی تقریباً ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ موجودہ رسالے سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

امید ہے کہ شائقینِ "ہمایوں" اس رعایتی چندے سے فائدہ اٹھائیں گے اور ناظرینِ "ہمایوں" رسالے کی توسیعِ اشاعت میں حسبِ سابق ہماری مدد کر کے زبان و ادب کی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

جن حضرات کی خریداری کی درخواستیں یکم اپریل سے پہلے دفترِ "ہمایوں" میں پہنچ جائیں گی۔ ان کو ہمایوں کا ایک ضخیم سالگرہ نمبر جس میں اردو زبان کے بہترین ادیبوں کے مضامینِ نظم و نثر جمع ہیں۔ **بالکل مفت نذر کیا جائے گا۔** اس شاندار نمبر کا سرورق رنگین اور خوبصورت ہے۔ اس کے علاوہ متعدد ہاف ٹون اور رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔ صرف اسی نمبر کی الگ قیمت عہ روپیہ ہے۔ مگر نئے خریداروں کو یہ سال بھر کے بارہ پرچوں کے علاوہ بلا قیمت بھیجا جائے گا فرمائشیں جلد بھیجئے اور بھجوائیے۔

ناظم دفترِ **"ہمایوں"**

۲۳ لارنس روڈ۔ لاہور۔

جلوہ گاہ

CALCUTTA ART PG WORKS, LAHORE
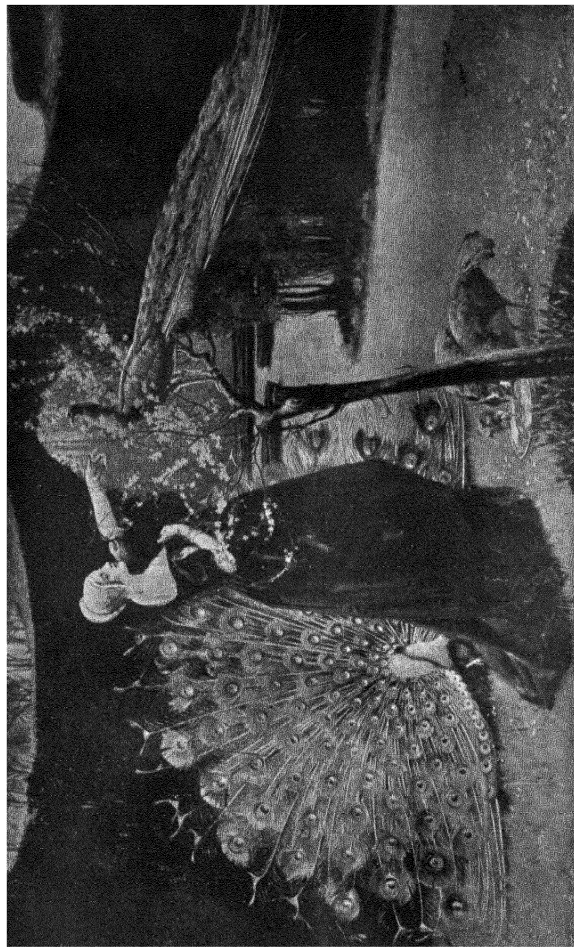
جہاں نما

ہندوستان کا افلاس

مسٹر بریلز فورڈ رسالہ ایشیا میں ہندوستان کے افلاس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی آبادی کا غریب حصہ اس قدر فاقہ کش اور کمزور ہے۔ کہ وہاں اوسط عمر کی توقع ۲۳ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ انگلستان میں اوسط عمر ۵۴ سال ہے۔ ہندوستان میں صرف ملیریا ہی سے ہر سال دس لاکھ انسان ہلاک ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ محض آب و ہوا کی خرابی نہیں قرار دی جاسکتی۔ بنارس کی آبادی کے یورپین حصہ میں موت کا اوسط ۱۲ فی ہزار ہے اس کے مقابلہ میں شہر کے اندر اس کا اوسط ۴۶ فی ہزار ہے۔ یہاں بچوں کی اموات کا اوسط ۴۱۹ فی ہزار ہے۔ حالانکہ انگلستان میں یہ ۷۰ سے زیادہ نہیں۔

مسٹر بریلز فورڈ حکمران جماعت کے ساتھ سود خواروں اور زمینداروں کو بھی دیہاتی آبادی کے افلاس و زبون حالی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریزی حکومت کا قیام اور ہندوستان کا قابلِ اعتراض رسم و رواج دونوں یکساں اس ابتری کے لئے جواب دہ ہیں بعض صورتوں میں تو غیر ملکی حکومت کی برکات ہی دیہاتیوں کے لئے بلائے جاں ثابت ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ریلوے کو لیجئے۔ ریل نے قریہ قریہ میں مشین کی تیار کردہ ارزاں مصنوعات کا ایک طوفان برپا کر دیا ہے نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دیہاتی دستکار اور صناع بھی قوتِ لایموت حاصل کرنے کے لئے کاشتکاری پر مجبور ہو گئے۔ حالانکہ قابلِ کاشت اراضی پر پہلے ہی ضرورت سے زیادہ ہجوم ہو رہا تھا۔"

زندگی کے بہترین دس سال

ریورنڈ ہارٹن نے انسان کی زندگی کو دس سال کے حصوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے۔

۱۔ خالص اور بے فکر مسرت کا زمانہ: ایک سے دس سال کی عمر تک۔

۲۔ زندگی کی مسرتوں کے شدید پذیریں احساس کا زمانہ: دس سے بیس سال کی عمر تک۔

۳۔ فنونِ لطیفہ کے متعلق احساس کی بیداری کا زمانہ: بیس سے تیس سال کی عمر تک۔

۴۔ خدمت و عمل کا بہترین وقت: تیس سے چالیس سال تک۔

۵۔ باہمی انسانی تعلقات کا دور: چالیس سے پچاس سال کی عمر تک۔

۵۰ پچاس سے آخر عمر تک تکمیل و اتمام کا زمانہ ہے۔
۷۰ ستر میں زیادہ گہری ہوتی ہیں۔ ناکامی اور مایوسی کے رنج سے آلودہ۔ تعلقات کا احساس بھی زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ اور انجام کار دو جہان کا رشتہ ٹوٹتا ہے۔

ٹکٹ جمع کرنے کا شوق

دنیا میں ٹکٹوں کا سب سے عظیم الشان مجموعہ بیرن فیریرے (پیرس) کے خاندان میں ہے۔ اس مجموعہ کی ابتدا ۱۸۶۵ء میں ہوئی تھی اور اس کا مالک آج تک اس پر .... پونڈ یعنی ساٹھ لاکھ روپیہ صرف کر چکا ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً ہر اُس ٹکٹ کا جو آج تک کہیں بھی جاری ہوا ایک استعمال شدہ اور ایک غیر مستعمل نمونہ ہے ——— مجموعی طور پر پانچ لاکھ سے زائد مختلف نمونے ہیں!

سینما کا مستقبل

جب سے سنیمٹوگراف ایجاد ہوا ہے بعض بہترین دماغ اس کے نقائص دور کرنے کے لئے وقف ہیں۔
توقع کی جاتی ہے۔ کہ وہ زمانہ زیادہ دور نہیں جب فلمیں حقیقت سے اس قدر مشابہ ہو جائیں گی کہ دیکھنے والوں کے لئے یہ بتانا مشکل ہوگا۔ کہ وہ زندہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھ رہے ہیں یا محض انہیں ان کی تصویریں نظر آرہی ہیں۔ ایک حیرت انگیز نیا طریقہ دریافت بھی ہو چکا ہے اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے۔ کہ فلمیں بالکل حقیقت کے مطابق بنائی جا سکتی ہیں۔
پردہ استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ ہال کے ہر حصہ میں فلمیں عکس ریز ہو سکتی ہیں۔ ایکٹر اور نظارے وغیرہ بالکل حقیقی اجسام کی طرح ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے متعلق تفصیلات ابھی معلوم نہیں ہوئیں کیونکہ تجربے انتہائی اخفا کے ساتھ مقفل دروازوں کے اندر ہوتے رہے ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ ان تجربوں کے دوران میں ایسے لنز استعمال کئے گئے جن کی جسامت مختلف تھی اور جن میں فصل ماسکہ کا اختلاف بھی پایا جاتا تھا۔

سر محمد شفیع

مشہور انگریزی رسالہ ماڈرن ریویو اپنی فروری کی اشاعت میں رقم طراز ہے۔
سر محمد شفیع کا انتقال صرف مسلمانوں ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ تمام ہندوستانی قوم کا نقصان ہے۔ اُن کی ہستی فرقہ پرست سیاست دان سے بالا رکھتی اُن کی فرقہ دارانہ سیاسیات میں متعصبانہ جوش تھا وہ لوگ جو ان سے ملے ہیں اُن کا قول ہے کہ اُن کی فرقہ پرستی محض ایک ارتقائی زینہ تھی جسے وہ عام قومیت پر پہنچنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے چنانچہ ان کی قابل صاحبزادی بیگم شاہنواز کی مقابلتہً زیادہ قوم پرستانہ تقریریں میاں صاحب کے حقیقی مطمح نظر کا عکس سمجھی گئیں۔ ان کی صاحبزادی کی اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت عورتوں کے متعلق اُن کے خیالات اور طرز عمل کی آئینہ دار ہے۔
ذاتی اور شخصی تعلقات میں وہ انتہائی رواداری برتتے تھے۔ اور مذہب و ملت کی عام تفریقات کے پابند نہ تھے۔

میاں سر محمد شفیع کی شاعری

ذیل کے اشعار سر عبدالقادر کے نوٹ کے ساتھ مخزن بابت نومبر ۱۹۰۲ء سے نقل کئے جاتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ میاں سر محمد شفیع مرحوم فن شعر میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اس لئے اُن کے یہ دلکش اشعار اکثر لوگوں کے لئے ایک انکشاف ثابت ہونگے شیخ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں کہ اگست و ستمبر گذشتہ میں ایڈیٹر مخزن کو خوش قسمتی سے سیر کشمیر کا اتفاق ہوا مولوی محمد شاہ دین صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا اور میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لا جیسے ذی علم اور طباع دوست رفیق راہ اور شریک سفر تھے دن رات گل و گلزار اور باغ و راغ کے نظاروں کے ساتھ دو بامذاق حضرات کے علمی مباحثوں کا تماشا پیش نظر رہا اور علمی چرچے رہے۔ وہاں کچھ شعر و شاعری کی بھی باری آئی مولوی محمد شاہ دین صاحب نے دو تین نتیجہ خیز غزلیں ان دنوں میں لکھیں جو ابھی صاف نہیں ہوئیں سر دست میاں محمد شفیع صاحب کی طبع آزمائی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو انہوں نے عمر میں پہلی دفعہ کی ہے۔ صاحب موصوف انگریزی میں کبھی کبھی نظم لکھتے رہے ہیں، جو اخبار آبزرور میں چھپ کر مقبول ہوتی رہی ہے۔ اردو میں آج تک انہیں کبھی لکھنے کا موقع نہیں ہوا تھا۔ مگر چونکہ قدرتاً طبیعت موزون پائی تھی کشمیر کی آب و ہوا نے گدگدا کر یہ چند شعر نکلوا لئے۔

وادیِ لدر

یہ کشمیر کے دل کشا مرغزار ۔۔۔ یہ پانی، یہ شمشاد و سرو و چنار
یہ سرسبز دشت اور یہ کوہسار ۔۔۔ سدا جن میں رہتی ہے گل کی بہار
ہیں بے شبہ جاں بخش و فرحت فزا
یہ سب ہیچ تجھ بن ہیں اے مہ لقا

یہ دلکش لدر کی ہے وادی جہاں ۔۔۔ سہانا ہے قدرت نے باندھا سماں
زمیں ایسی پائے مسافر کہاں ۔۔۔ کہے صنعتِ حق کی جو داستاں
گھری ہے پہاڑوں سے چاروں طرف
ہیں اشجار سرسبز یاں گل بکف

سدا راگ گاتے ہیں یاں آبشار ۔۔۔ ہیں عاشق کے دل کی طرح بے قرار
ہمیشہ اگرچہ ہیں خود دل فگار ۔۔۔ پہ ہے رونقِ گل کا ان پر مدار
چمن گر کھلے ہیں تو ان کے طفیل
جو میداں ہرے ہیں تو ان کے طفیل

کناروں پہ ان کے درختِ چنار ۔۔۔ ہے جنگل کا شاہنشہ باوقار
مسافر کا ہے دوست لیل و نہار ۔۔۔ اسے دیکھ کر ہے مری جانِ زار
مسرت کے ہے جوش سے شادماں
کہ سایہ ہے اس کا فرح بخشِ جاں

یہ گھیرے ہیں وادی کو کوہِ بلند ۔۔۔ نہ رستم کی بھی جن پہ پہنچے کمند
ہیں نیچر کے عشاق کے دل پسند ۔۔۔ عجب رازِ قدرت کے ہیں ان میں بند
لئے تاج سر پر ہیں اشجار کے
ہیں تختِ رواں رکھتے انہار کے

یہ وادی کی جاں بخش تازہ ہوا ۔۔۔ ہے جس سے دلِ ناشگفتہ کھلا
مرے پاس لاتی ہے تجھ سے سدا ۔۔۔ پیامِ محبت سلامِ وفا
محبت کی بو اس میں پاتا ہوں میں
تو پھولا نہیں پھر سماتا ہوں میں

سکر سے چلے جب سوئے پہل گام ۔۔۔ ہوا دل مرا اور بھی شادکام
دلآویز و دلکش تھا ہر اک مقام ۔۔۔ صداقت کو پہنچا کسی کا کلام
کہ فردوس دنیا میں ہے گر کہیں
یہیں ہے یہیں ہے یہیں ہے یہیں

م ۔ ش

جمعیت الاقوام کا تاریخی پہلو

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ کہ جمعیت الاقوام پریذیڈنٹ ولسن کی اختراع ہے۔ مگر تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں۔

مختلف قوموں کا کسی غرض سے یکجا ہونا معمولی بات ہے۔ اس یکجائی کی دو صورتیں ہیں:-

۱۔ آزاد قوموں یا طاقتوں کا کسی خاص مقصد کے لئے جارحانہ یا مدافعانہ اتحاد۔ جیسے محمود غزنوی کے حملوں سے بچنے کے لئے ایک موقع پر ہندوستان کے تمام راجا متحد ہو گئے تھے۔ یا اسی طرح وجے نگر کے آخری فرمانروا رام راجا کے خلاف احمد نگر گولکنڈہ بیدر بیجاپور کے مسلمان سلاطین متحد ہو کر تلی کوٹ کے مقام پر لڑے اور وجے نگر کے دفار کا قلع قمع کر دیا تھا۔

۲۔ مختلف غلام قوموں کا کسی حکمران قوم کے زیر سایہ یکجا ہونا اس کی مثالیں تاریخ کی عظیم الشان سلطنتوں میں ملیں گی۔ سلطنتِ عباسیہ کی حکومت عربوں۔ ایرانیوں۔ ترکوں۔ افغانوں۔ حبشیوں اور دوسری قوموں پر تھی۔ سلطنت عثمانیہ کے ماتحت مشرقی یورپ کی گوناگوں اقوام بھی تھیں۔ یہی حال کم و بیش دوسری سلطنتوں کا بھی ہے۔

یورپ میں جمعیت الاقوام کی سب سے پرانی مثال ایمفک ٹیونک لیگ ہے۔ اس جمعیت میں یونان کی وہ تمام ریاستیں شامل تھیں۔ جو ڈلفی کے مندر میں پرستش کرتی تھیں۔ جمعیت کا مقصد اس مندر کی محافظت تھا۔ (سومناتھ کے مندر کی محافظت بھی اسی طور پر تھی)

یونانی اقتدار کے خاتمے پر سلطنتِ روما معرضِ وجود میں آئی۔ یہ صحیح معنوں میں اُن مختلف اقوام کی ایک جمعیت تھی۔ جو روما کے عقابی جھنڈے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتی تھیں۔ ان میں برٹن (انگریز) گال (فرانسیسی) اور مختلف گاتھ (جرمن) لوگ شامل تھے۔ ان سب پر رومن تہذیب۔ رومن قانون اور ایک حد تک رومن (لاطینی) زبان غالب تھی۔

جب روما کو زوال ہوا۔ تو اس کی بجائے یورپ کی مختلف قوموں کا ایک مذہبی اتحاد ایک مسیحی شہنشاہ اور پوپ کے زیر سایہ قائم ہوا جس کا نام مقدس رومن سلطنت تھا یہ سلطنت شارلیمین شاہِ فرانس کے ہاتھوں قائم ہوئی اور نپولین اعظم کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سلطنت کے شہنشاہ اکثر آسٹریا کے شاہی خاندان (ہپس برگ) سے ہوتے تھے بظاہر شہنشاہ کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ مگر عام طور پر اس انتخاب کی حیثیت ایک کھیل سے زیادہ نہ ہوتی تھی

مقدس رومن سلطنت کا خاتمہ ہونے سے پہلے اس کے اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس کے دو سبب تھے۔ پہلا سبب

وہ ذہنی اور روحانی انقلاب جو حروب صلیبیہ کے زیر اثر پیدا ہوا۔ اور فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) کے بعد یورپ کے گوشے گوشے پر ظہور میں آیا یعنی ریناسانس۔ اور دوسرا سبب وہ مذہبی اختلافات جنہیں ریفارمیشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو زیادہ تر اسلامی اصولوں کے تتبع کی وجہ سے پیدا ہوتے۔ بہرحال ان دونوں تحریکوں کا یہ اثر ہوا کہ یورپ کا اتحاد نہ رہا اور "قومیت" اور "وطنیت" کے تصور کی ابتدا ہوئی مختلف قوموں کو اپنے سامنے ترقی کی ایک نئی دنیا نظر آئی اور ایک مقابلے کی دوڑ شروع ہوئی جس میں قدم قدم پر لڑائی جھگڑے کا سامان تھا۔

اس صورت حالات میں قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ درپیش ہوا جس کے حل کی دو قسم کے اشخاص نے کوشش کی۔ ماکیا فیلی اور اس کے اطالوی ہم خیالوں کی رائے میں ایک قوم کی بہترین حکمت عملی خود غرضی ہے۔ البتہ یہ خود غرضی ظاہر نہیں ہونی چاہئے۔ یعنی مختلف اغراض کے ظاہری پردے میں اپنی خود غرضی کو فروغ دینا چاہئے۔ برخلاف اس کے ایک بڑے گروہ نے وقتاً فوقتاً چند بین الاقوامی اصول وضع کرنے کی کوشش کی۔ اور صلح عمومی کے ذرائع پر غور کیا۔ سولھویں صدی کے شروع میں ایمرش کروسے نے اپنی ایک کتاب میں ایک بین الاقوامی مجلس کے انعقاد کی تجویز پیش کی جو مختلف قوموں کے باہمی جھگڑے فیصل کیا کرے۔ ایک ایسی ہی تجویز فرانس کے بادشاہ ہنری چہارم کے وزیر اعظم سلی کی خود نوشتہ سوانحعمری میں بھی موجود ہے۔

۱۶۹۳ء میں ایک مشہور انگریز ولیم پن (جس کے نام پر امریکہ میں پن سل وینیا کا علاقہ آباد ہوا) نے بین الاقوامی تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے قوموں کی پارلیمنٹ تجویز کی۔ جس کے ارکان یورپ کے فرمانروایان کے نامزدگان ہوں۔ جو عدل و انصاف کا دور دنیا میں قائم کریں۔ اس پارلیمنٹ کی دو زبانیں ہوں۔ لاطینی اور فرانسیسی کسی معاملے میں فیصلہ دینے کے لئے رائیں لی جائیں۔ رائے دینا پوشیدہ طور سے ہو مگر ہر ایک کے لئے ضروری۔

ولیم پن کے کچھ عرصہ بعد ایبے سینٹ پیار نے ایک "عہد نامۂ صلح دائمی" پر خیال آرائی کی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک مستقل جمعیت قائم کی جائے۔ جو ہر قسم کے بین الاقوامی اختلاف کو دور کرنے کی کوشش کرے جھگڑے فیصل کرے جس قوم کا قصور ہو اُسے سزا دے۔ اور سزا دینے کے لئے دوسری قومیں اپنی اپنی فوجوں سے اس جمعیت کی امداد کریں۔

انہی لوگوں کی طرح مشہور و معروف جرمن فلسفی امانوِل کانٹ نے بھی "دائمی صلح" پر ایک کتاب لکھی جس میں آزاد حکمران ریاستوں کی ایک جمعیت کا خیال موجود تھا۔

ان لوگوں کی صلح جوئی سے دنیا کو بہت فائدہ پہنچا مگر سب سے زیادہ فائدہ ہیوگو گروٹی اس کی ذات سے ہوا کیونکہ اس نے بین الاقوامی قانون کی بنیاد ڈالی۔ اور ایسے اصول وضع کئے۔ جو صلح اور جنگ دونوں میں قوموں کی رہنمائی کرسکیں یہ اصول اس کی کتاب میں موجود ہیں۔ جو یورپ کی "جنگ سی سالہ" کی وحشیانہ کارروائیوں سے متاثر ہو کر ۱۶۲۵ء میں لکھی گئی۔

اب ہمیں چند اور واقعات کا جائزہ لینا ہے جنہیں موجودہ جمعیت الاقوام کے وجود سے بہت گہرا تعلق ہے جب سولھویں صدی میں ہنری ہشتم شاہِ انگلستان ۔ فرانسس اول شاہِ فرانس اور چارلس پنجم شاہِ سپین و شہنشاہِ مقدس رومن سلطنت کے درمیان لڑائیاں ہوئیں تو یورپ کی سیاسیات میں "توازنِ قوت" کا اصول قائم ہُوا۔ یہ اصول ایک فرانسیسی مصنف فنیلون نے نہایت مختصر مگر واضح الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:-

"یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگر کمزور سلطنتیں طاقتور سلطنتوں کے مقابلے پر متحد نہ ہوں۔ تو وہ طاقتور سلطنتیں ان کو شکست دے کر ان پر قابو پالیں گی"۔

اس اصول پر چلتے ہوئے یورپ کی سلطنتوں نے لوئی چہاردہم شاہِ فرانس اور نپولین کے خلاف جو عمل کیا اس کا مفصل ذکر ضروری نہیں مختصر یہ کہ ان دونوں حکمرانوں کی شکست اور تباہی کا باعث یہی "توازنِ قوت" کا اصول تھا۔

نپولین کی شکست کے بعد الگزنڈر اول زارِ روس کی تحریک پر ۱۸۱۵ء میں یورپ کی طاقتوں نے مل کر ایک "مجلسِ دول" قائم کی جس کا عام نام "اتحادِ مقدس" ہے۔ یورپ کے بادشاہوں نے مل کر یہ عہد کیا کہ وہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں لڑیں گے۔ مذہب عیسوی کے اصولوں پر کاربند رہیں گے۔ اور اپنی اپنی رعایا کے ساتھ عدل و انصاف روا رکھیں گے۔ بظاہر یہ ایک نہایت اچھا عہد نامہ تھا۔ مگر جیسا کہ لازم تھا کچھ عرصے کے بعد یہ اتحادِ مقدس اور اس کا سارا تقدس غائب ہو گیا اور دنیا کو اس کے پردے میں چند مطلق العنان بوالہوسوں کی ٹولی نظر آنے لگی جس کا کام محض استبداد کو فروغ دینا اور آزادئ جمہور کو سلب کرنا تھا۔ اس طرزِ عمل کی بدترین صورت میٹرنک وزیر آسٹریا کی کارروائیوں میں ملتی ہے۔

"اتحادِ مقدس" کے اس رویے کے خلاف انگلستان میں کیننگ اور امریکہ میں پریذیڈنٹ منرو نے احتجاج کیا۔ کیننگ وزیر اعظم برطانیہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا اچھا نہیں سمجھتا تھا (اتحادِ مقدس کے ارکان ہر ایک ملک میں آزادی کی روح کو کچلنا چاہتے تھے) چنانچہ جب "اتحادِ مقدس" نے سپین کی تحریکِ آزادی کو دبانا چاہا۔ تو کیننگ نے اپنا مشہور "نظریۂ عدم مداخلت" پیش کیا۔ اسی طرح منرو نے امریکہ کی یورپ سے اور یورپ کی امریکہ سے سیاسی بے تعلقی کا اعلان کیا۔

اس سیاسی ارتقا کے پہلو بہ پہلو بین الاقوامی قانون کا بھی ارتقا ہُوا جس کی وجہ زیادہ تر انگریزی عدالتِ بحری کے جج ولیم سکاٹ (لارڈ سٹوول) کے وہ فیصلے ہیں جو اس نے وقتاً فوقتاً صادر کئے اس کا قول ہے کہ اگرچہ بحری عدالت کی قانونی طاقت ایک ملک میں محدود ہے مگر اس کا قانون ایک غیر محدود بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک جج کو چاہئے کہ وہ اپنے ملک کی فوری سیاسی ضرورتوں سے متاثر نہ ہو۔ اور ان کو پورا کرنے کی غرض سے متضاد فیصلے صادر نہ کرے بلکہ انصاف سے کام لے کر ایسے اصولوں پر چلے جو ہر موقع پر ہر ملک میں روا رکھے جاسکیں۔ لارڈ سٹوول نے اپنا ہر ایک

فیصلہ اپنی انصاف کے اصولوں پر صادر کیا۔ اور اسی وجہ سے اسے بقائے دوام کا استحقاق ہے بین الاقوامی قانون اور خصوصاً بحری قانون کے معاملے میں لارڈ اسٹویل کے بعد امریکن وکلا اسٹوری اور مارشل بھی قابل ذکر ہیں۔

اس ارتقائی سلسلے میں جس کا ذکر اب تک ہوا ہے موجودہ جمعیت الاقوام کی تشکیل ہو رہی تھی اس جمعیت کی بنا نکولس ثانی آخری زار روس کے ہاتھوں رکھی گئی۔ زار نے اپنے وزیر خارجہ کاونٹ موراویف کی وساطت سے ۲۴ راگست ۱۸۹۸ء اور دوبارہ ۱۱ر جنوری ۱۸۹۹ء کو یورپین سلطنتوں کو صلح عمومی اور تخفیف اسلحہ کی دعوت دی۔ ابتدا میں تو اس دعوت پر کسی نے توجہ نہ کی مگر ۱۰ رمئی ۱۸۹۹ء کو ایک روسی نمائندہ کی صدارت میں پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں چند قراردادیں منظور کی گئیں اور چند تقریریں ہوئیں۔ مزید براں ایک اور کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی گئی جو ۱۹۰۷ء میں ہیگ ہی میں ہوئی اور دوسری ہیگ کانفرنس کہلاتی ہے

ہیگ کانفرنس کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات "قصر صلح" کی تعمیر ہے یہ قصر ۱۸۹۹ء میں ہیگ میں تیار ہوا اس کے لئے آہنی دروازے جرمنی نے مہیا کئے پتھر سکنڈے نیویا سے آیا۔ کھڑکیوں کے لئے رنگین شیشے برطانیہ نے دئے ریشمی پردے جاپان نے گلدان چین نے اور لکڑی جنوبی امریکہ نے اس قصر کو آج بھی ایک امتیاز خصوصی حاصل ہے کیونکہ اس میں بین الاقوامی عدالت کا اجلاس ہوتا ہے ہیگ کی مختلف کانفرنسیں اسی میں ہوئیں ایک کانفرنس جنگ عظیم سے پہلے ہونے والی تھی جو جنگ کی وجہ سے نہ ہو سکی۔

شاید اقبال نے اسی کو مدنظر رکھ کر کہا ہے:-

این بوالہوس صنم کدۂ صلح عام ساخت	رقصید گرد او بنواہائے جنگ و عود
دیدم چو جنگ پردۂ ناموس او درید	جز لیسفلٹ الدمسلو وخصیمٌ مبین نبود

جنگ عظیم ابھی بالکل تازہ واقعہ ہے۔ اس کی تباہ کاریوں کی تفصیل بے سود ہے اگر کسی نے ان کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو مسٹر کربی پیج کی تصنیفات موجود ہیں۔ خلاصہ یہ سمجھئے کہ بہت سے مغربی مصنفوں کے خیال میں ایک ایسی ہی جنگ دنیا میں اور ہو جائے تو انسانی تہذیب و تمدن بلکہ نسل انسانی کا خاتمہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ اندیشہ دوران جنگ ہی میں پیدا ہو گیا تھا چنانچہ حکومت برطانیہ نے فلی مور کیمٹی کو ایک جمعیت الاقوام کی تجویز پر غور کرنے کے لئے مقرر کیا اس کمیٹی کی رپورٹ پر موجودہ لیگ کے عہد نامے کا بہت حد تک انحصار ہے یہ عہد نامہ پریذیڈنٹ ولسن کے ایما سے منظور کیا گیا اور ۲۸ر جون ۱۹۱۹ء کو جبکہ حادثہ سراجیو کی برسی تھی۔ اس پر بتیس قوموں نے دستخط کر دئے۔

ممتاز حسن

جو میں نے صرف کیا وہ میرا تھا۔
جو میں نے رکھا وہ کھو دیا۔
جو میں نے دیا وہ اب بھی میرا ہے۔

گلچیں

بسنت

گاؤ بسنت نہیں اب دیری　　سُکھ آنند کی آئی بیری

ساری دُنیا ہے دل شاد

آیا بَور اور پکّی بیری　　آئی قلمی آم میں کیری

بن بستی سب ہیں آباد

کوئل سنے نہ میری تیری　　کوک کوک لگاوے پھیری

ہردے وا کے پیتم یاد

سن تو سکھی تو، تُو جیت[1] چیری　　اسی سمے ہو پریم سے سیری

برہ کی آگ کرے برباد

سکھی یہی آسا ہے میری　　رکھوں مندروا گھی کی دیرٹی[2]

جب بھارت ہوئے آزاد

ہند دیش پر چھائی اندھیری　　کر پرمیشور رین اجیری

سُن لے بھارت کی فریاد

یہی دعا ہے داتا میری　　ملے ہند دیش کو سکھ سیری

اُجڑی نگری ہو آباد

سیّد مقبول حسین احمدپوری

[1] یعنی ہوشیار و عقلمند　[2] یعنی چراغ

اُردُو شاعری اور مُلکی سرمایہ

(۳)

کسی زبان کی شاعری کسی مخصوص طبقہ کی خوشنودی کے لئے اپنی فطرت وطبیعت نہیں بدل سکتی ایک طرف تو غزل اپنی شوخی و بیباکی سے ہاتھ دھونا خودکشی کے مرادف خیال کرتی ہے دوسری طرف سومیر و پربت کے دیوتا طنزیہ کلام برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے دونوں میں مصالحت ہو تو کیونکر اردو شاعری سومیرو پربت کی سیر کرنے سے قبل پروانۂ آزادی چاہتی ہے وہ دیوتائی بارگاہ کے آداب و مراسم سے ناواقف ہے ہندی صنمیات اور دیومالا کے افسانے اور روایتیں اس کے لئے بالکل اجنبی و نامانوس ہیں اگر اس کی رند مشربی و آزادہ روی میں کوئی رکاوٹ پیش ہو تو وہ دیوتائی دربار کی طرف رخ کرنا کبھی پسند نہ کرے گی طنز، شوخی، بیباکی صنفِ غزل کی امتیازی صفتیں ہیں کیا کوئی تدبیر ایسی ہے کہ شاہدِ غزل طنز و بیباکی اور شوخی و رنگینی کے اوصاف سے دست بردار ہوئے بغیر دیوتائی سبھا میں باریاب ہو سکے؟ کیا اس ملک کے باشندے جن کا جنونِ مذہبی پیپل کی پتی اور باجے کی آواز پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ لینے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ اپنے دیوتاؤں کی شان میں طنزیہ کلام یا بے تکی باتوں کے سننے کی تاب لا سکتے ہیں؟ اردو شاعری دیوتائی بارگاہ میں دست بستہ ہو کر یا اپنی زبان پر مہرِ سکوت لگا کر حاضر ہونے سے یہی بہتر سمجھتی ہے کہ نہ وہ خود سومیر و پربت کی طرف رخ کرے اور نہ اس پربت کے جبل نشین اس کی محفل میں داخل ہوں۔

اب تک ہندو دیومالا کی صرف ایک ہستی رادھا نے اردو ادب کی محفلِ طرب میں حاضر ہونے کے لئے آمادگی ظاہر کی ہے۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اس سے سوائے ناچ کے اور کوئی کام نہ لیا جائے اور پہلے سے نومن تیل کی فکر کر لی جائے لیکن نومن تیل کی مشعلیں جلانے اور رادھا کے ناچنے کے لئے اتنی وسیع جگہ درکار ہے کہ غزل کی بیت میں جو صرف دو مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اس کی گنجائش نکلنی مشکل ہے۔ اس لئے غزل کی محفل رادھا کے ناچ سے بھی محروم ہی رہا کی ہے البتہ اکبر الہ آبادی نے اپنی ایک محفل میں بڑی مشکلوں سے رادھا کے ناچ کا انتظام کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

قومی ترقی کی رادھا پیاری ۔۔۔ بیٹھی ہے پہنے جوڑا بھاری
نومن تیل کی فکر ہے طاری ۔۔۔ چندے کی تحریک ہے جاری

اگرچہ یہاں رادھا کے ناچ کے لئے نومن تیل کا بھی انتظام کر لیا گیا ہے لیکن غزل پکار اٹھتی ہے کہ اس دو بیتی محفل سے مجھے کوئی سروکار نہیں یہ تو قطعہ کی زمین ہے سچی بات تو یہ ہے کہ زمینِ غزل میں نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔"

خیر غزل ہیں نہ سہی قطعہ کی زمین میں تو علیم الطبع رادھا نے اپنے ناچ سے اہلِ محفل کو محظوظ و مسرور کر دیا۔ لیکن ہندی دیومالا کے دوسرے دیوتا تو اردو شاعری کی کسی مجلس میں شریک ہونا پسند نہیں فرماتے کیونکہ وہاں نہ انکی آرتی اور پوجا پاٹھ کا سامان ہے نہ ان کی ربوبیت و الوہیت کا کافی احترام۔ علاوہ بریں غزل کی محفل رنگین نہ میدانِ جنگ ہے نہ کشتی بازی کا اکھاڑہ جہاں رستم و سہراب یا ارجن و بھیم کو دعوت دے کر نیزہ بازی۔ تیر اندازی یا پہلوانی کا تماشا دیکھا جائے۔ البتہ دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری اور قوت و شوکت کی ناپائیداری بیان کرتے ہوئے شاعر کبھی کہدیتا ہے کہ ؎

اب نہ رستم نہ سام باقی ہے — اِک فقط نام ہی نام باقی ہے

لیکن ارجن اور بھیم کے پرستار کہیں گے کہ دیوتا غیر فانی ہوتے ہیں۔ انسانی روپ دھارن کرنے پر بھی وہ جامِ موت نوش نہیں کرتے بلکہ لوگوں کی نظر سے اُن کا لوپ ہو جاتا ہے ارجن اور بھیم مرے نہیں بلکہ اپنے بقیہ تین بھائیوں کے ساتھ زندہ سومیر و پربت پر چلے گئے شاعر نے جو کام رستم اور سام کی قوت و توانائی کی بے ثباتی سے لیا اور جو نتیجہ اخذ کیا۔ ان کا بھیم اور ارجن کے قصہ سے انجام پانا ممکن نہیں۔ قصائد میں ممدوح کو رستم و اسفندیار سے زیادہ دلاور اور طاقتور دکھایا جا سکتا ہے اس قسم کا مبالغہ صنائع و بدائع میں داخل ہے جس کا مقصد محض زینتِ کلام ہے لیکن شاعر کو ارجن اور بھیم کے معاملے میں اتنی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ مسلمان ممدوح کو تو محض غیریت۔ اجنبیت اور نامانوسیت کی بنا پر ہندو صنمیاتی سورماؤں کی تمثیل سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ اور اگر کسی ہندو ممدوح کی قوت و طاقت کو بھیم اور ارجن سے بالاتر دکھایا جائے تو اس کے مذہبی جذبہ کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے۔ البتہ مثنوی کے ذریعے جہاں رستم و سہراب کی داستان بیان کی گئی ہے وہاں منظوم اردو مہابھارت میں ارجن اور بھیم کے کارناموں کا بھی استقصا ہو چکا ہے لیکن شعریت سے نہ سہراب و رستم کی منظوم داستان کو کوئی تعلق ہے۔ نہ مہابھارت کے منظوم ترجمہ کو غرض کہ داخلی شاعری اور خصوصاً غزلیات میں ہندو صنمیاتی کردار و اشخاص کو ایرانی و عربی ابطال کے پہلو میں جگہ دینا شعریت و معنی آفرینی کو کند چھری سے ذبح کرنا ہے۔ علاوہ بریں گل و لالہ سنبل و ریحان نرگس و بنفشہ۔ سرو و شمشاد۔ بید و چنار وغیرہ کے بدلے جو ہندی پھول پودے پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً کلاب برکش اکشے بٹ کو کابیلی۔ جٹا دھاری سورج مکھی وغیرہ ان کا نام سنتے ہی غزل پکار اٹھتی ہے۔ کہ یہ میری زبان نہیں۔ یہ میرے محاورہ و روزمرہ کیخلاف ہیں۔ اگر یہ میرے پہلو میں رکھے جائیں۔ تو ہمیشہ خار بن کر کھٹکتے رہیں گے میری ساری رنگینی دلچسپی۔ شعریت۔ لطافت اور نزاکت کا خون ہو جائے گا۔ میں جس زبان کی شاعری کا دودھ پی کر پلی اور جوان ہوئی ہوں اس زبان کی بعض پیچیدہ ترکیبیں اور مغلق و ثقیل الفاظ جب میری طبع نازک پر گراں گذرتے ہیں۔ تو ایک اجنبی زبان کے خواہ وہ میری ہمسایہ ہی کیوں نہ ہو ثقیل کرخت اور کثیف و نامطبوع الفاظ کو میری نازک مزاجی کب برداشت کر سکتی ہے؟

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لیلیٰ و مجنوں شیریں و فرہاد۔ گل و بلبل۔ شمع و پروانہ۔ سرو و شمشاد۔ نرگس و سوسن کوہِ طور و کوہِ الوند۔ دجلہ و فرات۔ قیصر و کسریٰ جمشید و فریدوں۔ خضر و سکندر۔ ارژنگِ مانی۔ کاخِ مصور۔ پیراہنِ یوسف۔ چاہِ کنعان

چاہِ نخشب بحرِ ظلمات آبِ حیواں اور اس قسم کے سینکڑوں نام جن سے اردو شاعری کی محفل سجائی جاتی ہے۔ ہزاروں بار سینکڑوں پہلوؤں سے بندھتے آئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر لفظ کے ساتھ بیشمار تلازمات اشارات تلمیحات ایتلافات خیالات تصورات اور واقعات وابستہ ہو گئے ہیں جس طرح جریب کی ایک کڑی کھینچنے سے تمام کڑیوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح ان میں سے کسی لفظ سے گوش آشنا ہوتے ہی اس کے تمام تلازمات ایتلافات و توابعات حافظہ کی نیم شعوری سطح سے اُبھر کر چشم تخیل کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ لارڈ میکالے نے ملٹن کے شاعرانہ الفاظ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف ان پر بھی صحیح اترتا ہے اگرچہ ان الفاظ کے لغوی معنی وظاہر مفہوم معمولی ہیں لیکن ہر لفظ کے اندر دریائے معنی پوشیدہ۔ وہ معمولی لفظ نہیں بلکہ منتر کے الجھر ہیں ان کے زبان پر آتے ہی ماضی مبدل بہ حال اور بعید چیزیں قریب ہو جاتی ہیں حُسن کے نئے نئے پیکر جلوہ گر ہونے لگتے ہیں دماغ گڑے مُردوں کو اکھاڑ باہر کرتا ہے یعنی بھولی بسری باتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے خوابیدہ داستانیں اور افسانے بیدار ہو جاتے ہیں لیکن ان کا مرادف یا بدل استعمال کرو کوہ طور کو سمیرو پربت سے یا بلبل کو کوئل سے یا مجنوں کو نل سے بدلو آن کی آن میں سارا طلسم ٹوٹ جائیگا تمام سحر کاریاں غائب ہو جائینگی دفتر معنی کا باب مسدود ہو جائے گا۔ ساری دلچسپیاں مفقود ہو جائیں گی تلازمات و ایتلافات کی زنجیر کٹ جائیگی، ان فسوں کارانہ الفاظ کو تبدیل کر دینے کے بعد بھی جو شخص سابقہ طلسمی مناظر و مرایا کے ہم آغوشِ نظر ہونے کی توقع کرے گا۔ اس کو ویسی ہی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے گا جیسی الف لیلہ کے قاسم کو درپیش آئی تھیں جبکہ وہ جادو کے دروازہ کو "کھل گیہوں کھل جو کھل چنا کھل مونگ" وغیرہ کہکر کھولنا چاہتا تھا حالانکہ وہ صرف "کھُل سِم سِم" کے منتر سے وا ہوتا تھا۔ اگر ان الفاظ کو شعر میں نہ باندھ کر یونہی یکے بعد دیگرے زبان پر لایا جائے تو بھی ہر نام کے ساتھ ذہن کے سامنے ایک رنگین طلسمی پردہ آتا جائیگا جس پر مختلف افسانوں مختلف حکایتوں اور مختلف واقعات کے نقوش ثبت ہونگے اور دماغ صورِ متحرکہ کی تماشاگاہ بن جائے گا۔ جب انفرادی الفاظ میں اس قدر طلسمی اثر کوٹ کر بھرا ہوا ہے تو شعر میں بند ھنے پر وہ نہ معلوم کیا قیامت برپا کریں گے۔ ان منتروں کو ہندی الفاظ سے بدل دینے پر شعر کا سارا سحر کارانہ اثر زائل ہو جائے گا۔

انگلستان کے مشہور نقاد مسٹر ابر کرامبی کا قول ہے۔ کہ صرف واقعات کو منظوم کر دینا شاعری نہیں بلکہ محض نظم نگاری ہے۔ شاعری کی پہلی ضروری صفت "فسوں کاری" ہے "فسوں کاری" کا کام صرف ہمیں مسرور و مسحور کرنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی اس کے وظیفے میں شامل ہے کہ وہ ہماری چشم بصیرت میں ایسی روشنی پیدا کرے کہ ہماری نگاہیں عالم محویت میں بھی اشیا کے ظاہری پردوں سے گذر کر ان کے بطون و دروں تک پہنچیں اور پُراسرار حقائق دریافت کر سکیں۔ بغیر "فسوں کارانہ" صفت کی موجودگی کے کسی کلام میں شعریت کی اصل روح پیدا نہیں ہو سکتی لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ شاعری کا ہر لفظ اور ہر فقرہ ساحرانہ ہوتا ہے بسا اوقات طویل مسلسل نظموں میں سطروں کی سطریں پڑھ لینے پر بھی کوئی مسحور کن فقرہ نہیں ملتا اور ہم اکتا کر کہنے لگتے ہیں کہ شاعر نے کاوش و کاہش تو سخت کی ہے لیکن اس کے کلام میں شعریت کی روح مفقود ہے مگر مستقل مزاج قاری صبر و تحمل سے کام لیتا ہے اس کی نگاہیں گرم تلاش رہتی ہیں بالآخر بعد بسیار انتظار جب ساحرانہ فقرہ مل جاتا ہے تو اس پر محویت و بیخودی کی حالت طاری ہو جاتی ہے یہ ساحرانہ لفظ یا فقرہ صرف ایک ہی سطر یا بیت میں گرمی تڑپ اور "شعریت" پیدا نہیں کرتا بلکہ اپنے آگے پیچھے اور ارد گرد کی تمام

سطروں اور بیتوں میں برقی لہر دوڑا دیتا ہے۔ زبان کے تار و پود میں جادو کا رنگ اثر بھر دیتا ہے اور پورے کلام کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے دنیا کی بڑی بڑی مشہور رزمیہ نظموں مثلاً ہومر کی "ایلیڈ" اور ملٹن کی "فردوس گم شدہ" کی غیر معمولی کامیابی کا راز یہی ہے بند کے بند پڑھتے جاؤ قلب میں نہ اہتزاز پیدا ہوگا نہ سوز و گداز لیکن تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایسے اشعار ملتے جائیں گے جن میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا رہتا ہے انہیں درمیانی اشعار کی ساحرانہ قوت آس پاس کی بے کیف سطروں میں بھی حرارت اور چمک پیدا کر دیتی ہے۔ طویل نظموں کی بہ نسبت مختصر نظموں میں جادو کے الفاظ اور فقرے زیادہ دیکھنے میں آتے ہیں اسی بنا پر ایمرسن کو تسامح ہوا اور اس کی شتاب کاری نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ طویل نظموں پر شاعری کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا وہ عموماً منظوم واقعات ہوتی ہیں جن میں کیف و اثر نہیں پایا جاتا البتہ کہیں کہیں ایک آدھ شعر دیکھنے میں آ جاتا ہے جس کی اہتزازی قوت بقیہ کلام کی بے اثری کی تلافی کا سامان مہیا کر دیتی ہے طویل نظموں کے یہی چیدہ چیدہ اشعار صحیح شاعری کے ضمن میں آ سکتے ہیں لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے جو الہامی اشعار ملتے ہیں ان کے ساحرانہ الفاظ اور فقرے ترشے ہوئے ہیرے کی طرح چھوٹ دیتے ہیں اور ان کے پرتو سے ارد گرد کی چیزیں بھی چمکنے لگتی ہیں اور جو شعر پہلے پھیکے معلوم ہوتے ہوں ان میں بھی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ طویل نظموں کے مقابلہ میں مختصر نظمیں زیادہ طلسمی الفاظ کی حامل ہوتی ہیں یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ غزل کا ہر شعر بمنزلہ ایک آزادانہ مختصر نظم کے ہوتا ہے ایک شعر کو دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہر شعر بذاتِ خود ایک جملۂ تامہ یا کلامِ مفید ہے۔ اس لئے یہاں ایک شعر کا طلسمی لفظ یا ساحرانہ فقرہ دوسرے شعر کو متاثر نہیں کرتا جس شعر میں کوئی فسوں کارانہ لفظ و ترکیب نہ ہو وہ بود اپست اور پھسپھسا ہوگا غزل کے ہر شعر میں فسوں کاری کا علیحدہ علیحدہ سامان ہونا چاہئے اردو کے شعرا مختلف وسائل سے کلام میں خوبی و دلکشی پیدا کرتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو اکثر اور بیشتر اشعار میں ساحرانہ اثر اور فسوں کارانہ عمل کا مرکز فارسی کی وہی لطیف و دلپذیر ترکیبیں ہوتی ہیں جن کو وطن پرست طبقہ غیر ملکی سرمایہ سے تعبیر کرتا ہے مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نام اُن کا آ گیا جو کہیں وقتِ بازپرس
ہم کہنے کہ اُڑ گئے صفِ محشر لئے ہوئے

کس کے خرام ناز نے قبر میں دل ہلا دیا
چین سے سو رہا تھا میں آ کے مجھے جگا دیا

سوالِ وصل پر ہلنا پری رد تیرے ابرو کا
اشارہ ہی برات عاشقاں بر شاخ آہو کا

کرم کچھ آج ہے ساقی کا وہ طرب انگیز
کہ جرعہ جرعہ ہے موجِ ترنم سحری

شور محشر امیر کو نہ جگا
سو گیا ہے غریب سونے دے

رشکِ فغاں کی ہائے رقیب آفرینیاں
محشر نے خفتگانِ زمیں کو جگا دیا

ذرا ہو گرمیٔ صحبت تو خاک کردے چرخ | مرا سرور ہے گل خندۂ شرر کا سا
حریفِ بے جگری صبر ورنہ گل کی صحبت میں | نیاز و ناز کا جھگڑا اگر دنھا ایک جرأت میں
ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا | پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ دلنشور تھا
ہوا یہ سینہ یکسر خارزارِ دشتِ غم میرا | کہ آیا پا بخوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا

ان اشعار کی تمام خوبی خط کشیدہ الفاظ کی رہینِ منت ہے بعض جگہ خیالات نہایت معمولی تھے۔ لیکن فارسی ترکیبوں کی ندرت اور لطافت نے انہیں بہت اعلیٰ و ارفع اور پرکیف و دلکش بنا دیا۔ مسٹر ابر کرامبی اسی قسم کے فقروں کو سحر و افسون خیال کرتے ہیں لیکن دراصل وہ صرف جادو کا نہیں بلکہ مسیحائی کا کام کرتے ہیں مردہ اشعار میں جان ڈال دینا ان کا ادنی کرشمہ ہے قدما ان تمام گُردں سے واقف تھے۔ چنانچہ مومن نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ اساتذہ کی غزلوں میں بھی صرف دو تین ہی اشعار الہامی ہوتے ہیں جو سامع کے احساسات کو مشتعل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں غزل کا بقیہ نصاب فارسی کی چست و دلآویز ترکیبوں کے ذریعے سے پورا کر دیا جاتا ہے الغرض جو الفاظ اور فقرے اردو شاعری کے تمام حسن و خوبی کا منبع ہیں۔ جو دلآویز ترکیبیں شعر کی جان ہیں اور اپنے فسوں کارانہ اثر سے سامعین کو مسحور و بیخود بنا دیتی ہیں، اگر حامیانِ سرمایۂ ملکی کی خوشنودی کی خاطر انہیں سے دست برداری اختیار کر لی جائے تو اردو کا ذخیرۂ شاعری بالکل جنسِ کاسد بنجائیگا جس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

لیکن فارسی ترکیبوں کے اعجاز نما اختصار اور ساحرانہ اثر آفرینیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے "تاریخ ادبیات اردو" کے فاضل مصنف شکوہ سنج ہیں۔ کہ "اردو کے قدیم غزل گو شعرا نے فارسی کی نامانوس اور شاندار ترکیبوں کے آگے بھاشا کی شیرینی اور نزاکت کو نظر انداز کر دیا" جو چیز اردو شاعری کی گھٹی میں پڑی ہو اس کو نامانوس قرار دینا گویا چاند پر دھول ڈالنا ہے ممکن ہے کہ بھاشا کی شاعری میں کسی حد تک شیرینی اور نزاکت پائی جاتی ہو لیکن یہ ایک محدود ذہنگ اور گمنام شاعری ہے ایک محدود و مخصوص خطۂ ملک کے باہر اسے کون جانتا ہے مگر فارسی شاعری کی لطافتوں اور نزاکتوں کی ایک عالم میں دھوم ہے فارسی شاعری کو دنیا کے کلاسیکل لٹریچر (ادب العالیہ) میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے جہاں تک زبان کی شیرینی اور نزاکت کا تعلق ہے۔ دنیا کی کوئی زبان مشکل سے فارسی کا مقابلہ کر سکتی ہے بھاشا کہاں کی ایسی ترقی یافتہ زبان ہے کہ وہ فارسی جیسی ہمہ گیر و شہرۂ آفاق زبان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے اس میں اتنی قوت و گیرائی کہاں کہ وہ اردو شاعری کے لئے نمونہ کا کام دیتی اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ بھاشا کی عشقیہ شاعری الہام و القا کا نتیجہ نہیں ہوتی اور اس کا طرزِ اظہار بالکل مصنوعی و غیر فطری ہوتا ہے اثر کے لحاظ سے بھی اس کا کارنامہ زیادہ وقیع نہیں بھاشا کی شاعری کے متعلق عجیب و غریب غیر ذمہ دارانہ بیان دیکھنے میں آتے ہیں عام طور پر مشہور ہے۔ کہ بھاشا کی شاعری میں عاشقانہ احساس کی اس قدر شدت اور گرمی پائی جاتی ہے۔ کہ دنیا کی شاید ہی کوئی زبان اس کی حریف بن سکے لیکن یہ غلو آمیز بیان صداقت سے اتنا ہی بعید ہے جتنی نور سے ظلمت۔

ماہرین فن کا خیال ہے کہ وہی شعر نہایت پُر اثر اور کیف آور ہوتا ہے۔ جسے پڑھ کر انسان محسوس کرے کہ یہ میری دلی

آواز اور قلبی پکار کی صدائے بازگشت ہے۔ جو شعر سامع کے خیالات و جذبات کے آئینہ دار نہیں ہوتے وہ کیفیت و اثر سے بالعموم معرا ہوتے ہیں۔ غالب نے اسی نکتہ کو اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی لئے اساتذہ سخن اپنے شخصی و انفرادی تجربات ذہنیہ و واردات قلبیہ کو بھی عمومی رنگ میں پیش کرتے ہیں مضمون شعر کا عامتہ الورود ہونا بہت بڑا وصف ہے۔ میر اور درد کے اشعار کی "نشتریت" و "خنجریت" کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہ بیان تو کرتے ہیں اپنے ذاتی تجربات لیکن طریقۂ بیان ایسا اختیار کرتے ہیں کہ ہر شخص انہیں اپنے حالات و واقعات کے مطابق پاتا ہے۔ مثلاً میر کا ایک شعر ہے ؎

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

عاشق شدت انتظار سے بیتاب ہو کر معشوق کے خلاف شکایتوں کا ایک دفتر تیار کر لیتا ہے اور دل میں سوچتا ہے کہ ملاقات ہونے پر خوب جلی کٹی سناؤں گا۔ لیکن جب معشوق آتا ہے تو اس کے رُعب حسن سے عاشق کو سخت کلامی کی ہمت نہیں ہوتی۔ بلکہ خود عاشق کا دفور شوق اسے بجائے شکوہ سنجی کے عجز و نیاز کے اظہار پر مجبور کرتا ہے یہ معاملہ صرف عشق جنون پرور کے بادیہ پیماؤں ہی کے ساتھ پیش نہیں آتا بلکہ ہر شخص کو جو کسی کا فرادا سے تھوڑی بہت بھی محبت رکھتا ہے اس کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا فی الحقیقت یہ ایک عامتہ الورود واقعہ ہے۔

اب بھاشا کی عشقیہ شاعری پر غور کیجئے اس شاعری کو مردانہ جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں صرف عورتوں کے جذبات و حسیات کی مرد کوی کی جانب سے ترجمانی کی گئی ہے۔ جب تک مرد خود کو عورت نہ تصور کر لے اس وقت تک یہ شاعری اس کے ذہنی حالات و دلی کیفیات کے مطابق نہیں ہو سکتی لیکن مرد کا اپنے اوپر عورتوں کے جذبات و احساسات طاری کر لینا خلاف فطرت اور محال ہے۔ اس بنا پر بھاشا کی عشقیہ شاعری مرد کے جذبات عالیہ و حسیات لطیفہ کو مشتعل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اردو غزل کے اکثر اشعار عشق مجازی و عشق حقیقی دونوں پر منطبق ہوتے ہیں لیکن بھاشا کی شاعری میں عشق حقیقی یا تصوف کی مئے دو آتشہ کی تندی و گرمی بہت کم پائی جاتی ہے۔ یہاں شاہد حقیقی کے ساتھ بھی اظہار محبت کا وہی مجہول و انفعالی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو نئی دلہن اختیار کرتی ہے خود کو دلہن فرض کر لینا ممکن ہو تو ہو لیکن دلہن کے حقیقی جذبات و احساسات اپنے اندر پیدا کر لینا غیر ممکن ہے بہر طور بھاشا کی شاعری نہ مردانہ جذبات کی ترجمانی کرتی ہے نہ پڑھنے والے کے احساسات کی آئینہ داری۔ بھاشا کے حامی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی آبادی صرف مردوں ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ نصف آبادی صنف نازک کی ہے مرد کے جذبات کی ترجمانی اگر نہیں ہوئی تو کیا ہرج یہی کیا کم ہے کہ دنیا کی نصف آبادی کی تسلی و تشفی کا یہاں کافی سامان موجود ہے لیکن جب

کوئی شریف خاتون بھاشا کے ولولہ خیز و پُرجوش اشعار سنتی ہے تو کانوں پر ہاتھ دھرتی ہے اور کہتی ہے کہ "حاشا و کلّا یہ نالہ و شیون اس باحیا مخلوق کا نہیں ہے جو عورت کہلاتی ہے مردوں نے اپنے جی سے یہ تمام بے شرمی کی باتیں گھڑ کر ہماری رسوائی و بدنامی کا سامان اکٹھا کر لیا ہے ہم کبھی اپنے رازِ دروں کو اس طرح طشت از بام نہ کرتے۔ اور نہ کبھی اپنے دردِ دل کا ڈھنڈورا پیٹتے جب تک کسی عورت کے دیدہ کا پانی نہ گر جائے۔ وہ ہرگز مردوں کی سبھا میں اپنی چھل بل دکھانے پر آمادہ نہ ہوگی ہماری غیرت نسائی اور شرم و حیا ان باتوں کو زبان پر لانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتی جنہیں بھاشا کے ظالم شاعر نے ہماری طرف منسوب کر دیا ہے ہم ناچار ہیں مجبور ہیں بے بس ہیں کریں تو کیا کریں مردوں کے جو جی میں آیا بے دھڑک کہہ دیا قلم ان کا۔ زبان ان کی ہماری عزت و خودداری کا کچھ پاس نہ کیا۔ پھر بھی ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں۔ کہ بھاشا کے شاعروں نے جو کچھ ہرزہ سرائی کی ہے۔ وہ ہماری زبان نہیں۔ ہماری پکار نہیں ہمارا انداز بیان نہیں یہ تمام امور ہماری فطرت و طبیعت کے منافی ہیں"۔

ان حالات کے مدِ نظر بھاشا کی عشقیہ شاعری محض مصنوعی بے اصل اور غیر فطری نہیں تو اور کیا ہے دعویٰ کیا جاتا ہے اس شاعری میں احساسات کو مشتعل کرنے کے لئے انتہا درجہ کی شدت و حرارت پائی جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ کیا وہ ہمارے جذبات عالیہ و احساسات لطیفہ میں جنبش و حرکت اور دل و دماغ میں اہتزاز و انبساط پیدا کرنے کی قوت و صلاحیت رکھتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ شباب کی سرمستیوں سے مغلوب ہو کر جب کوئی ماہ جبین اپنی البیلی چال ڈھال دکھائیگی۔ تو لامحالہ نازبرداروں کے خرمن صبر و سکون پر بجلیاں گرائیگی جب کوئی کافر ادا خود پیش قدمی کرے گی، آغوش محبت کھولے گی بیقراری و بیچینی دکھائے گی دست تمنا دراز کریگی۔ تو لازمی طور پر دوسری جانب سے ہوسناکی و نفس پرستی استقبال کے لئے آگے بڑھے گی غرض کہ ایک نوخیز محبوبہ کی دردسرائی صرف جذباتِ کثیفہ و خواہشاتِ سفلیہ ہی کو برانگیختہ کر سکتی ہے البتہ قرونِ وسطیٰ کا کوئی مبارز (نائٹ) اگر بھاشا کے اشعار سنے تو بہت ممکن ہے کہ وہ صنفِ نازک کے نالہ و شیون سے بیتاب ہو جائے اس کے دل میں بجائے جذبۂ شہوانی کے رحم اور ترس کا احساس پیدا ہو اور وہ اُس کی امداد و اعانت کے لئے آگے بڑھے مختصر یہ کہ "پیا بن کیسے کٹیں دن بہار کے" یا "چھار و چھار دموری بہنیاں البیلے سیّاں" یا اسی قماش کی اور شاعری کا سارا کارنامہ یہی ہے کہ وہ یا تو نوجوانوں کے جذبۂ ہوسناکی کو اشتعال دے یا معمر و سنجیدہ لوگوں کے دلوں میں ترس اور رحم کا احساس پیدا کرے علاوہ بریں بھاشا کوئی ایسی مہذب متمدن اور ترقی یافتہ زبان بھی نہیں ہے۔ اور نہ اس کا دامن ایسے علمی و ادبی خزانوں سے معمور ہے۔ کہ اردو کو اس سے خوشہ چینی کی ضرورت لاحق ہو۔ اردو ادب و شاعری کو ہر اعتبار سے بھاشا پر ترفع و تفوق حاصل ہے۔ اس لئے اس کی خودداری و حمیت ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے سے کمتر درجہ کی زبان کو اپنا خضرِ راہ سمجھے اور اس کے نقشِ قدم پر چلے۔

آج کل مُلک میں کئی زبردست علمی ادارے قائم ہوئے ہیں جو اپنا مقصد اردو کی اصلاح و ترقی بتاتے ہیں لیکن وہ جو تجویزیں پیش کرتے ہیں ان پر عمل کرنے سے اردو زبان ترقی کرنے کے بجائے رو بہ زوال ہو جائیگی اور اس کا رخ بلندی سے

پستی کی جانب مائل ہو جائے گا۔ ان کی پہلی مہلک تجویز یہ ہے کہ اردو ادب و شاعری سے جہاں تک ممکن ہو فارسی و عربی الفاظ خارج کر دیئے جائیں اور ان کی جگہ ہندی کے الفاظ استعمال کئے جائیں اُن کا خیال ہے کہ اردو زبان کی زمین ہندی ہے جس پر محض خوشنمائی کے لئے عربی و فارسی کے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ اگرچہ ادب و شاعری میں الفاظ و ترکیب کی خوشنمائی و لطافت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے بلکہ بعضوں کے نزدیک مشاطگی کو افادت پر تفوق حاصل ہے تاہم عربی و فارسی کے الفاظ صرف بیل بوٹوں ہی کا کام نہیں دیتے۔ بلکہ ابتدا ہی سے وہ اردو ادب و شاعری کی جان ہیں جو اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں اور جزو بدن بھی بن گئے ہیں! ان کا اخراج گویا جسد شاعری سے جان کو جدا کرنا اور اسے مردہ بنا دینا ہے نثر سے ان کا اخراج اگر ہلاکت آور نہیں تو کم سے کم اعضا و جوارح کی قطع و برید کے مماثل ضرور ہے اردو میں اعلیٰ و لطیف جذبات اور بلند و نازک خیالات کی ترجمانی کے لئے عربی و فارسی الفاظ ناگزیر ہیں کوئی زبان اگر صرف کاروباری ضروریات کے لئے استعمال ہوتی ہو اور محض بول چال تک محدود ہو تو معمولی لفظوں سے کام چل سکتا ہے لیکن اس میں علمی و ادبی شان پیدا کرنے کے لئے اس کو عام روش سے بالاتر بنانے کی ضرورت ہے جو زبان صرف لین دین اور رسوم اسلف کے لئے استعمال ہوتی ہو اس سے شاعر کا کام نہیں چل سکتا شاعر ایسے الفاظ منتخب اور ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے جو جذبات و حسیات میں تموج و تلاطم پیدا کر سکے۔ اس لئے اس کو کسی قدیم کلاسیکل لٹریچر کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے چنانچہ یورپ کی تمام ترقی پذیر زبانیں یونانی و لاطینی سرمایۂ ادب کو اپنے لئے خضر راہ سمجھتی ہیں۔ لطیف نازک اور پیچیدہ خیالات کے اظہار کے لئے اس سے استمداد کرتی ہیں علمی و حکمیاتی اصطلاحات۔ تو زیادہ تر یونانی و لاطینی ہی کی مدد سے بنائی جاتی ہیں واضح رہے کہ ہر نئی زبان اسی قدیم ادب العالیہ کا سہارا ڈھونڈتی ہے جو اس کی فطرت۔ طبیعت ہیئت و ساخت کے مطابق ہوتا ہے فارسی و عربی اردو کے ساتھ اور سنسکرت ہندی کے ساتھ میل کھاتی ہے۔ اس لئے ہر دو زبانیں اپنے ساتھ میل کھانے والی قدیم السنہ سے استفادہ کر رہی ہیں نئی زبان کے ارتقا و ترقی کا یہی قدرتی طریقہ ہے۔ آج کل یہ خیال وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے کہ علما نے اردو زبان کو فارسی و عربی کے ادق و مغلق الفاظ سے اور پنڈتوں نے ہندی کو سنسکرت کے سخت و غیر مانوس الفاظ سے گرانبار کر دیا ہے لیکن جو صاحب نظر ہیں وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے فطری قانون و لسانی اصول کے تحت عمل میں آرہا ہے اس میں بیچارے عالموں اور پنڈتوں کے تعصب کو مطلق دخل نہیں اعلیٰ اور شاندار خیالات اپنے اظہار کے لئے پرشکوہ و جزیل الفاظ کے متقاضی ہوتے ہیں البتہ سادہ و بسیط خیال کے لئے سادہ و معمولی الفاظ کافی ہیں۔ خیال اور لفظ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ماہرین نفسیات جانتے ہیں کہ کبھی مجرد خیال بغیر لفظی جامہ کے ہمارے دماغ میں رونما نہیں ہوتا اعلیٰ خیال اعلیٰ لباس میں اور سادہ خیال سادہ لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے شیخ عبدالقادر سابق مدیر مخزن کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں ڈاکٹر اقبال کی نظمیں مخزن میں شائع ہوا کرتی تھیں اس وقت بعض لوگوں کو شکایت تھی کہ وہ بہت ادق اور مشکل الفاظ استعمال کرتے ہیں فارسی کی پیچیدہ ترکیبوں کی وجہ سے ان کا کلام عام فہم نہیں ہوتا۔ یہ شکایت ڈاکٹر اقبال تک پہنچا دی گئی جس پر انہوں نے مجبوری کا اظہار کرنے

ہوئے فرمایا کہ اعلیٰ و ارفع خیالات سہل اور سادہ الفاظ میں ادا ہو ہی نہیں سکتے۔ خیالات کی جدت و ندرت شاعر کو نئی نئی ترکیبیں تراشنے پر مجبور کرتی ہے سر اقبال کا خیال ہے کہ مرزا غالب بھی اپنے کلام میں صرف شوکت و جزالت پیدا کرنے کے لئے قصداً فارسی کی پیچیدہ اور انوکھی ترکیبیں استعمال نہ کرتے تھے۔ بلکہ وہ اس امر پر فطرتاً مجبور تھے۔ ایک تو ان کی طبیعت ہی مشکل پسند واقع ہوئی تھی دوسرے ان کا فکر فلک پرداز تھا اور عام پست سطح پر شاذ و نادر ہی اترتا تھا۔ اس لئے خیالات کی بلندی و طرفگی کی مناسبت سے ان کے پیرایۂ بیان میں بھی علویت۔ ندرت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ اردو زبان جب تک محض بول چال کی زبان تھی اس کا ذخیرۂ الفاظ نہایت سادہ سہل اور محدود تھا لیکن جوں جوں اس میں علمی و ادبی شان پیدا ہوتی گئی اس کی لغت بڑھتی گئی اور خیالات کی رفعت و لطافت کے ساتھ ساتھ شاندار الفاظ اور خوشنما فارسی ترکیبوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اسی اصول پر ہندی زبان کو بھی ترقی ہوئی ادبی ترقی کے ساتھ خیال میں نزاکت و لطافت پیدا ہوتی گئی۔ جب نازک و لطیف خیالات کے اظہار کے لئے معمولی بول چال کے لفظ ناکافی ثابت ہوئے تو ہندی نے سنسکرت کے خرمن ادب سے خوشہ چینی شروع کی اب اگر اردو زبان فارسی و عربی عناصر سے اور ہندی زبان ان چیزوں سے جو سنسکرت سے ماخوذ ہیں محروم کر دی جائیں تو دونوں کے ادب و شاعری پر زوال آ جائے گا دونوں محض قصہ کہانیوں کی زبان بن جائیں گی۔ دونوں کی تگ و دو صرف پنگھٹ میکے اور سسرال کی باتوں اور ساس نند کی شکایتوں تک محدود ہو جائے گی ان میں اعلیٰ علمی ادبی و تنقیدی مضامین کے بیان اور باریک صوفیانہ فلسفیانہ و حکیمانہ نکات کے اظہار کی مطلق صلاحیت باقی نہ رہے گی۔

ہندوستان میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو محفل ادب کو سیاست کا میدان تصور کرتے ہیں وہ ہندوستان کی مختلف النسل قوموں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے ایک مشترکہ زبان کا وجود ضروری سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مشترکہ زبان (لنگوا فرنیکا) اس وقت تک معرض وجود میں نہیں آ سکتی جب تک ہندوستان کی دو حریف زبانیں یعنی اردو اور ہندی اپنی غیریت و اجنبیت دور کر کے ایک دوسرے سے معانقہ نہ کریں لیکن دونوں کے لئے بغیر اپنی اپنی خصوصیات ترک کئے ہوئے اس کی تکمیل محال ہے علاوہ بریں ان کو آپس میں معانقہ کرنے کے لئے اس پست سطح پر اترنا پڑے گا جیسے مبتذل سوقیانہ نحیف اور بازاری کہتے ہیں شاطر و چالاک ہندی جانتی ہے کہ اتحاد و اتفاق کا خوش آئند خیال اس نفاقستان ہند میں کبھی شرمندۂ عمل ہونے والا نہیں اس لئے وہ سنسکرت آمیز موقف سے ایک قدم پیچھے ہٹنا بھی گوارا نہیں کرتی لیکن سادہ لوح اردو کو مشترکہ زبان بننے کا سبز باغ دکھا کر اس امر پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے شاندار ایرانی مخمل میں دیسی ٹاٹ کا پیوند لگا لے اسی قسم کی ایک ہلاکت بار کوشش کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت نیاز فتحپوری فرماتے ہیں کہ ہندی تو اپنے "رتی ماسک نیزیکا" کے اونچے سنگھاسن سے ایک انچ بھی نیچے نہ اتری لیکن بیچاری اردو کو "سہ ماہی" کا عالیشان کاخ چھوڑ کر "تماہی" کے نحس خانہ میں منتقل ہونے پر مجبور کیا گیا اہل زبان چلاتے ہی رہ گئے کہ اردو کی لسانی خصوصیات کے لحاظ سے یہ جدت ترکیب بہت بڑی بدشگونی ہے اگر ایسی انوکھی ترکیبیں جاری رہیں تو تین ہی مہینہ کے بعد اردو کا جنازہ نکل جائے گا تماہی کے معنی چھ ماہی کے قیاس پر وہ رسوم ہونگے جو کسی کے مرنے کے تین مہینہ کے بعد ادا کئے جائیں یہ مثال ہر اس حقیقت کی کہ کس طرح فارسی کی لطیف و خوشنما ترکیبیں معمولی خیال کو نہایت بلند کر دیتی ہیں لیکن دیسی یا ہندی آمیز ترکیب بلند

معنی کو لیست و سخیف بنا دیتی ہے بات یہ ہے کہ فارسی عنصر ترک کر دینے اور دیسی چیزیں قبول کرنیکی صلاح دینا تو نہایت آسان کام ہے لیکن اس پر کاربند ہو کر کوئی اعلیٰ ادبی تنقیدی علمی یا فنی کارنامہ پیش کرنا ناممکن ہے۔ تاہم "وائی زبان میں بڑی کوششوں اور جانکاہیوں سے صرف قصہ کہانی یا مختصر افسانہ لکھا جاسکتا ہے۔

بزم ادب میں اصولِ سیاست رائج کرنے والوں کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ ایک مشترکہ زبان اختیار کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں کہ اردو یا ہندی کو اس کی اعلیٰ علمی وادبی منزل سے نیچے کھینچ کر عام بازاری سطح پر پہنچا دیا جائے تاکہ ملک کی کثیر آبادی اسے سمجھ سکے اور صرف لین دین کے معاملات میں اسے استعمال کرے اول تو ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں مختلف نسلیں اور مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں اور مختلف بولیاں بولتے ہیں ایک مشترکہ زبان کا خواب دیکھنا ہی بے سود ہے بنگالی۔ اڑیا تلنگی ملیالم تامل کنڑی مرہٹی بولنے والی قوموں نے کبھی اردو یا ہندی کو بطور مشترکہ زبان کے اختیار کرنے کے لئے آمادگی ظاہر نہیں کی ہے۔ صرف شمالی ہند کو بعض صوبوں ہی میں ایک مشترکہ زبان کا خواب دیکھا جاتا ہے ریاست حیدرآباد کی بات ہی اور ہے یہاں اردو کو سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل ہے یہاں ذریعہ تعلیم اردو ہونے کی وجہ سے ہر قوم اور ہر فرقہ کا پڑھا لکھا شخص عام اس سے کہ اس کی مادری زبان مرہٹی ہو یا کوئی اور بڑی زبان اردو سے واقفیت رکھتا ہے اگر کل ہند کے لئے ایک مشترکہ زبان کا قیام ممکنات سے ہو بھی تو یہ کیا ضرور ہے کہ پہلے اردو ہی کو آزمائشوں میں پھنسا کر اس پر قطع و برید کا عمل شروع کر دیا جائے ہندی بھی تو اردو کی سب سے زبردست حریف ہے اسے سنسکرت کے عناصر سے پاک کر کے نیچی سطح پر لانے اور مشترکہ زبان بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی جاتی۔ دوسری قومیں ہوشیار اور دور اندیش ہیں۔ وہ کسی ناممکن العمل فرضی وخیالی بات کی تکمیل کے لئے اپنی زبان کی صورت وہیئت بگاڑنا پسند نہیں کرتیں حامیانِ ہندی کا بلند حوصلہ ہندی کو اس کی تمام خصوصیات قائم رکھ کر ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانا چاہتا ہے لیکن اردو کے سادہ لوح علمبردار اپنی زبان کو مشترکہ زبان بنانے کی امنگ میں اس کی تمام امتیازی خصوصیات سے دست بردار ہو جانے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔

مشترکہ زبان کے قیام کے متعلق ہمارے سامنے امریکہ کی بہترین مثال موجود ہے جس سے اہل ہند ہدایت وبصیرت حاصل کر سکتے ہیں جب امریکہ دریافت ہوا تو مختلف یورپی ممالک کی فاضل آبادی جو زیادہ تر غربا پر مشتمل تھی تلاش روزگار میں جوق در جوق وہاں جا بسی بعض امرا بھی امریکہ جا کر اس لئے آباد ہو گئے۔ کہ ان کے مہماتی شوق کے لئے وہاں وسیع میدانِ عمل موجود تھا۔ الغرض یہ لوگ اپنے اپنے دیس کی بولیاں بولتے تھے۔ بمرورِ زمانہ جب ان کو ایک متحدہ قوم بننے کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے مقدس لہو سے آزادی خریدی۔ تو ان کو ایک مشترکہ زبان کی بھی ضرورت پیش آئی لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے اپنی بھانت بھانت کی بولیوں کے اختلاط و آمیزش سے کھچڑی تیار نہیں کی بلکہ انگریزی جیسی مہذب و ترقی یافتہ زبان کو مع اس کی قدیم روایات تلمیحات اور نحوی وعروضی اصول کے اپنی مشترکہ زبان تسلیم کر لیا اور سب نے متحد ہو کر اس کی ترقی کے لئے انہیں قواعد وضوابط کے مطابق کوشش شروع کر دی جن پر خود اہلِ انگلستان کاربند تھے اگر اہلِ ہند بھی محض دکھاوے

کے لئے نہیں بلکہ خلوص و دیانت کے ساتھ ایک مشترکہ زبان اختیار کرنا چاہتے ہوں تو اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی محبوب زبانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہو پھر ان کا فرض ہوگا کہ وہ اس منتخبہ زبان کی ترقی کے لئے متحدہ طور پر انہیں اصول و قوانین کے مطابق کوشش کریں جو اس کی فطرت ساخت اور طبیعت سے میل کھاتے ہوں یعنی اگر وہ ہندی کو مشترکہ زبان قرار دیں تو اس کے ارتقاد ترقی کے لئے سنسکرت ہی کا سہارا ڈھونڈیں۔ اور اگر اردو کو مشترکہ زبان بنائیں تو اس کے علمی و ادبی خزانہ کو بڑھانے کے لئے اس کی عادت۔ فطرت۔ ہیئت مصوت کے مدنظر عربی و فارسی سے استفادہ کریں۔ اور اس کی شاندار روایات و تلمیحات کو برقرار رکھیں۔

بعض حضرات کو "خالص اردو" لکھنے کا خبط سمایا ہوا ہے۔ "خالص اردو" کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے۔ کہ کلام میں کہیں فارسی عربی یا ترکی لفظ نہ آنے پائے۔ اس لزوم مالایلزم پر مذاق سلیم اپنی ہنسی روک نہیں سکتا۔ "خالص اردو" نتیجہ کے لحاظ سے کوہ کندن وکاہ برآوردن کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ بعض وقت تو وہ نہ اردو نظر آتی ہے نہ ہندی اور اس پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ "دھوبی کے کتے بن گئے: گھر کے نہ گھاٹ کے" اس قسم کے کلام کے لئے کوئی اصطلاح بھی ہندی وضع کی گھڑنی چاہئے تھی۔ یہاں "خالص" لفظ عربی اور "اردو" لفظ ترکی ہے۔ علاوہ بریں ایسی زبان کو جو عربی و فارسی الفاظ سے بالکل معرا ہو "خالص اردو" سے نامزد کرنا اردو زبان کی پیدائش اور تاریخ ارتقا سے ناواقفیت و عدم آگاہی کا پتہ دیتا ہے کون نہیں جانتا کہ اردو زبان عربی فارسی ترکی ہندی الفاظ کے اختلاط سے معرض وجود میں آئی ہے خالص زبان اسی کو کہتے ہیں۔ جو اہل زبان بولتے ہیں اردو کے اہل زبان بغیر کسی تکلف و تصنع کے جو بولی بولتے ہیں وہی "خالص اردو" ہے اور تکلف و تصنع اور اہتمام و التزام کے ساتھ جو زبان استعمال کی جائے۔ وہ غیر خالص ہے ہر شخص جانتا ہے کہ اردو کے اہل زبان عام بول چال میں سینکڑوں عربی و فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ شاعر کا تو کچھ کہنا نہیں وہ کلام میں حسن و خوبی اور کشش و اختصار پیدا کرنے کے لئے جو پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے وہ روزمرہ کی بول چال اور عوام کی روش و محاورہ سے بہت بلند ہوتا ہے وہ کلام میں رفعت طرفگی لطافت اور جذب اثر پیدا کرنے کے لئے عربی و فارسی کے شاندار و پرمعنی الفاظ اور لطیف و دلپذیر ترکیبیں استعمال کرنے پر مجبور ہے ہندوستان میں صدیوں تک فارسی کا اقتدار و تسلط قائم رہنے کی وجہ سے دیسی زبانوں کو بھی اپنا دامن جبراً کشادہ کرکے بہتیرے عربی و فارسی کے الفاظ قبول کرنے پڑے ہیں ایسی صورت میں "خالص اردو" سے عربی و فارسی الفاظ کا اخراج سخت مضحکہ خیز امر ہے انکے بغیر کلام ویسا ہی بےمزہ ہوگا جیسا طعام بے نمک ہر شاعر تو جذبات و حسیات کو مشتعل کرنے کے لئے ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے جو روش عام سے بلند تر ہو لیکن "خالص اردو" کے موجد کی عجیب ذہنیت روزمرہ کے الفاظ و محاورات سے بھی دست بردار ہو کر پست و مبتذل زبان اختیار کرتی ہے۔ اور شاعری کو لزوم مالایلزم کا پابند کرکے ایسے مضحکہ خیز بنا دیتی ہے۔ نام نہاد "خالص اردو" میں ابھی تک انشا پردازی کا کوئی اعلیٰ نمونہ پیش نہیں ہوا ہے۔ اس طرز خاص کے موجد نے وقتاً فوقتاً صرف دو تین صفحوں کے مضمون تحریر کئے ہیں جن میں نگھٹ سسرال۔ میکے ساس۔ نند۔ شادی۔ بیاہ موتے وغیرہ سے متعلق پرانی اور فرسودہ باتیں درج ہیں اسی طرح ان کی نظموں میں بھی بجز پست و مبتذل اور سوقیانہ خیالات کے کبھی اعلیٰ تخیل یا لطیف جذبہ کے

نمونے دیکھنے میں نہیں آتے، یہ مسلمہ امر ہے کہ فارسی کی دلآویز ترکیبیں زمینِ شعر کو آسمان بنا دیتی ہیں لیکن "خالص اردو" کا شیدائی بلند سے بلند خیال کو اپنے سخیف و مبتذل الفاظ کے ذریعہ سے تحت الثریٰ تک گرا دیتا ہے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ اگر "مشک" کے بدلے "ڈولچی" اور "زحمت" کے عوض "کھکھیڑ" کا لفظ باندھا جائے تو شعر کس قدر بے کیف پھسپھسا اور مضحکہ خیز بن جائے گا بہر حال "خالص اردو" لکھنے کی کوشش کسی سیاسی یا معاشری مصلحت پر مبنی نہیں ہے جیسا کہ موجد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ محض جدت و طرفگی کی خواہش اس عجیب و غریب طرز کی محرک ہے لیکن اس طرفگی اور انوکھے پن کے لئے جس قدر خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے وہ نتیجہ کے اعتبار سے صرف کوہ کندن و کاہ برآوردن کا حکم رکھتا ہے۔ فارسی کے بعض قدیم یاوہ گو شعرا بھی جدت اور طرفگی کے خبط میں اپنے اوپر مہمل پابندیاں عائد کرتے تھے۔ کوئی اپنے کلام میں صرف غیر منقوط الفاظ کا التزام کرتا کوئی صرف نقطہ دار حروف لانے کی فکر میں رہتا کوئی ایک حرف نقطہ دار اور ایک بے نقطہ استعمال کرتا۔ کوئی صرف ایسے حروف لانیکی کوشش کرتا جن کے اوپر ہی نقطے ہوں کوئی اس کے برعکس نیچے نقطہ والے حروف استعمال کرنے میں منہمک رہتا اس قسم کی مہمل اور وقت کش پابندیوں کا شمار صنائع لفظی میں ہوتا تھا۔ اور ان کے لئے شاندار اصطلاحیں گھڑی گئی تھیں مثلاً منقوط۔ مہملہ۔ رقطا۔ خیفا۔ فوق النقاط۔ تحت النقاط۔ مقطع موصل واسع الشفتین و اصل الشفتین متلون منقوص۔ توشیح وغیرہ ان غیر ضروری پابندیوں کی وجہ سے اظہار خیال میں جو رکاوٹیں پیش ہوتی ہیں، وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں لزوم مالا یلزم کی مہمل صنعتوں میں "خالص اردو" کی صنعت ایک جدید اضافہ ہے جس شاعر کو قدرت کی جانب سے طبعِ رواں کی دولت عطا نہیں ہوتی وہ اسی قسم کی مہمل صنعت گری کو جودت طبع کی علامت سمجھ لیتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے اسی قماش کے شاعر کی نسبت حافظ علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا کہ "صنعت گر نیست آنکہ طبعِ رواں ندارد" موجودہ زمانہ کا نقاد ایسے مہمل و بیکار صنائع و بدائع کو شاہدِ سخن کے رخِ زیبا کا خال نہیں بلکہ بدنما مسّہ قرار دیتا ہے "خالص اردو" بھی رخسارِ ادب کا بدنما مسّہ ہے اس میں نہ افادت کا کوئی پہلو ہے نہ مشاطگی کا "خالص اردو" کا سودا جس قدر جلد دور ہو اتنا ہی بہتر ہے۔

خاتمہ سخن پر سرمایۂ ملکی کے حامیوں سے ہماری التماس ہے کہ وہ اردو زبان کو قدرتی اصول کے مطابق ترقی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں۔ وہ خود بخود ان چیزوں کو اپنے اندر جذب کر لے گی جنہیں اس کی طبیعت قبول کرتی ہے عام اس سے کہ وہ دیسی ہوں یا بدیشی ملکی ہوں یا غیر ملکی۔ مقامی ہوں یا غیر مقامی جو چیزیں اس میں جذب و تحلیل ہو کر اس کا جزو بدن بن جائیں گی وہ اس کا ذاتی سرمایہ کہلائیں گی۔ زندہ زبان ساکن و جامد شے نہیں ہے۔ بلکہ وہ روز بروز ترقی کرتی اور آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اردو زبان میں بھی ترقی و اضافہ کی بہت گنجائش ہے لیکن اس میں صرف دیسی چیزیں ٹھونس دینے کا نام ترقی نہیں ہے نئی چیزیں خواہ دیسی ہوں یا بدیسی ایسی ہونی چاہئیں جن سے کلام کی لطافت پاکیزگی اور رنگینی میں فرق نہ آنے پائے اگر اردو شاعری ایک طرف اٹکنے بٹ کلپ برکش کھکھیڑ ڈولچی سمجھوتہ وغیرہ کی ثقالت برداشت نہیں کر سکتی تو دوسری جانب اس کی نزاکت کو ملتفت کارانہ طرز۔ گداختگی شعار ملائمت آمیز لبہائے شفا پاش۔ تقدیسِ استحکام۔ ترنم سیمیں۔ رقص حیابار وغیرہ جیسی نادر ترکیبوں کی گرانسنگی بھی گوارا نہیں غرض کہ اردو شاعری کو نہ دیسی چیزوں سے نفرت ہے نہ بدیسی اشیا سے بلکہ اسے نفرت ہے ان چیزوں سے جو اس کی فطری نزاکت اور طبعی

لطافت کے خلاف ہوں وہ ان اشیا سے پرہیز کرنا چاہتی ہے جن سے اس کو روگ لگ جانے کا اندیشہ ہے صحت بخش ہندی عناصر کا وہ ہر وقت خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس کا دامن تعصب و تنگ نظری کے دھبوں سے پاک ہے ابتدا ہی سے وہ نہایت فراخ دلی و کشادہ جبینی کے ساتھ عربی فارسی ترکی برجی ہندی پرتگالی اور انگریزی چمنستان کے پھولوں کو حسب ضرورت اپنے دامن میں جمع کرتی رہی ہے البتہ کانٹوں سے دامن بچانا اس کا قدیم شعار ہے اس کے خرمن میں دیسی ذخیرہ کی کمی نہیں لیکن جو ملکی چیزیں اس کے پہلو میں خار بن کر کھٹکیں ان سے کنارہ کشی ہی مناسب ہے اس کی نظر دیسی اور بدیسی کے امتیاز سے بہت بلند ہے اس کا خزانہ بے شمار جواہرات سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ان کی حقیقی قدر و قیمت سے واقف ہے سرمایۂ ملکی کے حامی دیسی جواہر کو گرانقدر اور بدیسی کو کم ارز خیال کرتے ہیں لیکن اردو شاعری کی نظر بلند ہے۔ وہ پچ اور پاسداری سے کسی شے کی قیمت نہیں لگاتی۔ اس لئے وہ حامیان سرمایۂ ملکی کے معیار قدر دانی کو غلط سمجھتی ہے وہ دیسی خزفریزوں کو بدیسی جواہرات پر محض ملکی ہونے کی وجہ سے ترجیح نہیں دے سکتی اور نہ دونوں کو ہم پلہ تصور کر سکتی ہے! ابن الوقتی و مصلحت کوشی ہزار چلاتی رہے کہ دیسی چیزوں سے بھی اپنی محفل سجاؤ اور شاندار غیر ملکی کارناموں کے پہلو میں بودی اور پست ملکی کارگذاریوں کو بھی جگہ دو لیکن اردو ادب و شاعری کی انصاف پسند طبیعت مصلحت و ذلت سے مغلوب نہیں ہوتی۔ وہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے پہلو بہ پہلو بٹھانے سے صاف انکار کر دیتی ہے اس کی اس نصفت شعاری مردانگی اور بے تعصبی کے مدنظر سرمایۂ ملکی کے مصلحت کوش حامیوں سے ہماری آخری گذارش ہے کہ وہ اردو ادب و شاعری پر رحم کریں اسے سبحہ و زنار کی کشمکش سے باہر رکھیں کسی سیاسی معاشرتی یا قومی و سماجی مقصد کے درپردہ اس کی شعریت رنگینی لطافت اور دلکشی کا خون نہ کریں اور حضرت جوشؔ کی نصیحت کان دھر کر سنیں ؎

بہر خوشنودیٔ اغیار یگانوں کو نہ چھیڑ

صرف اپنے پہ جو چلتی ہے وہ تلوار نہ بن

محمد حسین ادیب

تم عزت و خودداری پر یقین نہ کر سکو گے۔

جب تک تم خود اسے حاصل نہ کر لو گے۔

اپنے آپ کو پاکیزہ و خوش دل بنائے رکھو۔

تم وہ دریچہ ہو جس میں سے تم دنیا کو دیکھتے ہو۔

قربانی بعض لوگوں کو بہت پسند ہے کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے وہ بغیر قابلیت کے مشہور ہو جاتے ہیں

(برنارڈ شا)

غزل

اُس نے گو بات نہ مانی میری
سُن تو لی رام کہانی میری

اُس نگاہِ غلط انداز سے پوچھ
خلشِ دردِ نہانی میری

تجھ کو مجبورِ وفا کر دے گی
مری آشفتہ بیانی میری

میں کہ ہوں کشتۂ بے مہریٔ دوست
ہے غزل مرثیہ خوانی میری

نہ امنگیں ہیں نہ امیدیں ہیں
کیا جوانی ہے جوانی میری

نازپروردۂ ناکامی ہے
تپشِ سوزِ نہانی میری

میں ہوں گم گشتۂ راہِ الفت
بے نشانی ہے نشانی میری

سرور! اے محوِ فغانی! ظالم
ہے غزل رشکِ فغانی میری

سروری

غزل

کیا بتلائیں تم کو، عاشق کیوں کڑھتے کیوں روتے ہیں؟
ان غم کے ماروں کو صدمے ایسے ہی کچھ ہوتے ہیں

کروٹ بدلی آہیں کھینچیں اٹھ بیٹھے پھر لیٹ رہے
اپنی تو شب یوں کٹتی ہے سونے والے سوتے ہیں

دیکھ آئے تصویر بنائی، بھولے کچھ، پھر دیکھ آئے
اب تو کام یہی پکڑا ہے وقت اسی میں کھوتے ہیں

سر پھوڑیں یا جان گنوائیں ملنا اُس کا مشکل ہے
اور کریں کیا مجبوری ہیں، بیٹھے دل کو روتے ہیں

کاش کسی دن تم بھی دیکھو کیا حسرت کا وقت ہو وہ
جب ہم صبح کو اٹھ کر پہلے منہ اشکوں سے دھوتے ہیں

کیا کیجے کچھ بس نہیں چلتا، دلجوئی کا کام نہیں
تیری حالت سُن کے سیفی دل کے ٹکڑے ہوتے ہیں

سیفی نوگانوی

لاٹری

(ایک کشادہ مکان ہے جس میں بہت سے افراد بیٹھے ہیں اگرچہ ان سب میں بظاہر کوئی تفریق نہیں مگر بہ غور دیکھنے سے یہ دو فریقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں ایک فریق کے کپڑے دوسرے فریق سے قدرے کم قیمت اور زیادہ گھسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں یہ لوگ ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو امی جان کہہ کر پکارتے ہیں جو ایک کپڑا سی رہی ہے ان سب کی آپس میں ایسی بے تکلفی ہے کہ یہ ایک گھرانے کے معلوم ہوتے ہیں دوسری طرف ایک نوجوان لڑکا ہے جو بوسکی کا قمیص پہنے ہوئے ہے جن لوگوں سے وہ ہم کلام ہے تو وہ بھی لباس کے لحاظ سے اول الذکر فریق سے زیادہ ممتاز ہیں ایک چھوٹا لڑکا داخل ہوتا ہے)

لڑکا۔ سلام علیکم۔

امی جان۔ وعلیکم السلام۔ ظہیر آج اتنی دیر سے آئے ہو اسکول تو کبھی کا بند ہو گیا ہوگا۔

ایک لڑکی۔ امی جان یہ بازار میں کھیلتا رہتا ہے آپ اسے کچھ نہیں کہتیں۔

لڑکا۔ آپا صغرا تم ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی ہو میں کب دیر سے آیا ہوں (بستہ تخت پر رکھتے ہوئے) روز تو اتنی جلدی آجاتا ہوں۔

صغرا۔ پرسوں کیا ہوا تھا پانچ بجے گھر پہنچا تھا۔ اور پھر کل صبح نو بجے ہی سکول چلا گیا تھا۔ تو نہیں کسی کا کہا مانتا۔

ایک بڑی لڑکی۔ صغرا تو بھی تو ہر وقت اس کے گلے کا ہار ہوئی رہتی ہے کیوں ظہیر آج کیوں دیر ہو گئی؟

ظہیر آپا جان یونہی سکول ہی دیر سے بند ہوا تھا آج ہمارا ایک ماسٹر جو ہمیں ڈرائنگ پڑھاتا ہے اس کا اخیر کا گھنٹہ تھا وہ ہمیں باتیں سناتا رہا لاٹری کے متعلق کہتا تھا۔

آپا جان۔ کیا لاٹری کے متعلق؟

ظہیر کہتا تھا کلکتہ میں ایک لاٹری جو نکلتی ہے گذشتہ سال اس میں ایک تیسری جماعت کے لڑکے کے نام ایک لاکھ روپیہ نکلے اور پر سال ہی ایک کوچوان تھا اسے پچاس ہزار روپے ملے

صغرا۔ پچاس ہزار روپے؟

امی جان۔ ارے یہ لوگ یونہی گپیں ہانکتے رہتے ہیں لاکھ اور ہزار سب دھوکا ہے۔

آپا جان۔ نہیں امی جان بالکل دھوکا تو نہیں ہوتا ہوگا یہ باتیں ہمارے سکول میں بھی ہوتی تھیں میرا تو خیال ہے شاید وہ اخبار میں چھاپ دیتے ہیں اور پھر یہاں کیا سنا ہے ولایت میں تو ہر ملک میں بڑی بڑی لاٹریاں نکلتی ہیں۔

امی جان۔ تو اپنے نام آپ ہی نکال لیتے ہونگے ہم نے تو کبھی اپنے جاننے والوں کے نام کچھ نکلتا نہ دیکھا۔

صغرا۔ امی جان یہ کیسے ہو سکتا ہے لوگ کچھ جانتے

ہی ہونگے جو لاٹری ڈالتے ہیں

امی جان۔ خاک جانتے ہیں یہ جو لاٹری دلی میں نکلی تھی۔ پارسال اس میں ثریا کے اباجی نے سنا ہے پانچ پانچ روپے کے پانچ نام ڈالے تھے ایک بھی نہ نکلا۔

ظہیر۔ مگر امی جان کسی کا نام تو نکلتا ہے یہ جو کوچوان کے نام پچاس ہزار اور اس لڑکے کے نام ایک لاکھ روپیہ نکلا تھا اس میں کہاں دھوکا تھا چچا اکرم سے پوچھ لیجئے۔

امی جان: (صحن کے دوسرے کنارے بیٹھے ہوئے بڑکی پوش کو مخاطب کرکے) کیوں اکرم تمہیں معلوم ہے یہ لاکھ روپے اور پچاس ہزار روپے کی لاٹریوں کا؟

اکرم: بھابی جان سنتا ہوں کہ انگلینڈ میں روز کسی ٹائپسٹ یا کسی موٹر ڈرائیور یا کسی مزدور کے نام دس ہزار پونڈ کبھی پانچ ہزار پونڈ نکل آتے ہیں۔

ظہیر۔ دیکھا میں نہ کہتا تھا.....

صغرا۔ اچھا چپ رہ........

امی جان۔ تم کبھی بات بھی کرنے دیا کرتے ہو (تو اکرم سے) ان کے ملک میں مزدوروں کے نام نکل آتے ہونگے۔ یہاں میں نے تو کبھی سنا نہیں۔

اکرم۔ نہیں نہیں یہاں بھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے مگر یہاں لاٹریوں میں لوگ دھوکے بہت کرتے ہیں کئی دفعہ تو داخلے کے روپے ہضم کر جاتے ہیں لاٹری کا نشان تک نہیں ہوتا

آپا جان۔ واقعی یہاں کے لوگ بہت کمینے ہوتے ہیں

اکرم۔ درحقیقت یہاں کے لوگوں میں تجارتی دیانتداری نہیں ہوتی ہر شہر میں لاٹریاں کھول بیٹھتے ہیں اگر کسی کے نام نکل بھی آئے تو اسے اصل سے بہت کم دیتے ہیں میں نے ایسے کئی قصے سنے ہیں

ظہیر۔ مگر چچا جان ماسٹر تو کہتا ہے کہ ایک مہینے میں ایک بہت بڑی لاٹری دہلی سے نکلنے والی ہے بڑے بڑے لوگ اس میں ٹکٹیں لے رہے ہیں۔

اکرم۔ شاید مگر میں نے اخبار میں اس کا ذکر نہیں پڑھا اور ہو آج صبح سے میں نے اخبار بھی تو نہیں دیکھا صبح کا گیا گیا اب آیا ہوں (اپنی طرف) رشیدہ ذرا اخبار تو اٹھا لانا۔

ظہیر: امی جان میرا تو جی چاہتا ہے کہ ہم بھی لاٹری ڈالیں۔ شاید نکل آئے۔

امی جان۔ ارے جانے دے۔ تُو تو ہر مصالح پیلا مُور" ہے۔

صغرا۔ امی جان کیا پتہ ہے نکل ہی آئے۔

آپا جان۔ مجھے تو کوئی امید نہیں لاکھوں آدمی ڈالیں گے ہمارے ہی نام نکلے گی کیا؟

ظہیر۔ تو آپا جان کسی کے نام نکلے ہی گی نا اس کوچوان کے نام بھی نکل ہی آئی تھی۔

امی جان (آہستہ سے)، وہ تو الگ بات ہے روپے کوئی مفت تھوڑے مل رہے ہیں اپنے خرچ تو پورے ہوں۔ لاٹری کی بھی دیکھی جائے گی۔

اکرم۔ ٹھیک ہے بھابی جان یہ دہلی سے واقعی لاٹری نکلنے والی ہے۔ فقط دو روپے ٹکٹ ہے لکھا ہے یہ بڑے اہتمام سے نکلے گی سرکاری بنک کے ماتحت ہوگی میرا خیال ہے یہ لاٹری شاید ٹھیک ہی ہو۔

امی جان۔ اکرم ان کا کوئی اعتبار نہیں پھر لاکھ آدمی اگر لاٹری ڈالیں تو لاکھ میں سے ایک اتفاق ہو سکتا ہے

کہ تمہارا نام نکل آئے فقط روپے ضائع کرتے ہیں۔

اکرم۔ مگر لوگوں کے نام نکل بھی تو آتی ہے یہی ظہیر جو کہہ رہا تھا آخر کو جوان اور اس غریب طالبعلم نے ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا تھا یونہی اتفاق ہے نکل ہی آئی میں نے بھی آجتک لاٹری نہیں ڈالی۔ اس دفعہ ڈال دیتے ہیں دو روپے ہی ہیں نا کوئی پروا نہیں

امی جان۔ ہوں!

صغرا۔ امی جان

امی جان۔ !

صغرا۔ امی جان!!

امی جان (کپڑا سیتے ہوئے) ہوں!

صغرا۔ امی جان چلو ہم بھی ڈال ہی دیتے ہیں کیا حرج ہے۔

آپا جان۔ صغرا تجھے کیا ہو جاتا ہے کہہ جو دیا کہ نہیں ڈالیں گے بس رٹ لگائے جائیگی۔

ظہیر۔ مگر آپا جان ذرا دیکھو تو سہی اس غریب لڑکے کے نام نکل ہی آئی تھی اتنے روپے آخر!

امی جان۔ تو ایک دفعہ نکل آئی تھی کہ روز روز غریب لڑکوں کے نام ہی نکلتی آئیگی۔

صغرا۔ کیا پتہ ہے امی جان بس اس دفعہ ہی سہی دیکھو نا شاید! کیا پتہ ہے۔

امی جان۔ تو روپے کہاں سے نکالوں ابھی ظہیر کی فیس دینی ہے۔ تیرے پاؤں میں جوتی نہیں تیری چچی اپنے روپے الگ مانگتی ہے روپے ہوں تو انہیں نہ دیئے جائیں

ظہیر! امی جان میرے پاس آٹھ آنے جمع ہیں اس میں ڈیڑھ روپیہ اور ملا لو بس دو ہو جائیں گے۔

صغرا۔ امی جان سچ مچ، میرے پاس خود تیرہ آنے جمع ہیں میں نے عید کے پیسے بھی خرچ نہیں کئے تھے سب جمع کر رکھے ہیں ایمان سے، امی جان دیکھئے کتنے ہوئے ایک روپیہ ایک روپیہ اور پانچ آنے بس گیارہ آنے اور چاہئیں

آپا جان۔ کیوں امی جان یہ تو کتنے ہی پیسے ہوگئے

امی جان۔ رہنے دے تو بھی زہرا۔ تیرا بھی دل کیا ہوگا اتنی مصیبت سے تو انہوں نے پیسے جمع کئے ہیں اور یوں لاٹری میں ضائع کر دوں۔ لا تو صغرا میں خود ایک روپیہ ڈال کے تجھے دو پونے دو روپے کے سلیپر ہی لے دوں۔

صغرا۔ واہ امی جان! میں کیوں اپنے پیسے دوں پچھلی دفعہ بھی آپ نے میرے پیسے لے کر مجھے وہ چمپکا لے دیا تھا میں نہیں دیتی سب کو تو آپ لے دیں اور میرے سلیپر میرے پیسوں سے۔ میں نہیں دیتی!

امی جان۔ دیکھا نا! لاٹری پر ضائع کرے گی یوں نہیں خرچ کر لیتی۔

اکرم (اُدھر سے) کیوں بھابی جان کیا ارادہ ہے ڈالیں گی یا نہیں

امی جان۔ کہاں! اکرم روپے کہاں ہیں۔

اکرم۔ تو اس میں بہت سے روپے تو نہیں چاہئیں فقط دو روپے ڈال دیجئے۔ دو روپے کیا ہیں۔

امی جان ہاں ہاں ہے تو کچھ نہیں مگر اس وقت پاس ہی نہیں۔

ظہیر۔ چچا جان ذرا ان سے کہہ دو۔ یہ تو مانتیں ہی نہیں دو روپے ہی ہیں نا۔ ہوا کیا؟

صُغرا۔ امی جان چلو ڈال دو (آہستہ سے) کُل
بارہ آنے ہی کی کمی ہے آپا جان سے لے لیجئے ان کے پاس
تو بہت کچھ ہے

زہرا۔ چل ری بہت کچھ کی خالہ میرے پاس کہاں سے آیا

امی جان۔ زہرا کیوں ایسا تلخ بولتی ہے۔

زہرا۔ تو امی جان میرے پاس کونسے روپے پیسے
ہیں آپ جانتی ہیں کُل سوا دو روپے تھے وہ آپ نے آج پانچ
دن ہوئے لے لئے تھے۔ تو میرے پاس کونسا خزانہ باقی
رہ گیا۔

امی جان۔ تو وہ تجھ سے چھوٹی ہے ذرا نرمی سے کہہ دیا ہوتا

زہرا۔ نرمی سے وہ ماننے والی ہے! صورت تو دیکھو۔

ظہیر۔ چلو جانے دو آپا جان۔ اب گیارہ ہی آنے رہ
گئے ہیں بس امی جان ڈال دیجئے شاید آ ہی جائے۔ کتنے روپے
آئیں گے۔ توبہ! اتنے!!

صغرا۔ چلو امی جان میں روز کا پیسہ نہ لوں گی
آپ لاٹری ڈال دیں۔

ظہیر۔ اچھا امی جان میں بھی نہ لوں گا اب تو ڈال دو

زہرا۔ نہ لے گا اور تُو۔ تُو تو ایک کے دو لے کے
چھوڑے گا۔

ظہیر۔ نہیں آپا جان خدا کی قسم نہیں لوں گا۔

زہرا۔ اچھا قسمیں نہ کھایا کر۔

امی جان۔ بھئی تم نے تو ناک میں دم کر دیا ہے
(اکرم سے) اکرم کب ڈالو گے۔ یہ تو جینے نہیں دیتے۔

اکرم۔ اچھا تو بھابی جان۔ آپ بھی مان گئی ہیں
کل صبح ڈال دیں گے ضرور۔

دُوسرا دن شام

(وہی وقت اور سب کچھ ویسے ہی)

صغرا۔ امی جان مجھے تو یقین ہوتا جاتا ہے لاٹری
ہمارے نام ہی نکلے گی۔

امی جان۔ کیوں وہ کیسے؟

آپا جان۔ امی جان اس کی بھی سُنتی ہو جب سے
سکول سے آئی ہے دس دفعہ مجھ سے پوچھ چکی ہے لاٹری
ڈالی ہے کہ نہیں۔ لاٹری کب نکلے گی؟ پاگل ہے!

امی جان۔ تو زہرا کیا ہوا۔ آخر بچی ہے۔

زہرا۔ انتھی آپ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔

ظہیر۔ (مدرسے سے ابھی ابھی آکر) امی جان!
امی جان!! ذری ادھر تو دیکھو جانے دو آپا جان کو اور
آپا صغرا کو ان کو تو اور کوئی کام ہی نہیں کس وقت لاٹری
بھیجی تھی؟ چچا جان نے خود ڈالی تھی؟

امی جان۔ ہوں....

صغرا۔ تو ظہیر یہ بھی پتہ ہے کہ کب نکلے گی؟

ظہیر۔ ماسٹر کہتا تھا کہ ایک مہینہ کے اندر اندر
نکل آئے گی۔

صغرا۔ اف! ایک مہینہ!!

ظہیر۔ تو کیا ایک دن میں نکل آئے۔

صغرا۔ نہیں تو مگر.....

ظہیر۔ بس ایک مہینہ ہی تو ہے ایمان سے
اگر لاٹری نکل آئے تو میں تو ایک سائیکل خرید لوں اتنی
دور سکول جانا پڑتا ہے۔

صغرا۔ اب سکول دور ہوگیا۔ کیوں نہ ہو۔ موٹر کیوں نہ
خرید لیں میں تو کہتی ہوں پہلے تو امی جان مجھے ایک اعلیٰ
گرگابی لے دیں پھر میرے کپڑے سارے پھٹ گئے ہیں
دو جوڑے ذرا اچھے بنا دیں باقی ایک آدھ معمولی ہی سہی

ظہیر۔ آپا صغرا کو دیکھنا امی جان ذرا۔ ہر وقت
کپڑوں کی پڑی رہتی ہے اتنے کپڑے ہیں پھر بھی کپڑے
ہی کپڑے میں تو یہ کہوں گا۔ کہ مرغیوں کے دڑبے جالی
دار بنا لینے چاہئیں۔ خان نے اپنے دڑبے ایسے بنائے ہیں
کہ میں نے کبھی نہیں دیکھے۔

زہرا۔ بس ظہیر کو تو بطخوں کا، مرغیوں کا، کنکووں کا
ہر وقت خیال رہتا ہے میں تو امی جان سے کہوں گی اگر شاید
نکل ہی آئے جس کی کوئی امید نہیں۔ تو ایک مشین خرید لیں

امی جان۔ آج روپے تو بھیج دئے اب جب تک
نام نہ نکلیں گے ان کے لئے اور کوئی کام نہ ہوگا۔

صغرا۔ تو امی جان کیا حرج ہے اگر نکل ہی آئے
تو اس کمرے کی سفیدی ضرور کرا لینی چاہئے۔ اور ایک دری ہو

ظہیر۔ امی جان جب کبھی منظور مجھ سے ملنے آتا ہے
تو ایمان سے ایک کرسی بھی نہیں گھر میں ہوتی اور چچا جان سے
مجھے مانگتے شرم آتی ہے۔ میرا خیال ہے دو تین کرسیاں
ہوں تو بہت اچھا ہے۔

امی جان۔ سب کچھ ہی ہو جائے جو لوگوں کا دینا
ہے۔ وہ نہ دیا جائے۔ میں تو کہتی ہوں اگر نکل ہی آئے۔ تو
جن جن کا دینا ہے انہیں دے دوں۔ پھر دیکھی جائے گی

زہرا۔ آپ بھی ان کی طرح خیال کرنے لگ گئیں
کہ ضرور نکل آئے گی۔

ظہیر۔ تو آپا جان ایک انعام تھوڑا ہی ہوتا ہے۔
کئی ہوتے ہیں۔ اول۔ دوم۔ سوم اور معلوم نہیں کتنے کوئی
بھی نکل آئے تو کمال ہو جائے۔

صغرا۔ سچ مچ آپا جان ذرا سوچو تو سہی کمرا صاف
ہو جائے، دری ہو جائے، مشین ہو جائے، قرض اتر جائے
کپڑے بن جائیں، توبہ توبہ امی جان پھر تو جنت ہی بن جائے

ظہیر۔ امی جان آپا صغرا تو یونہی کہتی ہیں ان کا کیا
ہے۔ ایمان سے سائیکل کی سخت ضرورت ہے۔ سب سائیکلوں
پر آتے ہیں آج کل تو قیمت بھی کچھ نہیں۔

امی جان۔ اچھا اچھا اب کان مت کھاؤ دیکھا
جائے گا۔

صغرا۔ امی جان میرا خیال ہے۔ رضائیوں کے لئے
ایک ٹرنک ضرور لے لینا چاہئے۔ الگنی پر لٹکے رہنے سے
خراب ہو گئی ہیں۔ آپ میرا لحاف اوپر ڈال دیتی ہیں بالکل خراب
ہو گیا ہے۔

زہرا۔ کس طرح خراب ہو گیا ہے، اس پہ کمبل نہیں
پڑا رہتا۔ اور پھر گاڑھے کی چادر۔

صغرا۔ تو کیا ہوا پھر بھی نچلے لحافوں سے تو خراب ہی
رہتا ہے۔ اور اب تو اس میں کچھ رہا بھی نہیں کتنے سال کا پرانا ہو
گیا ہے۔ امی جان اگر میرا لحاف نیا بن جائے تو . . . .

امی جان۔ سبھی کچھ ہو جائے گا مہینہ تو گذر لینے
دو۔ کہ "سوت نہ کپاس کولی سے لٹھم لٹھا"!

ظہیر۔ آپا صغرا اگر نکل آئے تو ایک گراموفون نہ لے
لیں۔ کتنے کو آتا ہوگا؟

صغرا۔ پتہ نہیں کیوں امی جان کتنے کو آتا ہوگا؟

امی جان معلوم نہیں۔ زہرا وہ تیری سہیلی مختار کے ابا نے ابھی ابھی لیا ہے کتنے کو لیا ہے؟

زہرا۔ وہ تو اسی روپے کا ہے پیٹیں ملا کے کہتے تھے ڈیڑھ سو کو آجاتا ہے۔

ظہیر۔ تو کیا ہے لاٹری نو کئی ہزار کی نکلتی ہے۔

زہرا۔ چل بے رہنے دے بڑا کہیں کا!

صغرا۔ ایمان سے آپا جان لطف ہی آجائے اگر باجا ہو تو کیا مزا ہے۔

زہرا۔ اچھا اچھا اب کام کر دیں تمہاری طرح بیکار تو نہیں ہوں اٹھ ظہیر بازار سے پیاز لادے پیاز ختم ہے میں مصالح پیس لوں

ایک ماہ بعد

(شام کا وقت ہے ظہیر ابھی سکول سے نہیں آیا)

صغرا۔ امی جان ہماری قسمت ہی ایسی ہے مجھے بھی کبھی کبھی شک ہوتا تھا کہ آخر ہمارے ہی نام کیسے نکل آئے گی اور اتنے لوگ ہیں ان کے نام کیوں نہ نکلے گی اور پھر.....

امی جان۔ مجھے تو اس بات کا ڈر ہے کہ ظہیر آئے گا تو اسے کتنا صدمہ ہوگا اسے تو اب یقین ہو چلا تھا کہ ضرور بالضرور ہمارے نام ہی نکل آئے گی۔

زہرا۔ اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ نکلی تو چچا اکرم کے نام خواہ چوتھے درجے کا انعام ہی تھا مگر پانچ سو روپے بھی پانچ سو ہوتے ہیں آخر۔

صغرا۔ دیکھو نا امی جان چچا جان کے پاس تو آگے ہی اتنے روپے ہیں۔ ان کے نام نکلا بھی تو کیا۔

امی جان! اور پھر ظہیر بچارے نے اپنی پونجی بھی ساری دے دی اور تو نے بھی۔ مجھے تو اس بات کا بہت افسوس ہے۔

صغرا۔ چلو امی جان جانے دو اب کیا ہو سکتا ہے ہماری قسمت ہی بُری تھی۔

زہرا۔ آخر اتنے انعام تھے پانچواں ڈھائی سو کا تھا۔ وہی نکل آتا تو کیا تھا

امی جان! اور اکرم کو تو یاد بھی نہ تھا وہ بھول بیٹھا تھا اسے کیا دو ریوں کی پروا اور ادھر جھٹ تار!

صغرا۔ اچھا (ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے) نہ سہی۔

امی جان! ظہیر کو چھٹی ہو گئی ہو گی آتا ہو گا مجھے تو نہیں سوجھتا اسے کیونکر کیا۔

زہرا۔ یہ صغرا تو تھوڑا سا رو کے چپ ہو گئی تھی اللہ گھسی ہوئی تھی میں جو ڈیمٹی کا گولا لینے گئی تو سسکیوں کی آوازیں حیران! میں نے کہا ہو نہ ہو صغرا ہے۔

امی جان۔ صغرا بہت اچھی بیٹی ہے بڑی سمجھدار ہے آخر لاٹری نہیں نکلی تو کیا ہوا۔ روٹی تو ملتی ہے پہلے بھی گذارہ ہوتا تھا اب بھی ہوتا جائے گا

زہرا! امی آخر کیا ہوا دہ بھی تو ہیں جنہیں کھانا بھی نہیں ملتا۔

صغرا۔ تو آپا جان ادھر چچا جان بھی تو ہیں نا جن کے پاس آگے بھی بہت کچھ تھا اب پانچ سو اور آگئے۔

امی جان صغرا بیٹی ایسے ہوا ہی کرتا ہے دنیا میں میں تو پہلے بھی کہتی تھی تمہیں نے بہت مجبور کیا تھا۔

صغرا۔ چلو امی جانے دو کیا ہوا میرے تو تیرہ ہی آنے تھے ظہیر بچارے نے تو بہت مشکل سے وہ آٹھ آنے جمع کیے تھے اس سے بھلا جمع ہوتے تھے۔ بڑی مشکل سے رک رک کر میرے کہنے پر جمع کیا کرتا تھا۔

امی جان، اب آتا ہی ہو گا۔ **زہرا** میں کہتی ہوں ہم اسے بتائیں ہی نہ۔ **امی جان۔** کیسے نہ بتائیں دل تو اس کا پہلا سوال ہی یہ ہوتا ہے۔ پھر اکرم بتا دے گا۔ رشیدہ سے سن لے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے نہ تو فوراً لگ جائے گا۔ **صغرا۔** جی بہت مصیبت ہے

زہرا۔ یہ آواز باہر اسی کی ہے کسی سے باتیں کرتا ہے

ظہیر (اندر آتے ہوئے) سلام علیکم +

فیاض محمود

راحت کدہ

(۱)

یہ کیا نسیم نے ولولہ انگیز کر دیا
رنگِ جنوں کو اور بھی کچھ تیز کر دیا
پھر بھر دیا ہے روح میں سوز و گدازِ غم
پھر سازِ دل کو سوز سے لبریز کر دیا

(۲)

اک خوابِ پریشاں ہے وہ بزمِ سرکشی میری
پر چھائی ہوئی ہے بیدلی میری
فضائے دہر پہ ہے شب افشاں
کفِ خاکستر افسردہ ہے قلب تپاں
بس اک آہِ مسلسل رہ گئی ہے زندگی میری

(۳)

مٹے خاموش آغازِ محبت کے حسیں نغمے
کہاں ہیں اب شبابِ عاشقی کے آتشیں نغمے
بس اک ٹوٹا ہوا دل یادگارِ عشق باقی ہے
کہ آنسو بن کے چھپتے ہیں اور کچھ اندوہگیں نغمے

(۴)

فصلِ بہار نغمۂ رنگیں سے مست ہے
گلچیں و گل بدامن و ساغر بدست ہے
اس زمزمہ زار و جلوہ گہِ حسن میں
میرا ہی ایک دل کہ صدائے شکست ہے

اثر صہبائی

کانسٹنٹ گینارڈ

اُن کی شادی محبت کی شادی تھی۔ شادی کے بعد دونوں میاں بیوی بڑی گرمجوشی سے ایک بیٹے کی آرزو کرنے لگے اور یہ ننھی منی ہستی اپنے ماں باپ کی تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے قبل از وقت دنیا میں آموجود ہوئی۔ ماں مرگئی اور باپ نے اس صدمے کی تاب نہ لاکر خودکشی کرلی۔

کانسٹنٹ گینارڈ بے نظیر بچہ تھا لیکن تقدیر اُس کے خلاف تھی۔ مدرسے سے وہ اکثر پٹتا تھا۔ اگرچہ ہمیشہ وہ بے قصور ہوتا تھا۔ دوسرے لڑکوں کی بہ نسبت اُسے زیادہ کام کرنے کو دیا جاتا اور جس سزا کے مستحق دوسرے طالب علم ہوتے وہ بھی کسی نہ کسی حیلے اسی کے حصے میں آتی۔ اسی وجہ سے امتحان کے دنوں میں وہ اکثر بیمار ہوجایا کرتا۔ جب اُس نے اپنی تعلیم ختم کی تو وہ ایک مکار اور احمق مشہور ہوچکا تھا۔

بی۔اے کے امتحان میں اُس نے ازراہ ہمدردی اپنے ساتھی کے لئے بھی پرچہ لکھا، جو قبول کرلیا گیا لیکن خود وہ نقل کرنے کے جرم میں امتحان کے کمرے سے خارج کردیا گیا۔

ایسے ناہموار واقعات اگر کسی دوسرے شخص کو پیش آتے تو وہ بد اخلاق ہوجاتا لیکن کانسٹنٹ گینارڈ ایک شریف انسان تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ خوشی نیکی ہی سے حاصل ہوسکتی ہے اس لئے اُس نے اپنی ناکامی کو شجاعت کے ذریعہ سے فتح کرنے کی ٹھان لی۔

جس کارخانے میں وہ ملازم تھا ایک دن اُس میں آگ لگ گئی۔ جب اُس نے اپنے آقا کا اُداس چہرہ دیکھا تو بے خوف ہوکر بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود پڑا تاکہ قیمتی کاغذات اور نقدی وغیرہ بچا سکے۔ اُس کے بال جل گئے اور بازو اور ہاتھ جھلس گئے لیکن اپنی جان پر کھیل کر وہ صندوق کو توڑنے اور نقدی وغیرہ کو اُس میں سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ یکایک اُس نے محسوس کیا کہ کوئی اُس کو باہر کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔ دو سپاہی اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔

ایک مہینے تک مقدمہ چلنے کے بعد اُسے چوری کے جرم میں پانچ برس کی قید کا حکم سُنادیا گیا۔

قید خانے میں بغاوت ہوگئی اور باغیوں کے حملے سے ایک محافظ کو بچانے کی کوشش میں اُس نے نادانستہ طور پر خود اُسے اڑنگا لگاکر پچھاڑ دیا۔ باغی اُس محافظ پر ٹوٹ پڑے اور اُسے قتل کردیا۔

کانسٹنٹ گینارڈ کو بلا تکلف جلاوطن کرکے کال کوٹھری میں بند کردیا گیا لیکن اپنی بے گناہی کی تقویت پاکر

کسی طرح بچ نکلا اور پھر فرانس میں آ کر کسی دوسرے نام سے رہنے سہنے لگا۔ یہ سمجھ کر کہ اپنی حکمت سے اس نے قسمت کو ہرادیا ہے اس نے نیکی کے کام ایک مرتبہ پھر شروع کئے۔

ایک دن ایک میلے میں اس نے ایک بگٹٹ گھوڑے کو دیکھا جو گاڑی سمیت ایک خندق میں گرنے کے قریب تھا۔ یکایک وہ گھوڑے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی کلائی خم کھا گئی، ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور ایک پسلی شدید طور پر زخمی ہوئی لیکن گھوڑا اور گاڑی بچ گئی۔ مگر گھوڑے نے پلٹ کر ہجوم کی طرف رُخ کیا اور ایک بڈھے آدمی، دو عورتوں اور تین بچوں کو روند ڈالا۔ گاڑی کے اندر کوئی نہ تھا۔ . . .

بہادری کے کاموں سے مایوس ہو کر کانسٹنٹ گینارڈ نے خاموش اور پُرامن طریق پر نیکی کرنے کا فیصلہ کیا، اور دنیا کی مصیبت کو کم کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ لیکن وہ روپیہ جو وہ نادار عورتوں کو مدد کے طور پر دیتا اُن کے شوہر نہایت بے دردی سے شراب خانوں میں اُڑا دیتے۔ غریب مزدوروں کو اُس نے گرم کپڑے تقسیم کئے لیکن وہ سخت موسم کو برداشت کرنے کے عادی تھے، اس لئے وہ کھانسی زکام وغیرہ میں مبتلا رہنے لگے۔ ایک آوارہ کتے کو اس نے اپنے گھر میں رکھا جس سے محلّے کے چھ آدمی ہڑک کے مرض میں گرفتار ہو گئے۔ ایک دلچسپ نوجوان نے جس کے لئے اُس نے ایک معقول رقم خرچ کر کے فوج میں جگہ حاصل کی بعد میں قلعے کا نقشہ دشمن کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

کانسٹنٹ گینارڈ نے خیال کیا کہ روپے کا عام استعمال فائدے سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔ اس لئے اپنی نیکی کو یوں بیکار کھونے کے بجائے اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی دولت کو ایک ذات واحد کے لئے مخصوص کر دے۔ چنانچہ اُس نے ایک یتیم لڑکی لے کر اپنے پاس رکھی جو خوبصورت تو قطعاً نہ تھی لیکن بعض اعلیٰ صفات سے متصف تھی۔

ایک باپ کی سی شفقت کے ساتھ اُس نے اس بچی کی پرورش کی۔ آہ! اُس نے اُس سے اتنی مروت اتنی محبت اور اتنی شفقت کا برتاؤ کیا کہ ایک شام لڑکی نے آ کر اپنے تئیں اُس کے قدموں میں گرا دیا اور اُس سے اپنے عشق کا اظہار کرنے لگی۔ اُس نے اُسے سمجھایا کہ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھا اور اگر اب میں تمہاری اس ترغیب کو قبول کر لوں تو مجھے ایسا محسوس ہو گا جیسے میں کسی بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔

اس نے ایک باپ کی طرح اُس کے سامنے دلیلیں اور معذرتیں پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جسے وہ غلطی سے عشق سمجھ رہی ہے وہ درحقیقت اس کے احساس کی بیداری ہے۔ مگر اُس نے وعدہ کیا کہ وہ اُس کے لئے بہت جلد ایک شوہر تلاش کر کے اُس کی شادی کر دے گا۔

دوسری صبح اُس نے دیکھا کہ وہ اس کی دہلیز پر مردہ پڑی ہوئی ہے۔

اُس کے بعد کانسٹنٹ گینارڈ نے نیکی سے دست بردار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اور قسم کھائی کہ آئندہ

نیکی کرنے کی بجائے وہ صرف بدی کے روک دینے پر اکتفا کرے گا۔

اس واقعے کے کچھ دیر بعد اتفاقاً اُسے ایک ایسے جرم کا علم ہو گیا جو اُس کے ایک دوست سے سرزد ہونے والا تھا۔ وُہ اُس دوست کو نہایت آسانی کے ساتھ پولیس کے حوالے کر سکتا تھا لیکن اُس نے مجرم کو نقصان پہنچائے بغیر جرم کا ازالہ کرنا مناسب خیال کیا۔ چنانچہ اُس نے اُس کی تجاویز کے تمام ناکے بند کر دئے اور اُس وقت کا انتظار کرنے لگا جب وہ اُس کی کوششوں کو کالعدم کر کے رکھ دیتا۔ لیکن اُس خبیث کو اس کا علم ہو گیا اور اُس نے اپنے کام کو کچھ ایسے طریق پر جاری رکھا کہ جرم تکمیل کو پہنچ گیا، مجرم بھاگ گیا کانسٹنٹ گینارڈ گرفتار کر لیا گیا۔

کانسٹنٹ گینارڈ کے خلاف سرکاری وکیل کی تقریر دلائل و براہین کا ایک شاہکار تھی۔ اُس نے ملزم کی تمام گذشتہ زندگی پر تبصرہ کیا۔ اُس کا تباہ حال بچپن، اُس کی مدرسے کی سزائیں، اُس کا امتحان سے اخراج، پہلی ہی چوری میں اُس کی جرأت، قید خانے کی بغاوت میں اُس کی مکروہ سازش، کال کوٹھڑی سے اُس کا بھاگ نکلنا اور پھر ایک دوسرے نام سے فرانس میں آکر رہنا، یہ تمام منازل اُس نے بیان کر ڈالیں۔

اس کے بعد مقرر اپنی عدالتی لسّانی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اُس نے کہا کہ ملزم نے تمام عمر نیکی کو ایک پاکھنڈ بنائے رکھا، اُس نے شریف گھروں میں خلل اندازی کی، اپنی نفسانیت کی تسکین کے لئے وہ غریب عورتوں کے شوہروں کو روپیہ دے کر شراب خانوں میں بھیج دیتا رہا۔ اُس نے اپنی فیاضی کا ایک ڈھونگ بنا رکھا تھا۔ لوگوں کو تحفے دے کر وہ جھوٹی شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا...... وہ خیر خواہیٔ خلق کے پردے میں ایک دیو خونخوار تھا۔

پھر اُس نے ذرا خوف آمیز لہجے میں اُس کی سُلجھی ہوئی عیاریوں کا پول کھولنا شروع کیا۔ اُس نے کہا کہ وہ ایک لفنگا آدمی ہے جس نے ایک دیوانے کتے کو محض لوگوں پر چھوڑنے کے لئے اپنے پاس رکھا۔ وہ ایک شیطان ہے جس کو بدی سے صرف بدی ہونے کے باعث اُنس ہے۔ اس نے ایک دفعہ اپنی جان پر کھیل کر ایک بگٹٹ گھوڑے کو روکا۔۔۔ کس لئے؟ صرف یہ تماشا دیکھنے کے لئے کہ یہ وحشی جانور ہجوم میں گھُس کر بڈھے آدمیوں کمزور عورتوں اور ننھے بچوں کو کس طرح کچلتا ہے۔

آہ! کیا ایک ایسے شخص سے نیکی کی کچھ توقع ہو سکتی ہے؟ اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ اس نے ہزاروں ایسے جرم کئے ہونگے جن کے متعلق ہمیں کبھی علم نہ ہو سکے گا۔ اس امر کے لئے ایک ہزار اور ایک وجوہ موجود ہیں کہ جس جماعت نے قلعے کا نقشہ بیچ کر فرانس سے غداری کی اُس کے ساتھ یہ بھی شریک تھا۔ اور وہ یتیم لڑکی جس کو اس نے پالا اور جو ایک دن اس کے دروازے میں مری ہوئی پائی گئی اُس کو اس کے سوا اور کس نے قتل کیا ہوگا؟ یہ قتل یقیناً بدکاری، اوباشی اور بے غیرتی کے انہیں ناپاک افسانوں کا ایک باب تھا جن کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔

اصلاحِ ادب

مجھے اردو کی بے شمار کتابیں، اخبارات اور رسالے دیکھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور رنج بھی۔ خوشی اس لئے کہ ہماری پیاری اردو کا دائرۂ اثر وسیع تر ہو رہا ہے اور رنج اس لئے کہ صرف چند کتابوں، ایک آدھ اخبار اور ایک دو رسالوں کے سوا کسی میں بھی صحتِ زبان کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اور نظم کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ ضرورت تھی کہ کوئی جلیل القدر شاعر، وحید العصر ادیب اور مسلم الثبوت محققِ ادب خدمتِ زبان کے اس نہایت اہم پہلو کی طرف توجہ فرماتے لیکن جب میں نے ہر طرف سکوت و جمود کا عالم دیکھا۔ تو اپنی محدود علمی استعداد کے باوجود محض اردو کی محبت سے مجبور ہو کر اس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کا تہیہ کر لیا۔

و بیدہ التوفیق۔

اس مضمون کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہے گا اور نثر و نظم میں عوام کی ناواقفیت کے باعث جو ادبی و عروضی غلطیاں جگہ پا گئی یا رہی ہیں ان کی اصلاح کی جائیگی تاکہ اردو کا معیارِ ادب گرنے نہ پائے اور یہ صحت و فصاحت کے ساتھ وسعت و ترقی کی منزلیں طے کرتی چلی جائے

زمانے کی ہر شے کے مانند زبان میں بھی برابر انقلاب آتا رہتا ہے۔ نئی نئی ضروریات کے ساتھ الفاظ بھی نئے نئے بنتے چلے جاتے ہیں جن میں سے بعض تو ادبی اعتبار سے صحیح ہوتے ہیں اور بعض غلط لیکن غلط بھی اس قدر تیزی کے ساتھ رواج پا کر زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ کہ عام لوگوں کے علاوہ ثقات بھی اُس طرح بولنے اور لکھنے لگتے ہیں۔ گویا وہی غلط الفاظ ٹکسالی اور فصیح قرار پاتے ہیں۔ انہیں غلط العام کہتے ہیں مگر جو غلط الفاظ عوام ہی تک محدود رہتے ہیں اور ثقات کے استعمال میں نہیں آتے، وہ غلط کے غلط ہی رہتے ہیں ان کو غلط العوام بولتے ہیں۔ میرا مقصد موخر الذکر الفاظ کی تصحیح اور ادبی اصلاح ہے۔ نثر سے زیادہ نظم میں اندھیر مچا ہوا ہے۔ اور نظم کا معاملہ نہایت نازک ہے۔ جس کے لئے زیادہ احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہے۔

(نشتر)

نثر

فقرہ۔ ہم نے تبادلۂ خیالات کے لئے ایک انجمن قائم کی ہے

اصلاح۔ ہم نے مبادلۂ خیالات کے لئے ایک انجمن قائم کی ہے

وجہ۔ تبادلہ کوئی لفظ نہیں۔ تَبَادُل بر وزن تَفَاعُل یا مُبَادَلہ بر وزن مُفَاعَلہ صحیح ہے۔

فقرہ۔ "پیامِ مشرق" میں فلسفے کے سوا شعریت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے

اصلاح۔ "پیامِ مشرق" میں فلسفے کے علاوہ شعریت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

وجہ۔ "سوا" وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی چیز کی نفی مقصود ہو۔ مثلاً خدا کے سوا کوئی معبود نہیں" اضافے کے موقع پر "علاوہ" بولتے ہیں۔

فقرہ۔ اس فرض کی ادائیگی آپ کے ذمے ہے

اصلاح۔ اس فرض کی ادائی آپ کے ذمّے ہے

وجہ۔ "ادا" سے "ادائی" آئے گا۔ جیسے "صفا" سے "صفائی"۔ "ی" سے پہلے "گ" کسی قاعدے سے درست نہیں۔ اور نہ یہ مستثنیٰ ہے۔ نہ غلط العام۔ اسی طرح "ناراضی" کی جگہ "ناراضگی" بھی غلط ہے۔

فقرہ۔ اردو زبان دن بدن ترقی کر رہی ہے۔

اصلاح۔ اردو زبان روز بروز ترقی کر رہی ہے۔

وجہ۔ "دن بدن" اصل میں "دن بہ دن" تھا اور "بہ" فارسی ہے۔ اس لئے ہندی اور فارسی کی ترکیب درست نہیں

فقرہ۔ آج ۲۸ جمادی الاول ہے میں انشاء اللہ ۲ جمادی الآخر کو حاضرِ خدمت ہونگا۔

اصلاح۔ آج ۲۸ جمادی الاُولیٰ ہے میں انشاء اللہ ۲ جمادی الاُخریٰ کو حاضرِ خدمت ہوں گا۔

وجہ۔ "جُمادیٰ" مؤنث ہے۔ اس لئے اس کی صفت بھی مؤنث ہی آنی چاہیئے۔ "جمادی الثانی" اور "جمادی الثانیہ" بھی غلط ہیں کیونکہ اوّل تو یہ عربی میں مستعمل نہیں دوسرے "ثانی" وہاں آتا ہے جہاں اس کے بعد "ثالث" بھی آئے۔

فقرہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حوادثِ زمانہ سے مصئون و مامون رکھے!

اصلاح۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حوادثِ زمانہ سے مَصُون و مامون رکھے۔

وجہ۔ "مَصُون" بر وزن مَقُول اجوف واوی ہے مہموز العین نہیں۔ اس کا مادہ "صَوْن" ہے "صِان" نہیں۔ یہ اصل میں مصوون تھا

فقرہ۔ میں نے آپ کے مضمون میں صرف ایک فقرہ ایزاد کیا تھا۔

اصلاح۔ میں نے آپ کے مضمون میں صرف ایک فقرہ زیادہ کیا تھا۔

وجہ۔ "ایزاد" کوئی لفظ نہیں۔ بابِ افعال سے ازادہ آتا ہے۔ جو اردو میں مستعمل نہیں۔ "ایزادی" غلط در غلط ہے۔

فقرہ۔ آپ نے کیوں خاموشی اختیار کی ہوئی ہے

اصلاح۔ آپ نے کیوں خاموشی اختیار کر رکھی ہے

وجہ۔ "نے" کے ساتھ "ہوا"۔ "ہوئے" یا "ہوئی" کا استعمال قواعد کی رُو سے غلط ہے۔

فقرہ۔ کتاب کو پڑھا گیا۔

اصلاح۔ کتاب پڑھی گئی۔

وجہ۔ فعل مجہول سے "پہلے" کو نہیں آتا لیکن جب مفعول مالم یُسمّ فاعلہٗ کے ساتھ ایک اور مفعول آئے۔ "تو" "کو" ضرور لکھیں گے۔ مثلاً مصنف کو ہزار روپیہ دیا گیا۔ اگر فعل مجہول کرب ہو۔ اور دوسرا مفعول بھی نہ آئے۔ "تو" "کو" کا لکھنا یا نہ لکھنا دونوں طرح صحیح ہیں۔ مثلاً "کمرے کو آراستہ کیا گیا" اور "کمرہ آراستہ کیا گیا"۔ دونوں درست ہیں۔

بے شک قواعد میں یہی لکھا ہے۔ مگر مستند فصحا اس کی پابندی نہیں کرتے مثلاً حضرت داغ مرحوم لکھتے ہیں۔ کہ ؎

اے حشر امتیاز کہ ہم ہیں شہیدِ ناز
مُردوں کی طرح ہم کو اٹھایا نہ جائے گا

یہاں قواعد کے مطابق "ہم اٹھائے نہ جائیں گے" ہونا چاہئے تھا لیکن زبان کے اعتبار سے حضرت داغ کا پایہ اس قدر بلند ہے۔ کہ کوئی قواعد مرتب کرنے والا ان پر حرف گیر نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ان کا کلام سامنے رکھ کر قواعد بنانے چاہئیں۔ غرض میری ذاتی رائے یہ ہے۔ کہ ایسے موقع پر "کو" کا لکھنا یا نہ لکھنا ادیب یا شاعر کے ذوق پر منحصر ہے۔

فقرہ۔ صبح خیزی ان کا معمول تھا۔

اصلاح۔ صبح خیزی ان کا معمول تھی۔

وجہ۔ "صبح خیزی" مونث ہے۔ اور فعل ناقص تذکیر و تانیث میں اس کے تابع ہوا کرتا ہے۔ نہ کہ خبر کے۔

فقرہ۔ انسان کو چاہئے۔ کہ ہمیشہ تحصیل علم اور ہنر میں مصروف رہے۔

اصلاح۔ انسان کو چاہئے۔ کہ ہمیشہ تحصیلِ علم و ہنر میں مصروف رہے۔

وجہ۔ "تحصیل" مضاف ہے اور "علم" اور "ہنر" دونوں مل کر مضاف الیہ۔ اس لئے اس فارسی ترکیب میں ہندی کا حرف عطف نہیں آسکتا۔

فقرہ۔ سعیدہ اور طاہرہ نے کہا۔ امی جان! اب ہم سوئیں گی

اصلاح۔ سعیدہ اور طاہرہ نے کہا۔ "امی جان! اب ہم سوئیں گے"

وجہ۔ جمع متکلم میں مذکر و مونث کا صیغہ ایک ہی (مذکر) ہوتا ہے۔ مونث کے لئے جمع مونث کا صیغہ نہیں بولتے۔

فقرہ۔ وہ فوق البھڑک لباس پہن کر بزم ادب کے اجلاس میں شامل ہوا۔

اصلاح۔ وہ زرق برق لباس پہن کر بزم ادب کے اجلاس میں شامل ہوا۔

وجہ۔ "فوق البھڑک" کی ترکیب غلط ہے۔ فوق عربی اور بھڑک ہندی ہے۔ اسی طرح "قریب المرگ" بھی غلط ہے کیونکہ "قریب" عربی ہے۔ اور "مرگ" فارسی۔ اس کی جگہ "قریبِ مرگ" لکھنا چاہئے۔

فقرہ۔ مذہب اسلام میں تمام مُنشی چیزیں حرام ہیں

اصلاح۔ مذہب اسلام میں تمام نشہ آور چیزیں حرام ہیں۔

وجہ۔ "نشہ" فارسی ہے۔ اس سے عربی قاعدے کے مطابق "منشی" بنا لینا صحیح نہیں۔ اسی طرح "مرغن" اور "مجرب" بھی غلط ہیں۔

نظم

شعر۔ اپنے خالق کا ہے شاہد آپ ہی
ذرہ ذرہ عالم امکان کا

اصلاح۔ شاہدِ خالق ہے خود ہی اے ...

ذرہ ذرہ عالم ایجاد کا

یا

شاہدِ حق ہے زبانِ حال سے
ذرہ ذرہ عالمِ ایجاد کا

وجہ۔ پہلے مصرع میں تنافر اور ہلکی سی تعقید ہے، دوسرے مصرع کی ترکیب "عالمِ امکاں" (حالتِ اضافت) میں نون کا اعلان غلط ہے۔ اور معناً بھی اس سے "عالمِ ایجاد" بہتر ہے۔ اسی طرح "دل و جاں" (حالتِ عطف) کو بھی "دل و جاں" یعنی اخفائے نون سے باندھنا چاہیئے۔

مصرع۔ ہو اگر تعلیم اچھی خوب تربیت بھی ہو

اصلاح۔ ہو اگر تعلیم اچھی تربیت بھی خوب ہو

وجہ۔ "تَرُبِیَّت" (بہ تشدید یا) غلط ہے "تَرْبِیَت" (بفتح یا) بر وزن تَفْعِلَہ) لکھنا چاہیئے اسی طرح "تَقْوِیَّت" غلط اور "تَقْوِیَت" صحیح ہے۔

اشعار۔

غیر سے لکھوا دیا خط کا جواب ۔ کیا خطِ تقدیر تھا خط کا جواب
وہ نہیں آتے۔ نہ آئیں خوش رہیں ۔ خیر جی دے تو دیا خط کا جواب
بن گئی کیا تجھ پہ قاصد خیر ہے؟ ۔ منہ سے تو کچھ پھوٹ کیا لایا جواب

اصلاح۔ پہلے دونوں شعر ٹھیک ہیں تیسرے شعر کا دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیئے۔ منہ سے تو کچھ پھوٹ لا خط کا جواب۔

وجہ۔ مطلع میں "دیا" اور "تھا" قافیہ اور "خط کا جواب" ردیف ہے۔ دوسرے شعر میں بھی قافیہ و ردیف ٹھیک ہیں لیکن تیسرے شعر میں "لایا" قافیہ اور فقط "جواب" ردیف ہے حالانکہ اس میں بھی پہلے دونوں شعروں کی طرح "خط کا جواب" ردیف اور کوئی صحیح قافیہ لانا چاہیئے تھا۔ پہلے دونوں شعر عیب کی وضاحت کے لئے لکھے گئے ہیں۔

شعر:۔

وہ راہ میں ہیں سُنا ہے۔ اب آئے کہ آئے
کدھر کا قصد ہے۔ او جان بیقرار نہیں

اصلاح۔

وہ راہ میں ہیں اب آئے کہ آئے دم بھر میں
کدھر کا عزم ہے او جان بیقرار نہیں

یا

وہ راہ میں ہیں ابھی آئے جاتے ہیں دم سے
کدھر کا عزم ہے او جان بیقرار نہیں

وجہ۔ "کہ" میں "ہ" کا اعلان غلط ہے۔ دوسرے مصرع میں تنافر ہے "عزم" سے یہ خامی بھی رفع ہو گئی۔ اور شعریت بھی قائم رہی۔

اشعار۔

نغمۂ نے بن گیا، سوزِ عنادل ہو گیا
نالۂ دل چٹکیاں لینے کے قابل ہو گیا
پہلے وہ سفاکیاں تو خیر سے پیدا کرد
آپ خنجر باندھ کر سمجھے کہ قاتل ہو گیا
اب کہاں جائیں کسے چاہیں کدھر کے ہو رہیں
رُوٹھنا چھوڑ دو کہ جینا ہم کو مشکل ہو گیا

اصلاح۔ پہلا شعر ٹھیک ہے۔ اگرچہ دوسرے مصرع میں تنافر کی خامی موجود ہے۔ دوسرا یوں ہونا چاہیئے:

پہلے وہ سفاکیاں تو خیر سے پیدا کریں
آپ خنجر باندھ کر سمجھے! میں قاتل ہو گیا

تیسرا یوں ہو تو بہتر ہے ؎

اب کہاں جائیں۔ کیسے چاہیں گدھر کے ہو ہیں

تو جو اپنے چاہنے۔ والوں سے غافل ہو گیا

وجہ۔ دوسرے شعر میں "شتر گربہ" ہے یعنی پہلے مصرع میں "کر" اور دوسرے میں "آپ" لکھا ہے۔ نیز دوسرا مصرع تنافر کی خامی رکھنے کے علاوہ قواعد کے رُو سے بھی غلط ہے۔ یا تو یوں ہوتا کہ "آپ خنجر باندھ کر سمجھے کہ قاتل ہو گئے" اگرچہ تنافر پھر بھی موجود رہتا ہے لیکن اس طرح ردیف قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ یا اصلاح مذکور کے مطابق "کہ" کی جگہ "میں" ہونا چاہئے تھا۔ اور یہی ٹھیک ہے۔ تیسرے شعر کا قافیہ غلط ہے کیونکہ جب مطلع میں تاسیس و دخیل کی قید ہے تو تمام اشعار میں لازماً قید ہونی چاہئے تھی یعنی "مشکل"۔ "دل"۔ "منزل" وغیرہ نہیں لا سکتے۔ بلکہ "غافل" "نازل"۔ "حاصل" وغیرہ لانے چاہئیں۔ ماہرین عروض اس نکتے کو خوب سمجھیں گے۔ پہلا شعر قافیوں کی وضاحت کے لئے لکھا گیا ہے۔

شعر۔ اُف۔ اُف مری وحشت ترے قربان ہی جاؤں

دامن کو سنبھالا تو گریباں نہیں ملتا

اصلاح۔ اللہ رے یہ جوشِ جنونِ دلِ وحشی!

دامن جو سنبھالا تو گریباں نہیں ملتا

یا

صدقے ترے اے جوشِ جنونِ دلِ وحشی

دامن جو سنبھالا تو گریباں نہیں ملتا!

وجہ۔ پہلے مصرع میں تنافر کی خامی کے علاوہ "ہی جاؤں" اور دوسرے میں "کو" حشو ہیں۔ شعر:۔

دل کو مرغوب ہیں تمہارے لفظ پھر سنا دو پیارے پیارے لفظ

اصلاح۔ دل کو مرغوب ہیں تمہارے لفظ ؎ پھر سنا دو یہ پیارے پیارے لفظ

وجہ "پیارے" میں "یا" کا اعلان غلط ہے۔ اسی طرح "پاس" اور "دھیان" میں بھی جو ہندی ہیں۔ یا کا اخفا ہی چاہئے

مصرع۔ مجھ کو دھوکا یہ ترا نقش کف پا دے گا۔

اصلاح۔ یہ ترا نقشِ کفِ پا مجھے دھوکا دے گا۔

وجہ۔ "دھوکا" اور "دے گا" میں بہت بُعد ہو گیا جس سے تعقید پیدا ہو گئی۔ قافیہ اور ردیف کو ملا کر پڑھنے سے نہایت مکروہ ذم کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

شعر۔ میں نے ہر ایک گُل کی مہک پر کیا ہے غور۔

چھو بھی نہیں گئی ہے ترے پیرہن کی بُو

اصلاح۔ سُونگھا ہی پھول پھول چمن زارِ دہر کا

چھو بھی نہیں گئی مرے گل پیرہن کی بو

وجہ۔ "ہر ایک گل" میں "ایک" حشو ہے۔ مہک کے لئے غور کرنا اچھا نہیں۔ دوسرے مصرع میں "ہے" حشو ہے۔

شعر۔ جوانی بھی عجب شے ہے کہ جب تک ہی نشا اس کا

مزہ ہے سادے پانی میں شرابِ ارغوانی کا

اصلاح۔ جوانی بھی عجب شے ہے کہ اس کا نشہ ہے جب تک

مزہ ہے سادے پانی میں شرابِ ارغوانی کا

وجہ۔ "نشا" بروزن "وفا" غلط ہے۔ "نشہ" بروزن "پشہ" (بہ تشدید شین) باندھنا چاہئے۔ اس غزل میں "ارغوانی"۔ "جوانی" وغیرہ قافیہ اور "کا" ردیف ہے۔ لہٰذا اس شعر میں ردیف کے ملنے اور قافیے کے نہ ملنے کا نقص موجود ہے۔ شعر:۔

خوف کیا آتشِ دوزخ سے کہ اے زاہدِ خشک ؎ ہے سر پہ سے مرے دامنِ تر کا ٹکڑا

اصلاح۔ خوف کیا آتشِ دوزخ سے ہمیں زاہدِ خشک

سر پہ ہے روزِ جزا دامنِ تر کا ٹکڑا

پہلے مصرع میں "کہ" "اے" اور دوسرے میں "میرے" "سے" حشو قبیح ہیں

(نشتر جالندھری)

فروغِ نظر

ہر شے میں مجھے تیری تصویر نظر آئی
دُنیا تری صورت کی تفسیر نظر آئی

پردہ ترے چہرے سے اُٹھا تو سہی لیکن
ہر شخص کو اپنی سی تصویر نظر آئی

پاتا ہوں ارادوں میں ہاتھ اُس کے اشارے کا
تدبیر کے پردے میں تقدیر نظر آئی

بیداریٔ ہستی بھی اِک خوابِ پریشان تھی
جب بند ہوئیں آنکھیں تعبیر نظر آئی

رحمت نے تو عصیاں کو کوثر میں دیئے غوطے
پر مجھ کو ندامت بھی تعزیر نظر آئی

میں خوں کا اسدؔ اپنے الزام دھروں کس پر؟
قاتل نہ نظر آیا شمشیر نظر آئی!

اسدؔ ملتانی

غزل

تیری نظر نے دل کو مرے دِل بنا دیا
رازِ نیازِ عشق کے قابل بنا دیا

میں اس جہانِ عشق میں وہ دردمند ہوں
جس شے پہ کی نگاہ اُسے دِل بنا دیا

مجھ کو نہ کیوں مآلِ محبت پہ ناز ہو
جس نے نگاہِ رحم کے قابل بنا دیا

بحرِ فنا میں دل کے سفینہ نے ڈوب کر
ہر موجِ بیقرار کو ساحِل بنا دیا

اِس زندگی کو میرے تخیل نے آپ ہی
آسان بنا دیا۔ کبھی مشکل بنا دیا

ناکامیوں نے دِل میں جگہ پا کے کاظمیؔ
ہر آرزو کو جذبۂ باطِل بنا دیا

کاظمی (ہردوئی)

شبِ حرماں

تھی شام بلاخیز غضب ناک ہوائیں
آتی تھیں ہر اک سمت سے پُرہول صدائیں

وُہ رقص بلاؤں کا وہ جنگ ابر و ہوا کی
وہ رعد کے نالے وُہ جنوں خیز اُداسی

بجلی کے کڑکنے سے فلک کانپ رہا تھا
اور سینۂ گیتی میں بھی اک حشر بپا تھا

اس حال میں اک دردو غم و یاس کا مارا
اِک خانۂ تاریک میں بے جاں سا پڑا تھا

وہ اُس کا عذابِ غمِ پنہاں سے تڑپنا
وہ نالۂ دل شکوۂ بے مہریٔ دنیا

چھوٹی ہوئی نبضیں، الم انگیز نگاہیں
جوشِ غم و حرماں میں وہ ڈوبی ہوئی آہیں

اندوہ و غم و یاس میں دم توڑ رہا تھا
جز ذاتِ خدا اور کوئی پُرساں نہ تھا اُس کا

اُف کتنی الم ناک و غم انگیز تھی وُہ رات
اے رازِ حزیں کتنی بلاخیز تھی وہ رات

محمد جمیل خان راز

غزل

وفا یا فریبِ وفا چاہتا ہوں
کوئی زیست کا آسرا چاہتا ہوں

جو ہمت ہو مجھ کو سنبھالیں دو عالم
کسی کی نظر سے گرا چاہتا ہوں

تبسم ہے برحق مری سادگی پر
محبت بشرطِ وفا چاہتا ہوں

تمنّا ہے مچلی ہوئی آرزو کی
تڑپتا ہوا مُدعا چاہتا ہوں

توجہ پہ لرزاں تغافل سے نالاں
خدا جانے میں اُن سے کیا چاہتا ہوں

فقط ایک جلوہ فقط اِک تبسم
گناہِ وفا کی سزا چاہتا ہوں

زہے حسنِ مقصد کہ ہر دل میں زیبا
محبت کی نشوونما چاہتا ہوں

زیبا ردولوی

یونانی غلام کی سرگزشت

میں یونان میں پیدا ہوا۔ میرے والدین سمرنا میں غربت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب میں بیس برس کی عمر کو پہنچا۔ تو میرے والدین کا انتقال ہوگیا۔ اب مجھے اپنے لئے ذریعۂ معاش کی فکر ہوئی۔ اس سے پہلے بھی میں ایک یہودی شراب فروش کی ملازمت کر چکا تھا۔ چنانچہ میں پھر اسی کے پاس ملازم ہوگیا۔ جب مجھے وہاں کام کرتے ہوئے تین سال گذر گئے۔ تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جو میری گذشتہ خوشحالی اور موجودہ تباہی کا موجب ہوا۔

جس وقت کا ذکر میں کر رہا ہوں۔ ان دنوں میں نے اپنی محنت اور میانہ روی سے اپنے آقا کو ایسا خوش کر دیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کا منظورِ نظر ہو گیا۔ بعض دفعہ وہ صرف شراب خانے کا انتظام میرے سپرد کر دیتا۔ لیکن کبھی کبھی مجھے خود ہی تمام کام کرنا پڑتا۔ اس وقت میرے ذمہ شراب کو چھان کر صاف کرنا اور اسے ہر طرح سے تیار کر کے بازار کے لئے قابلِ فروخت بنانا تھا۔

میرے ماتحت یوٹوپیا کا ایک حبشی غلام بھی کام کیا کرتا تھا۔ وہ ایک نہایت طاقتور گرانڈیل اور ضدی شخص تھا بعض دفعہ میرے مالک کے لئے اس سے کام لینا تقریباً دشوار ہو جاتا۔ اسے زبردست سے زبردست سزا دی جاتی۔ لیکن اُس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا۔ کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ غضبناک اور ڈھیٹ ہو رہتا۔ جب کبھی میں اُس کا کوئی قصور معلوم کرتا جو بے پروائی کے باعث اُس سے سرزد ہوا ہو۔ تو اُس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگتے۔ مجھے ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں کسی وقت وہ مجھے جان ہی سے نہ مار ڈالے۔ میں نے اپنے مالک سے کئی دفعہ التجا کی کہ وہ اُسے ملازمت سے علیحدہ کر دے لیکن چونکہ وہ نہایت مضبوط اور قوی آدمی تھا اور حسبِ مرضی شراب کا بڑے سے بڑا کُپّا بھی بغیر کسی کی مدد کے اٹھا لے جاتا تھا۔ اس لئے میرے مالک کو اُس کا لالچ میری پیہم التجاؤں کے باوجود بھی حبشی کو علیحدہ کرنے سے باز رکھتا۔

ایک صبح جب میں شراب خانے میں داخل ہوا۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ وہ حبشی غلام اُس کُپّے کے قریب غافل سو رہا ہے جو میں نے اُسے فوراً صاف کرنے کے لئے دیا تھا۔ اور جس کی اس وقت شدید ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ضرور اُسے اب تک صاف کر چکا ہوگا۔ مگر اُس کی غفلت دیکھ کر جی میں آیا کہ مار مار کر اس کی تمام سستی نکال دوں۔ لیکن اُس کو سزا دینے کی مجھے خود جرأت نہ ہوئی۔ اور میں اپنے آقا کو بُلا لایا۔ تاکہ وہ اس کے طرزِ عمل کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے۔ میرا یہودی آقا اُس کی غفلت اور سستی دیکھ کر سخت برہم ہوا۔ اس نے ایک لکڑی اُٹھا کر زور سے حبشی کے سر پر دے ماری حبشی غصہ کے مارے جست بھر کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جب اُس نے میرے بجائے آقا کو ہاتھ میں لکڑی لئے ہوئے دیکھا۔ تو وہ بڑبڑاتے ہوئے پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ اور سلسلہ ہی آ "

سے جاتی دفعہ کہہ گیا "اتنا پٹ پٹ کر تو میں بھی یہاں کام نہیں کروں گا" جب میرا آقا شراب خانے سے باہر چلا گیا تو حبشی مجھ پر برس پڑا کہ تم نے میرے خلاف کیوں اطلاع دی تھی۔ وہ لکڑی کا ایک سانٹا پکڑ کر مجھ پر جھپٹا تاکہ میرا سر اس سے پاش پاش کر دے میں جلدی سے کپے کی آڑ میں ہو گیا۔ اُس نے مجھ پر پھر حملہ کیا۔ رستے میں ایک کلہاڑی پڑی تھی جب میں نے اپنی مدافعت کے لئے اُس پر ہاتھ ڈالا۔ اُس وقت حبشی ایک سٹول سے ٹھوکر کھا کر زمین پر آن گرا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی اپنی کلہاڑی سے اُس کے ایسی ضرب لگائی کہ اُس کی کھوپڑی بالکل پھٹ گئی۔ اور اب وہ میرے قدموں میں مُردہ پڑا تھا۔

اس واقعہ سے میں سخت دہشت زدہ ہو گیا۔ اگرچہ میں نے جو کچھ کیا تھا محض اپنی جان بچانے کی خاطر کیا تھا۔ اور میں اپنے آپ کو بالکل حق بجانب خیال کرتا تھا۔ تاہم مجھے معلوم تھا۔ کہ میرا آقا حبشی کی موت پر بہت رنجیدہ ہو گا۔ اور ممکن تھا کہ وہ غصہ میں آکر مجھی کو قصوروار ٹھہراتا۔ چونکہ اس وقت کوئی ایسا آدمی بھی موجود نہ تھا جو میری بے گناہی کی شہادت دے۔ اس لئے بہت ممکن تھا کہ میں قانون کے شکنجے میں بری طرح جکڑا جاتا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد مجھے یہ تدبیر سوجھی۔ کہ حبشی یہ تو کہہ ہی چکا ہے کہ "میں اس طرح پٹ کر یہاں آئندہ کام نہ کروں گا" اس لئے میں اپنے آقا کو بہت آسانی سے یہ یقین دلا سکوں گا کہ وہ ملازمت ترک کر کے بھاگ گیا ہے۔ اور اس عرصہ میں اُس کی لاش کہیں چھپا دوں گا۔ لیکن یہ بھی تو کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس کی لاش کو باہر نکالنے میں مجھے اپنی پوری قوت سے کام لینا پڑا۔ مگر آخر کار میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس کی لاش ایک کپے میں ڈال کر اور اس کا ڈھکنا کیلوں سے جڑ کر اُسے گودام میں رکھ آیا۔ جہاں مجھے آئندہ سال کی بکری کے لئے اُس کو شراب سے بھرنا تھا۔ جب یہ کپا اپنی جگہ پر رکھ دیا گیا۔ تو میں نے ایک لمبی نلی کے ذریعے سے تالاب کی شراب سے اس کو بھر دیا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ ایک بھاری بوجھ میرے دماغ سے اتر گیا ہے کیونکہ کافی عرصہ تک اس راز کے افشا ہونے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔

میں اپنا کام ختم کر کے بیٹھا ہی تھا۔ کہ میرا مالک بھی شراب خانہ میں آموجود ہوا۔ اور اس نے دریافت کیا کہ حبشی کہاں ہے۔ میں نے جواب دیا " وہ ملازمت چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ وہ قسم کھا کر کہتا تھا۔ کہ وہ یہاں آئندہ ہرگز کام نہ کرے گا" میرے آقا نے اس کی گرفتاری کے لئے پولیس میں اطلاع دے دی تاکہ وہ اپنے بہترین نوکر کو کہیں کھو نہ بیٹھے۔ کچھ عرصے کے بعد جب "فرار شدہ" حبشی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ تو یہ خیال کر لیا گیا۔ کہ اُس پاگل نے غصہ کی حالت میں خودکشی کر لی ہو گی۔ اس کے بعد نہ تو اُس کے متعلق کچھ کہا گیا نہ سُنا گیا۔ پہلے کی طرح میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ چونکہ میں اس وقت شراب خانے پر پوری طرح سے مسلط ہو چکا تھا۔ اس لئے مجھے امید واثق تھی۔ کہ میں کسی نہ کسی دن چپکے سے اپنا بوجھ اٹھا کر شراب خانے سے باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

جب بہار کا موسم پھر شروع ہوا۔ تو میں بھی اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اتنے میں ترکی سپاہ کا سردار جسے آغا کہتے تھے آموجود ہوا۔ یہ لوگ عام طور پر نہایت ظالم اور خودمختار ہوا کرتے تھے۔ جہاں جاتے ایک تہلکہ بپا کر دیتے۔ وہ آغا بھی انہی میں سے ایک تھا۔ وہ شرابی تھا۔ اور ہمارے بہترین گاہکوں میں سے ایک تھا۔ چونکہ اس کے تمام مصاحب عوام سے روشناس تھے۔ اس لئے وہ ان کو

شراب خریدنے نہ بھیجتا۔ بلکہ وہ خود ہمارے شراب خانے میں آکر ایک کپّا پسند کرلیتا۔ جسے ایک پالکی میں رکھ کر اس کے پردے گرادیے جاتے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا کہ آغا نے کوئی نئی خاتون حرم میں داخل کی ہے۔ میرے آقا نے آغا کو شراب کے وہ سب کپّے دکھائے جو اس سال کی فروخت کے لئے تیار کئے جا چکے تھے۔ اور دو قطاروں میں رکھ دیئے گئے تھے۔ اس نے دو تین کپّوں کی شراب چکھی لیکن اس کو پسند نہ آئی۔ اور کہنے لگا "دوست الیسچر تمہاری قوم سے جہاں تک ممکن ہو ہمیشہ بدترین مال سب سے آگے رکھتی ہے۔ میرے خیال میں جو شراب تم نے مجھے دکھائی ہے۔ اُس سے بہتر پچھلی قطاریں ہوگی۔ ذرا اپنے یونانی سے کہو تو کہ مجھے اُس کپّے کی شراب چکھائے"۔ اُس نے اُس کپّے کی طرف اشارہ کیا جس میں حبشی نبد تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ کہ جونہی آغا وہ شراب چکھے گا۔ اُس کا منہ بدمزہ ہو جائے گا۔ اور وہ اُسے فوراً تھوک دے گا۔ اس لئے میں نے جلدی سے اس شراب کا ایک گلاس بھر کر آغا کو پیش کر دیا۔ اُس نے اس کو چکھا اور پھر نہایت حیرت و استعجاب سے اس کو روشنی میں لے جا کر غور سے دیکھنے لگا۔ اُس نے اُس کو پھر چکھا۔ اور چٹخارے لے لے کر پینا شروع کر دیا۔ پھر وہ میرے مالک کی طرف مخاطب ہو کر یوں گویا ہوا "کیوں بے یہودی کتّے تو مجھے صریح دھوکا دینا چاہتا تھا۔ جب تیرے پاس ایسی خوش ذائقہ مزے دار اور لطیف شراب موجود تھی۔ جسے بہشت کی حوریں بھی مزے سے گھونٹ گھونٹ پیئیں"۔

آقا نے مجھ سے پوچھا۔ کیا "یہ سب شراب ایک ہی قسم کی نہیں"؟ میں نے جواب دیا۔ ہاں جناب یہ سب ایک ہی قسم ہے۔ آغا کہنے لگا "اچھا ذرا اس کو چکھو تو۔ اور پھر اسے چکھو جو تم مجھے پہلے پیش کر رہے تھے"۔ جونہی آقا نے شراب کا گلاس منہ سے لگایا اس کا چہرہ متحیر ہو گیا۔ اور کہنے لگا "بھئی واقعی یہ شراب تو بڑے مزے کی ہے لیکن میں حیران ہوں کہ کیا بات ہے چیرس ذرا اس کو چکھو تو"۔ میرا دل اس شراب کے چکھنے کو ذرا بھی نہ چاہتا تھا۔ میں نے نہایت بددلی سے تھوڑی سی چکھ کر اس کی تائید کر دی۔

آغا کو وہ شراب ایسی پسند آئی کہ اُس نے پچھلی قطار کے دو تین کپّوں کی شراب چکھ ڈالی یہ اُمید کرتے ہوئے کہ شاید اُسے ایسی ہی شراب کچھ اور مل جائے۔ جب اُسے ایسی شراب نہ ملی۔ تو اس نے اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ وہ اس کپّے کو گھر لے جائیں اُنہوں نے وہ کپّا پالکی میں رکھ دیا۔ اور اُسے اُٹھا لے گئے۔

تم اس خوف کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو میں نے اس وقت محسوس کیا جب کہ غلام شراب کا وہ کپّا اٹھا لے گئے۔ میں نے سوچا کہ اب میری جان کی خیر نہیں۔ مجھے فوراً سمرنا سے بھاگ جانا چاہیئے۔ میں نے اندازہ کر لیا۔ کہ کتنے عرصہ میں آغا کی شراب ختم ہوگی۔ اور اس کے مطابق نہایت سرگرمی سے تیاری شروع کر دی۔ میں نے اپنے آقا سے کہہ دیا کہ میں جا رہا ہوں کیونکہ مجھے جزیرۂ ٹنیت میں ایک رشتہ دار نے بلایا ہے تاکہ میں اس سے مل کر کوئی کاروبار شروع کروں۔ میرا مالک جس کا گذارہ میرے بغیر مشکل تھا مجھے وہیں ٹھہرنے پر رضامند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن میں اپنی ضد کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں اس کے پاس ہی رہوں۔ تو وہ مجھے اپنا حصہ دار بنانے پر تیار ہے۔ لیکن میں نے اس کی یہ بات نہ مانی۔ شراب خانے کے دروازے پر ذرا سا کھٹکا ہوتا۔ تو میرا دل دھڑکنے لگتا۔ کہ کہیں آغا اپنے سپاہیوں کے ہمراہ مجھے گرفتار کرنے تو نہیں آرہا۔ مجھے اگلے دن روانہ

ہوتا تھا۔ کہ میرا آقا ہاتھ میں ایک دستاویز لئے شراب خانے میں داخل ہوا۔ اور مجھ سے یوں کہنے لگا چیرس شاید تمہیں خیال ہو گا کہ میں نے صرف تمہیں سفر سے باز رکھنے کے لئے اپنا حصہ دار بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ اور دراصل میں تم کو دھوکا دے رہا ہوں لیکن شک دور کرنے کے لئے میں یہ دستاویز لایا ہوں جس کی رُو سے تم میرے نفع کے تیسرے حصے کے مالک قرار دیئے گئے ہو۔ دیکھ لو اس پر قاضی کی مہر تصدیق بھی ثبت ہو چکی ہے۔

آقا نے کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور میں انکار کرتے ہوئے واپس کرنے ہی کو تھا کہ کسی نے زور زور سے شراب خانہ کا دروازہ کھٹ کھٹا کر ہمیں دہشت زدہ کر دیا۔ سپاہیوں کی ایک جماعت جو آغا نے ہماری گرفتاری کے لئے بھیجی تھی۔ اندر داخل ہوئی۔ مجھے تو معلوم ہی تھا۔ کہ اصل بات کیا ہے۔ میں اپنے دل میں اپنے آپ کو بہت بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ کہ میں فوراً کیوں نہ بھاگ گیا بات یہ تھی کہ آغا کو وہ شراب ایسی پسند آئی۔ کہ اس نے میرے اندازے سے پہلے ہی چٹ کر ڈالی۔ شراب کے کپّے کے تیسرے حصے میں تو غلام ہی سما چکا تھا۔ اِس لئے شراب کا اس قدر جلد ختم ہو جانا لازمی امر تھا۔ اب میرے لئے فرار کا کوئی امکان نہ تھا میرا آقا جو اس حقیقت سے ناآشنا تھا۔ بالکل مطمئن تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے سپاہیوں کے ساتھ ہو لیا۔ لیکن مارے دہشت کے میرا دل پھٹا جاتا تھا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو آغا نہایت غصّہ سے میرے مالک پر برس پڑا۔ اور کہنے لگا "او یہودی کتّے! کیا تو ایک دیانت دار مومن کے پاس دھوکے سے شراب کا ایک ایسا کپّا فروخت کرتا ہے جس کا دو تہائی حصہ بھی بھرا ہوا نہیں۔ فوراً بتا کہ تو نے اس میں بھاری بھاری کیا چیز بھر دی ہے"۔

میرے آقا نے کہا "صاحب میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا بالکل بے قصور ہوں" آغا نے جواب دیا "اچھا کپّا خالی تو ہو چکا ہے۔ ابھی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ذرا اپنے یونانی کو بھیجو کہ اندر لے آئے۔ تاکہ اس کو میری موجودگی ہی میں کھولا جائے"۔ دو سپاہی اندر لانے کے لئے روانہ کر دئے گئے۔ جب وہ پاس آئے۔ تو آغا نے مجھے کپّے کا ڈھکنا اکھاڑنے کے لئے کہا۔ اب مجھے اپنی موت کا پورا پورا یقین ہو چکا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ آغا میرے مقابلے میں آقا سے زیادہ ناراض ہے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ کالے حبشی کی لاش پہچانی جائے گی تو فوراً میرا مالک بری ہو جائے گا۔ اور مجھ پر اس کے قتل کا الزام ثابت ہو جائے گا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جب میں آغا کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کپّے کا ڈھکنا اکھڑ گیا۔ حبشی کی لاش دیکھ کر سب حاضرین دہشت زدہ ہو گئے۔ میں بھی اس کو دیکھتے ہی نہایت خوفزدہ صورت بنا کر پیچھے ہٹا۔ تاکہ مجھ پر سے رہا سہا شک بھی دُور ہو جائے۔ لیکن یہ بات بہت عجیب تھی۔ کہ بجائے اس کے کہ حبشی کی لاش بدستور سیاہ رہتی۔ وہ بالکل سفید ہو چکی تھی۔

"خدایا تیری پناہ"۔ میرے مالک کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: "اے خدا میں کیا دیکھ رہا ہوں ـــــــ ایک لاش اے خدا۔ میری مدد کر۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ کیوں چیرس! تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہو"؟ میں نے جواب دیا کہ "واللہ میں اس سے بالکل بے خبر ہوں۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کے متعلق

کچھ علم نہیں"۔

جب ہمارے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ تو آغا میرے مالک کو نہایت غضبناک نگاہوں سے گھور رہا تھا جن سے آغا کی بے پناہ نفرت اور حقارت ظاہر ہو رہی تھی۔ باقی تمام حاضرین اگرچہ خاموش تھے لیکن اُن کے بشرے سے ظاہر تھا کہ وہ میرے آقا کو چیرنے پھاڑنے میں بھی کوئی دریغ نہ کریں گے۔

میرے آقا نے کہا اے آغا میں بخوشی اس کپّے سے دوسرا تبدیل کر دوں گا لیکن میں لاش کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ آغا نے جواب دیا "یونہی سہی میرا غلام اس کپّے کو ابھی لے آئے گا" تھوڑے سے ہی عرصے میں غلام شراب کا ایک کپّا لے کر آ موجود ہوا۔ میرا آقا آغا سے کہنے لگا۔ گو ایک غریب یہودی کے لئے یہ بڑا بھاری نقصان ہے۔ تاہم میں یہ مفت آپ کی نذر کرتا ہوں" اور اس نے واپس جانے کے خیال سے اپنی ٹوپی اٹھالی۔

آغا نے چلا کر کہا "ٹھہر جاؤ میں تمہاری شراب مفت ہی میں ہضم نہیں کر دوں گا" میرے آقا نے کہا اچھا تو پھر آپ مجھے اس کی قیمت بھی ادا کر دیں گے۔ آپ بڑے انصاف پسند ہیں۔ آغا نے تیزی سے جواب دیا ابھی تم کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور اپنے نوکروں سے کہا کہ وہ اس شراب کو کپّوں میں بھر دیں۔ جب شراب کا کپّا خالی ہو گیا۔ تو آغا نے اس کا ڈھکنا اُتروا دیا پھر اُس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ میرے آقا کو اٹھا کر اُس میں بند کر دیں اُس وقت میرے آقا کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی میں اپنے آپ پر لعنتیں بھیج رہا تھا کیونکہ میرے پاس اپنے آقا کو قصوروار ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور میں جانتا تھا۔ کہ میرے کئے کی سزا اس کو مل رہی ہے۔ سپاہیوں نے میرے آقا کو اٹھا کر اُس کپّے میں بند کر دیا۔ آغا نے مجھے حکم دیا۔ کہ تم پہلے کی طرح اِس پر کیلوں سے مضبوط ڈھکنا لگا دو۔ اگرچہ میرا دل یہ کام کرنے کو بالکل نہ چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس لئے میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اب آغا نے نوکروں کو حکم دیا کہ وُہ اس کپّے کو پھر شراب سے بھر دیں۔ اس طرح میرا بے قصور آقا ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا گیا

اب آغا میری طرف مخاطب ہو کر پوچھنے لگا "تم اس معاملے کے متعلق کیا جانتے ہو؟" میں نے سوچا کہ اب میرے آقا کی جان تو لی جا چکی ہے۔ اب اگر میں اس کو کچھ بُرا بھلا بھی کہہ لُوں۔ تو اُس کا کچھ نہ بگڑے گا۔ میں نے آغا کو جواب دیا "حضور میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ کہ کچھ عرصہ قبل ایک حبشی نہایت پُراسرار طریقے سے غائب ہو گیا تھا اور میرے آقا نے اس کی تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ حضور اب مجھے پورا یقین ہو گیا ہے۔ کہ اس بیچارے کا بھی یہی حشر ہُوا ہو گا۔ اور جناب جب آپ شراب کا وُہ کپّا اٹھا لے گئے تھے۔ تو میرا آقا بہت افسوس کرتا رہا۔ شاید اُس نے وہ کسی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ شاید میری بھی یہی گت بنتی مجھے شک ہے کہ اب باری بھی میری ہی تھی کیونکہ جب میں نے یہاں سے جانے کا ارادہ کیا۔ تو وہ میرے یہیں ٹھہرنے پر مصر ہُوا جب میں کسی طرح نہ مانا تو اُس نے یہ دستاویز پیش کی۔ یہ پڑھ لیجئے۔ اُس کے رُو سے میں اُس کے نفع کے تیسرے حصّے کا مالک قرار دیا جا چکا ہوں۔ شاید میں اس نفع سے زیادہ دیر متمتع نہ ہو سکتا۔

آغا نے جواب دیا اُسے یونانی یہ اچھا ہی ہُوا۔ یہ تمہارے لئے بہت فائدہ مند ہوگا کیونکہ چند شرائط پر تم اُس کی تمام جائداد کے مالک قرار دئے جا سکتے ہو۔ پہلی شرط تو یہ ہے۔ کہ شراب کا یہ کُپّا جس میں یہ حرامی یہودی بند ہے تمہیں اپنے پاس رکھنا ہوگا۔ تاکہ جب میں وہاں آؤں۔ تو اپنے انتقام اور انصاف کی یاد تازہ کر کے خوش ہُوا کروں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ شراب کا یہ دُوسرا کُپّا بھی تم اپنے پاس رکھو جس میں یہ حبشی غلام بند ہے تاکہ اس کو دیکھ کر میرا غصہ تازہ ہو جایا کرے۔ آخری شرط یہ ہے کہ میں تم سے جس قسم کی بہترین شراب مانگوں۔ تمہیں مفت دینی ہوگی۔ کیا تمہیں یہ شرائط منظور ہیں۔ یا میں تمہیں بھی اس گناہ کا ارتکاب کرنے والوں میں سے ایک سمجھوں۔

میں نے شکر کیا۔ اور یہ سب شرائط مان لیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ کہ اس وقت کوئی بھی کسی یہودی کی پروا نہیں کیا کرتا تھا جب مجھ سے کوئی میکائیل کی غیر حاضری کے متعلق کچھ پوچھتا۔ تو میں پوچھنے والے کے قریب نہایت رازداری سے جا کر کہتا کہ آغا کے سپاہیوں نے اُسے قید میں ڈال رکھا ہے اور اس کے رہا ہونے تک میں یہاں کام کروں گا۔

آغا کی خواہش کے مطابق شراب کے دونوں کُپّے جن میں حبشی غلام اور یہودی تاجر بند تھے۔ ایک بنچ پر سب کُپّوں سے اوپر سٹور کے درمیان رکھ دئے گئے۔ آغا ہر شام شراب خانے میں آتا اور گھنٹوں اس کُپّے کی طرف (جس میں میرا آقا بند تھا) ٹکٹکی لگائے گالیاں دیتا رہتا۔ اس دوران میں وہ اس قدر شراب پیتا۔ کہ اکثر اُس کو تمام رات شراب خانے میں بسر کرتے بنتی۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئے۔ کہ میں نے اُن کُپّوں کے مفید اجزا سے کچھ کام نہ لیا۔ میں رات کو چپکے سے اُن کُپّوں میں سے پہلی شراب نکال لیتا اور تھوڑی تھوڑی شراب دوسرے کُپّوں میں ٹپکا دیتا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد میرے پاس شراب کا ایک گیلن بھی ایسا نہ رہا جس میں میرے آقا اور حبشی غلام کے عرق کی آمیزش نہ ہو۔ اب میری شراب پہلے سے بہت بہتر ہوگئی۔ اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مَیں ایک امیر آدمی بن گیا۔

تین سال نہایت خوشحالی میں بسر ہوئے۔ آغا میرا مستقل گاہک بن چکا تھا۔ اور کم از کم ہفتہ میں تین بار میرے شراب خانے میں آکر نشے میں چور پڑا رہتا تھا۔ اب اس کی صحبت نے مجھے بھی پکا شرابی بنا دیا۔ ایک روز اُسے حکم آیا کہ اپنی سپاہ لے کر سلطان کی فوج سے آملے۔

جس دن اس کی فوج کو کُوچ کرنا تھا۔ وہ میرے دروازے پر ٹھہرا۔ اور اپنے عربی گھوڑے سے اُتر کر ایک آخری جام پینے آیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ کوچ شروع کر دیں۔ وہ بعد میں اُن سے آملے گا۔ اس نے بے تحاشا شراب پینی شروع کی۔ ایک گلاس کے بعد دوسرا خالی ہُوا اور دوسرے کے بعد تیسرا۔ ساتھ ہی وقت بھی گذرتا گیا۔ رات ہونے کے قریب تھی اور آغا صاحب معمول نشے میں مخمور پڑا تھا۔ اُس نے مجھ سے اصرار کیا۔ کہ میں اُس کو شراب خانے کے ذخیرہ میں جہاں شراب کے دونوں کُپّے رکھے تھے۔ لے جاؤں تاکہ وہ ایک دفعہ پھر میرے آقا کو اچھی طرح گالیاں دے۔ چونکہ اس رات میں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی تھی۔ اس لئے میں نشے کے عالم میں آغا سے یوں گویا ہُوا۔

"اے قابلِ ستائش آغا! میرے آقا کو زیادہ گالیاں نہ دیجئے۔ کیونکہ دراصل وہی میری خوشحالی کا باعث ہوا ہے چونکہ آپ اب جارہے ہیں۔ اس لئے میں آپ پر ایک راز افشا کئے دیتا ہوں ——— میرے ذخیرے میں شراب کا ایک قطرہ بھی ایسا نہیں۔ جو یا تو میرے آقا یا حبشی غلام سے خوشبودار نہ کر دیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میری شراب بہترین مانی جا چکی ہے؟"

"ہیں! کیا!!" آغا نے بڑبڑا کر کہا جس کے لئے اب نشے کی حالت میں بولنا بھی تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ "اچھا اے حرامی تیری سزا موت ہے۔ تو بھی اپنے مالک کی طرح کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔" تو ایک مومن کو ایک گنہگار کافر کے عرق والی شراب پلاتا رہا۔ اے دجّال! تو ضرور موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔"

وہ لپک کر میری طرف بڑھا لیکن اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اور نشے کے عالم میں وہ دھم سے زمین پر آگرا۔ اور پھر نہ اُٹھ سکا۔ میں نے سوچا کہ یقیناً وہ ہوش میں آنے پر بھی یہ واقعہ نہ بھولے گا۔ اور میں اس کے انتقام کا شکار ہو جاؤں گا۔ موت کے خوف نے اور شراب کے نشے نے مجھے بتا دیا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں نے فوراً آغا کو گردن سے پکڑ کر ایک کُپّے میں گھسیڑ دیا اور اُس کا ڈھکنا مضبوط بند کر کے اس کو شراب سے بھر دیا۔ اس طرح میں نے اپنے غریب آقا کا بدلہ لے لیا۔ اور آغا کا قصہ ہمیشہ کے لئے پاک ہو گیا۔ اس کے بعد میں صحن میں گیا جہاں آغا کا گھوڑا بندھا تھا۔ میں نے آغا کی تلوار لے کر بیچارے جانور کو اچھی طرح زخمی کر کے چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنے گھر چلا جائے۔ آدھی رات کو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے آغا کے گھر والوں کو جگا دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ گھوڑا زخمی ہو چکا ہے اور آغا اس پر سوار نہیں۔ تو انہوں نے خیال کیا۔ کہ آغا کو دشمن کے کسی گروہ نے راستے میں قتل کر دیا ہو گا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ کہ آغا کس وقت میرے گھر سے نکلا تھا۔ میں نے کہا کہ شام ہونے کے ایک گھنٹہ بعد۔ اور میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس وقت شراب کے نشے سے چُور تھا چنانچہ وہ اپنی تلوار بھی یہیں بھول گیا ہے۔ میں نے تلوار ان کے حوالے کر دی۔ اب میں اپنے خطرناک ازدار سے رہائی پا چکا تھا۔ اگرچہ وہ میری شراب کا کافی حصہ پی گیا تھا لیکن میں نے بھی اس کی استعمال شدہ شراب پر سود لگا کر نقصان پورا کر لیا۔ یعنی آغا کی آمیزش سے اپنی باقی ماندہ شراب خوشبودار کر لی۔ میں نے یہ تیسرا کُپّا بھی ان دو کُپّوں کے ساتھ رکھ دیا اب مجھے اور بھی زیادہ نفع ہونے لگا۔ اور میری شراب دُور دُور تک مشہور ہو گئی۔

ایک دفعہ شہر کا قاضی جو میری شراب کی شہرت سُن چکا تھا۔ میرے شراب خانے میں آیا۔ میں اپنی اس عزت افزائی پر جھک کر آداب بجا لایا۔ میں مُدت سے اس کو اپنا خریدار بنانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی کچھ بہترین شراب گلاس میں ڈال کر قاضی کو پیش کی۔ اور کہا "عالی جاہ! یہ میرے آقا کی شراب ہے۔ مرحوم آغا اس کے بڑے شیدا تھے۔ بس جناب وہ تو تمام کا تمام کُپّا ہی اُٹھوا کر لے جایا کرتے تھے" قاضی کہنے لگا۔ ہاں یہ بھی خوب تجویز ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنے غلام کو برتن دے کر بھیجا جائے۔ یہ بہتر ہے۔ کہ تمام کا تمام کُپّا ایک ہی دفعہ خرید لیا جائے۔ تاکہ انسان لوگوں کے اعتراض سے بچ جائے۔ میں بھی ایسا ہی کروں گا لیکن خریدنے سے پہلے مجھے ذرا چکھ لینی چاہئے" اُس نے بہت سے کُپّوں کی شراب چکھی۔ لیکن اُس کو سب سے زیادہ پسند وہی آئی جو میں نے پیش کی تھی۔ آخر کار اُس نے اُن تینوں کُپّوں

پر نگاہ ڈالی جو سب سے اونچے رکھے گئے تھے۔ اور دریافت کیا کہ وہ کیسی شراب ہے؟ میں نے جواب دیا "خالی کپّے ہیں جناب"۔ لیکن وہ اپنی چھڑی سے کپّوں کو ٹھوکریں لگا کر کہنے لگا "تم تو کہتے تھے کہ کپّے خالی ہیں۔ لیکن یہ آواز سے تو بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں یقیناً ان کپّوں میں تم نے بہتر شراب چھپا رکھی ہے۔ ذرا اس کپّے کی تھوڑی سی شراب تو دکھاؤ"۔

مجھے چار و ناچار تعمیل کرنی پڑی۔ اس نے وہ شراب چکھی۔ اور کہنے لگا "واللہ یہ نہایت ہی عمدہ اور خوشبودار شراب ہے۔ میں یہ تمام کی تمام خرید لوں گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہ شراب دوسرے کپّوں کی شراب کو خوشگوار بنانے کے لئے رکھی گئی ہے۔ اور اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ مجھے امید تھی۔ وہ اس کی زیادہ قیمت ادا نہیں کر سکے گا۔ وہ پوچھنے لگا "اس کی کیا قیمت ہے" میں نے کہا "پہلی سے چار گُنا زیادہ"۔ قاضی چلا کر کہنے لگا "مجھے منظور ہے۔ مجھے منظور ہے۔ ظاہر ہے کہ اچھی چیز قیمت خرچ کئے بغیر نہیں مل سکتی"۔

میں سخت خوف زدہ ہوا۔ اور میں نے قاضی کو صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس شراب کو فروخت نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میں نے اپنی شراب کو عمدہ بنانے کا سامان تباہ کر دیا۔ تو میری تمام شہرت خاک میں مل جائے گی"۔ لیکن میرے تمام عذر بے کار ثابت ہوئے قاضی کہنے لگا "میں نے تم سے قیمت پوچھی تھی اور تم عام شراب سے چار گنا قیمت پر رضامند تھے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے شراب خرید چکا ہوں اور اب اسے واپس نہیں دے سکتا"۔ اُس نے اپنے نوکروں کو بلایا۔ جو شراب کے تینوں کپّے اٹھا کر لے گئے۔

میں نے دوسرے ہی دن سفر کی تیاری شروع کر دی۔ جلد ہی قاضی سے قیمت بھی وصول کر لی گئی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں اب یہ جگہ چھوڑ رہا ہوں کیونکہ مجھے زبردستی اس شراب کی فروخت پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور مجھے اب اپنی تجارت کے فروغ کی بھی کوئی امید نہیں رہی۔ میں نے اُس سے دوبارہ التجا کی کہ اگر تینوں کپّے واپس دے دے۔ تو میں اُس کے عوض اس کو تین دوسرے کپّے مفت دے دوں گا۔ لیکن اُس نے میری ایک نہ سنی۔

میں نے ایک جہاز راں سے چند شرائط طے کر کے اپنی بچی کھچی شراب لدوا دی۔ اور اپنا تمام سرمایہ لے کر اس سے پہلے کہ قاضی پر میرا راز افشا ہونے پائے جزیرہ کارفیو کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن ہمیں رستے میں ایک سخت آندھی اور طوفان سے پالا پڑ گیا۔ دو ہفتے تک ہم آگے بڑھنے کی بے فائدہ کوشش کرتے رہے۔ آخر کار اس طوفان نے ہمارے جہاز کو پھر سمرنا کی طرف دھکیل دیا۔ جب موسم ذرا سکون پذیر ہوا۔ تو میں نے کپتان سے کہا۔ کہ اب ہمیں ساحل سے ذرا دُور لنگر انداز ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ مطلع صاف ہونے پر ہم فوراً اپنا سفر جاری کر سکیں۔ ابھی ہمیں لنگر ڈالے ہوئے پانچ منٹ بھی نہ گذرنے پائے تھے۔ کہ میں نے دیکھا کہ ساحل کی طرف ایک کشتی ہماری طرف آ رہی ہے جس میں قاضی اور عدالت کے دوسرے رکن موجود تھے۔ مجھے اپنی گرفتاری کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ میں اپنے آپ کو کیوں نہ شراب کے ایک کپّے میں بند کر کے چھپ جاؤں میں نے کپتان کو جلدی سے جہاز کے نچلے کمرے میں بلایا۔ اور اسے مختصر طور پر تمام واقعات سے آگاہ کیا۔ اور اس سے وعدہ

کیا۔ کہ اگر وہ اس وقت میری مدد کرے گا تو میں اسے اپنے مال کا بہت سا حصّہ دے دُوں گا۔

کپتان جو میری بدقسمتی سے یونانی تھا۔ اس بات پر رضامند ہوگیا۔ ہم جہاز کے گودام میں پہنچے۔ اور ایک کپُّے سے شراب نکال کر میں اس میں داخل ہوگیا۔ اور کپتان نے اوپر مضبوط ڈھکنا جڑ دیا۔ اس کے بعد فوراً ہی قاضی بھی جہاز پر آپہنچا۔ اور میرے متعلق دریافت کرنے لگا۔ کپتان نے اسے جواب دیا کہ "جناب طوفان کے دوران میں وہ ڈک پر سے سمندر میں گر پڑا تھا۔ اور اِس کے بعد اُس کا کچھ پتا نہیں چلا"۔

قاضی کہنے لگا "افسوس کہ میں اُس بدمعاش سے بدلہ بھی نہیں لے سکا۔ لیکن کیا تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟ ذرا میں جہاز کی تلاشی تو لوں"۔

قاضی اور اُس کے مصاحبوں نے جہاز کا کونا کونا چھان مارا۔ لیکن وہ مجھے کہیں بھی نہ پاکر واپس چلے گئے۔ اب میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کپُّے کی لکڑی میں جو شراب سرایت کرچکی تھی۔ اس کی بدبُو سے میرا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ اب مجھے جلد از جلد وہاں سے رہائی ہو۔ لیکن غدار کپتان کب مجھے چھوڑنے والا تھا۔ وہ تو میرے پاس پھٹکا تک نہیں۔ رات کے قریب اُس نے جہاز کا لنگر اٹھایا اور جہاز روانہ ہوگیا۔ میں نے کپُّے کے پاس دو آدمیوں کو باتیں کرتے سُنا۔ اور میں کپتان کے ارادے سے مطلع ہوگیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مجھے سمندر میں ڈبو کر میری تمام جائداد پر قبضہ کرلے۔ میں کپُّے کے سُوراخ کے قریب (جس میں سے شراب ڈالی جاتی ہے) مُنہ لاکر زور زور سے چلا کر رحم کی التجائیں کرنے لگا۔ لیکن بے سود ثابت ہوا۔ جہاز کے آدمیوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ "تمہارے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیئے۔ جو تم نے دُوسروں سے روا رکھا تھا"۔

اب میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اگر مجھے غرق ہی ہونا ہے۔ تو میرا جلد سے جلد فیصلہ کر دیا جائے۔ تاکہ مجھے اس غم و اندوہ اور مصیبت سے جلد چھٹکارا حاصل ہو۔ مجھے موت کا خیال موت سے زیادہ اذیّت دے رہا تھا۔ لیکن قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ آندھی نہایت زور و شور سے چلنے لگی۔ اور جہاز کے ڈوبنے کا خطرہ ہوگیا۔ کپتان اور دوسرے ملّاح جہاز کی نگرانی میں اس قدر منہمک ہوگئے کہ یا تو وہ مجھے بالکل بھول گئے۔ یا میری موت کسی پُرامن دن پر ملتوی کر دی گئی۔

تیسرے دن میں نے ملاحوں کو کہتے سُنا۔ کہ اگر اُن کے جہاز پر مجھ جیسا بدکردار تھوڑا عرصہ بھی اور رہا۔ تو وہ ضرور غرق ہو جائے گا۔ اُنہوں نے کپُّے کے سُوراخ کا ڈھکنا اتار دیا اور مجھے موجیں مارتے ہوئے سمندر میں دھکیل دیا گیا۔ تاکہ کپُّے میں پانی بھر جائے۔ اور میں ڈوب جاؤں۔ کپُّے کے سوراخ میں میں نے اپنا رُومال ٹھونس دیا۔ اور کپّا پانی میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ جب اُس کا سُوراخ والا حصہ پانی میں جاتا تو میں رُومال کی مدد سے اس میں پانی داخل نہ ہونے دیتا۔ جب سوراخ پانی سے باہر آتا۔ تو میں فوراً سوراخ سے رُومال نکال لیتا تاکہ اس میں تازہ ہوا داخل ہوسکے۔ کپّا گھومتا جارہا تھا اور مارے دھکوں اور ہچکولوں کے میرا بُرا حال تھا۔ میں تھک کر چُور ہوگیا۔ اور میں نے چاہا کہ سوراخ میں سے رُومال نکال لوں تاکہ اس منحوس زندگی کا کہیں خاتمہ ہو۔ دفعتہً سمندر کی موجوں نے مجھے تین ایسے دھکے دیئے۔ کہ میں اب رُومال کی مدد سے پانی نہ روک سکا۔ کپّا لڑھکتا ہوا موجوں پر بلند ہوگیا۔ یکلخت وہ زور سے کسی چیز کے ساتھ ٹکرایا اور میری

ناک کو بُری طرح چوٹ آئی۔

ایک لمحہ کے بعد میں نے کچھ لوگوں کو باتیں کرتے سُنا۔ وہ کُپّے کے پاس جمع ہوگئے اور انہوں نے اس کو کنارے کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ میں کُپّے میں خاموش رہا۔ کہ مبادا وہ میری آواز سُن کر خوف زدہ ہو جائیں! اور مجھے پھر سمندر کی بے پناہ موجوں کے حوالے کر دیں۔ جب وہ ایک جگہ آکر رُک گئے۔ تو میں نے سوراخ کے قریب منہ لاکر نہایت خفیف آواز سے کہا "خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے اور مجھے باہر نکالئے"

پہلے تو وہ لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ لیکن جب میں نے اُن سے کئی دفعہ گڑگڑا کر التجا کی اور انہیں بتایا کہ میں جہاز کا مالک ہُوں اور کپتان اور دوسرے ملاحوں نے مجھ سے غداری کر کے مجھے اس طرح سمندر میں پھینک دیا ہے۔ تو انہوں نے کُپّے کا ڈھکنا اکھاڑا اور مجھے رہائی دلائی۔

رہائی کے بعد سب سے پہلے جس چیز پر میری نگاہ پڑی۔ وہ میرا جہاز تھا۔ جو ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ ہر لہر جو جہاز کو کنارے کی طرف دھکیلتی تھی، ساتھ ساتھ اس کی دھجیاں اڑاتی جاتی تھی۔ جہاز کے بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اور پانی میں ہر طرف جھاگ ہی جھاگ نظر آتا تھا۔ میرے سب کُپّے سمندر میں بکھرے ہوئے تیر رہے تھے۔ کیونکہ جہاز کی ٹکر کے بعد جب وہ کنارے سے آلگے۔ تو ساحل کے لوگوں نے انہیں پھر سمندر میں دھکیل دیا تھا۔

جب مجھے ذرا ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے سپاہی میرے ارد گرد بیٹھے آگ تاپ رہے ہیں۔ اور میری شراب کا ایک کُپّا نہایت سُرعت سے خالی کیا جارہا ہے۔ میرے منہ میں بھی تھوڑی سی شراب ڈالی گئی جس سے مجھ میں اٹھنے کی طاقت آگئی! اب اُن سپاہیوں میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ اُن کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ جو آدمی جہاز کی تباہی سے بچ نکلے تھے۔ انہوں نے مجھے تمہارے بے پناہ گناہوں کی عجیب و غریب داستانیں سُنائی ہیں۔ اب بیٹھ جاؤ اور مجھے سب کچھ سچ سچ بتادو اگر میں نے تمہارے بیان پر یقین کر لیا تو تم سے انصاف کیا جائے گا میں یہاں کا قاضی ہوں۔ اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تم کہاں ہو تو یہ خلیج نیپلز کا جزیرہ اسچیا ہے۔ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ تم کس کی صحبت میں ہو تو ہم وہ لوگ ہیں جنہیں جاہل لوگ بحری ڈاکو کہتے ہیں ہاں اب سچ سچ کہو"

میں نے خیال کیا کہ بحری ڈاکوؤں کو میری کہانی دوسرے لوگوں سے ذرا زیادہ ہی پسند آئے گی۔ اس لئے میں نے اپنی تمام کہانی لفظ بہ لفظ اسی طرح بیان کر دی۔ جس طرح اب تم سے بیان کر رہا ہوں۔

وہ نہایت توجہ سے سنتے رہے جب میں اپنی کہانی ختم کر چکا تو قاضی کہنے لگا جیسا کہ تم نے بتایا ہے تم ایک حبشی کو قتل کر چکے ہو اور ایک یہودی کے قتل ہونے کا سبب ہوئے ہو۔ نیز تم نے ایک آغا کو شراب میں ڈبو کر ہلاک کیا ہے! اس لئے تمہاری سزا یقیناً موت ہے لیکن میں تمہاری قابل قدر شراب کا لحاظ کرتے ہوئے اور ایک پر اسرار راز کے افشا کرنے کی بنا پر موت کا حکم منسوخ کرتا ہوں کپتان اور دوسرے سرداروں نے طوفانی سمندر میں غداری کی ہے جو ایک ناقابل معافی گناہ ہے اس لئے ان کی سزا بھی فوری موت ہے لیکن چونکہ اُن ہی کی وجہ سے ہمیں ایسی عمدہ شراب حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے میں ذرا اور نرم ہوتا ہُوں اور اب ایک ایسا حکم صادر

کرتا ہوں جس کی وجہ سے تم سب اپنی تمام عمر محنتِ شاقہ میں بسر کرو گے۔ تم سب قاہرہ میں بطور غلاموں کے بیچ دیئے جاؤ گے۔ نقدی تو ہم اپنی جیبوں میں ڈال لیں گے۔ اور تمہاری شراب پی جائیں گے۔

بحری ڈاکوؤں نے قاضی کے انصاف کی داد تالیوں سے دی۔ اور ہماری کوئی فریاد نہ سنی گئی۔ جب مطلع صاف ہوا تو ہم ایک چھوٹے سے جہاز میں بٹھا کر قاہرہ کی طرف روانہ کر دئے گئے۔ جب ہم بندرگاہ میں پہنچے، تو ہم فروخت کے لئے پیش کئے گئے اور زر خرید غلام بنا لئے گئے۔

مہدی علی خاں

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

حسنِ اتفاق سے غالب مغفور کا ایک غیر مطبوعہ خط مل گیا جس میں حروفِ تہجی کی تذکیر و تانیث پر بحث کی ہے۔ ناظرینِ ہمایوں کی ضیافتِ طبع کے واسطے نقلِ خط حاضر ہے۔

سعادت و اقبال نشان مرزا یوسف علیخان کو بعد دُعا کے دل نشین ہو کہ تذکیر و تانیث ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں۔ لے لو لفظ اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے۔ اہلِ پورب اس کو مونث بولتے ہیں۔ بہر حال جو میری زبان پر ہے وہ میں لکھ دیتا ہوں۔ اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے۔ ایک گروہ نے کچھ مان لیا ایک جماعت نے کچھ جان لیا۔ اس کا قاعدہ منضبط نہیں۔ الف مذکر۔ ب ت ث مونث۔ ج ح خ مونث۔ د ذ ر ز مونث۔ س ش مذکر۔ ص ض ط ظ مونث۔ ع غ مذکر۔ ف مونث۔ ق ک مذکر۔ لام میم نون مذکر۔ واو ہی ی مونث۔ لام الف حروفِ مفردہ میں نہیں مگر بولنے میں مذکر بولا جائے گا۔ مثلاً لام الف کیا خوب لکھا ہے کہیں گے کیا خوب لکھی ہے نہ کہیں گے۔ خُزادہ خداوندزادہ کا مخفف ہے لیکن فارسی نہیں عربی نہیں۔ اردو کا روزمرہ تھا خزادہ اور خزادی مرادف صاحبزادہ اور صاحبزادی ہے۔ مگر فی زماننا متروک ہے۔ فق فارسی لغت نہیں ہو سکتا عربی بھی نہیں۔ روزمرہ اردو ہے جیسا کہ میر حسن لکھتا ہے ؎ کہ رستم جسے دیکھ رہ جائے فق۔ شعرائے حال کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ تکیہ لفظ عربی الاصل ہے۔ فارسی و اردو میں مستعمل۔ دونوں زبانوں میں ہم بمعنی بالش اور بمعنی مکانِ فقیر آتا ہے ایران میں تکیہ مرزا صائب مشہور ہے۔ گل تکیہ لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے۔ گل مخفف گال کا اور تکیہ بمعنی بالش وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں گل تکیہ کہلاتا ہے۔ گل بمعنی پھانسی انگریزی لغت ہے (غالباً مرزا صاحب کی .... سے مراد ہوگی ——— فرخ) انگریزی زبان میں بنگالہ میں سو برس سے اور دلی اکبرآباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے۔ گل تکیہ وضع کیا ہوا نورجہان بیگم کا ہے جہانگیر کے عہد میں اہلِ ہند کیا جانتے تھے۔ کہ گل کیا چیز ہے۔ بمعنی مفرد بہ تلفظ جمع اس جملہ کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا بمعنی مفرد معانی جمع اور یہ جو اردو کے محاورے میں تقریر کرتے ہیں کہ اس شعر کے معنے کیا ہیں یا اس شعر کے معنے کیا خوب ہیں۔ اس میں دخل نہیں کیا جا سکتا خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے۔ معانی کی جگہ معنے بولتے ہیں۔ رت لفظ ہندی الاصل رتھ ہے بہائے مضمرہ۔ بعض مذکر بولتے ہیں بعض مونث۔ ۱۰ شعر بہت اچھا ہے صاف و ہموار!

راقم غالب

نوٹ:۔ خط میں تاریخ مرقوم نہیں۔

سید فرخ حیدر

کلامِ تاجور

مری زندگی جو کشاکشِ غمِ زندگی میں بسر ہوئی
تو کہا یہ عشق نے آ ادھر تری زندگی کو سنوار دوں

یہ ہے احترامِ جنونِ عشق، یہ فرضِ مذہبِ عشق ہے
کہ بہارِ عمر کو سوگوارِ بہار بن کے گزار دوں

تجھے کیا سناؤں یہ حادثہ کہ چمن میں جوشِ بہار ہے
تجھے ہمصفیر! قفس کی قید میں کیا نویدِ بہار دوں؟

تاجور

نواہائے راز

خورشید اُس کے نُور سے شرمندہ ہوگیا
ذرّہ فروغِ حُسن سے رخشندہ ہوگیا

کیوں منفعل ہو پیرویٔ خضر سے کوئی
میں تجھ پہ مر کے زندہ و پائندہ ہوگیا

جو حرف آگیا مرے دیواں میں ایک بار
آئینۂ گذشتہ و آئندہ ہوگیا

اُس شمعِ رُو کی یاد کا اعجاز دیکھنا
ہر ذرّہ میری خاک کا تابندہ ہوگیا

افسونِ شعر بھی دمِ عیسیٰ سے کم نہیں
جس کا بھی ہم نے نام لیا زندہ ہوگیا

حامد علی خاں

فطرتِ شاعر

کبھی روئے یزداں کے ہم رنگ ہیں ہم
کبھی اہرمن سے ہم آہنگ ہیں ہم

کبھی ہم سراپا اسیرِ خودی ہیں
کبھی خود سے آمادۂ جنگ ہیں ہم

کبھی پیش رو ہیں نبردِ بقا میں
کبھی اپنی ہستی سے خود تنگ ہیں ہم

کبھی "فخرِ عالم" لقب ہے ہمارا
کبھی دہر میں باعثِ ننگ ہیں ہم

تغیر پرستی ہے فطرت ہماری
برنگِ تماشائے نیرنگ ہیں ہم

جاذب

محفلِ ادب

مرزا غالبؔ کی ظرافت نگاری

جب ہم مرزا غالبؔ کی ظرافت کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ کسی جگہ پھبتی کہتے ہیں نہ ظرافت کے لئے انوکھی تشبیہیں تلاش کرتے ہیں نہ لطائف پر اپنا دار و مدار رکھتے ہیں۔ نہ غیر معمولی باتیں بیان کرتے ہیں خوشی کی جگہ خوشی کے اور غم کی جگہ غم کے الفاظ لائے ہیں۔ واقعات کا بے کم و کاست اظہار کرتے ہیں مگر ان کی فطری اور طبعی ظرافت اور زندہ دلی اسی سادگی میں بلا کی شوخی پیدا کر دیتی ہے وہ روا روی میں ایک بات کہتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ مگر سننے والا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے۔

کس قدر حیرت خیز۔ اور کتنا تعجب انگیز ہے۔ یہ امر کہ وہ کسی سے ناراض ہوتے ہیں! اور اتنا ناراض ہوتے ہیں۔ کہ خود اُن کے بڑھاپے کے ہاتھ پاؤں کانپتے نظر آتے ہیں۔ چہرہ پر غیظ و غضب کے آثار ہیں۔ ماتھے پر شکنیں ہوتی ہیں۔ غصہ سے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ زیر لب کچھ کہتے جاتے ہیں۔ مگر سننے والا سمجھتا ہے۔ کہ پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اور دل میں انبساط پیدا ہو رہا ہے۔ اور ظرافت اگر صرف ظرافت ہو تو خیر کوئی بڑی بات نہیں۔ مگر ان کے یہاں تو اُسی میں اخلاق ہے۔ اُسی میں رنج و ملال کا اظہار ہے۔ اُسی میں ان کی عاداتِ فطری کے آثار ہیں۔ اسی میں جذباتِ مسرت ہیں اسی میں درد کا بیان ہے۔ اسی میں تاریخی واقعات ہیں اسی میں شہر دہلی کے حالات ہیں اسی میں تعلیم ہے۔ اسی میں تلقین ہے۔ اُسی میں شفقتِ بزرگانہ کا لحاظ ہے۔ اُسی میں مراسمِ دوستانہ کا ظہور ہے۔ وہیں فخر و مباہات کے دریا بہہ رہے ہیں اور وہیں سرِ عجز و نیاز جھک رہا ہے۔ غرض کہ ان کے چند فقرے نہ صرف تفنن کا کام دیتے ہیں بلکہ ایک وسیع فضا پیش کر دیتے جہاں لطف و تفریح کے ساتھ عبرت و بصیرت بھی سامنے آجاتی ہے اور لوگ بھی جیسا کہ بیان ہو چکا۔ اِس رنگ کے لکھنے والے ہیں مگر وہ ظرافتِ حقیقی جس سے روح کو لطف حاصل ہو وُہ صرف مرزا کا حصہ ہے۔ عالمگیر کی تحریر میں بھی ایجاز و اختصار کے ساتھ ظرافت کا عنصر غالب ہے۔ مگر ان کی ظرافت میں ایک جاہ و جلال اور ایک نوع کا غصہ بھی شامل ہے۔ مثلاً وہ محمد معظم شاہ کو لکھتے ہیں۔

"اعلیحضرت فردوس منزلت بہ گرفتن ولایت بلخ و بدخشان و خراسان و ہرات ملک قدیم موروثی توجہ مفرط داشتند و مکرر افواج بادشاہی بسرکردگی مراد بخش بآن سو فرستادہ شد چنانچہ اکثر آن ولایت فتح ہم شد لیکن بہ سبب کم حوصلگی آن نامراد کہ بے طلب حضور برخاستہ آمد و صلاً اہالی و اکابر آن دیار بہ داخت ملک مقبوضہ از دست رفت و محنت و زر ضائع گشت ازینجاست کہ گفتہ اند از پسر ناخلف دختر بہتر۔ نظر بایں توجیہ کہ ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ این فانی را آرزو باقی است و تدبیرش جز اینکہ نبیرہ آنحضرت را با فوجی شایستہ و ساماں بایستہ بآں سمت

بغرستیم دیگراز ماچہ ماید۔ باوجود تاکیدات حضور شاقہ معاررا نہ گرفتہ آئید۔ یاآں ہم چہ رسد۔ ظاہراکار ماازشمانیست ۔ عارف بخود پُرعارف است۔ ایں نمودبے بودخود آفتاب سرگوست بدست آمدچہ دیناء مدچہ شما فکر خود کنید۔ کہ درینجا ہم چشماں چہ رو خواہد نمود۔ و درانجا بحضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ و حضرت اعلیٰ "

ضائع گشت تک مندرجہ بالا عبارت میں بہت خشکی ہے۔ ازینجاست سے عبارت میں رنگینی شروع ہوتی ہے بنظر ایں توجیہ سے عبارت میں ایک تفنن کے ساتھ ظرافت کا بہت ہلکا رنگ شروع ہوجاتا ہے۔ آگے چل کر حسن تنبیہ ظریفانہ انداز میں ہے۔ مگر ہر فقرہ سے غصہ طنز طعن بھی ظاہر ہوتا ہے۔ بیرۂ آنحضرت۔ ودیگراز ماچہ می آید۔ تاباں ہم چہ رسد۔ ظاہراکار ما ازشما نیست ۔ عارف بہ خود پُرعارف است یشما فکر خود الخ یہ سب فقرے تفنن عبارت کے ساتھ بہت ہلکی ظرافت اپنے ذیل میں لئے ہوئے ہیں مگر کمی اتنی ہے۔ کہ رنگ طنز غالب ہے اور ظرافت معلوم حکیم سوزنی۔ الوری جعفر زٹلی وغیرہ پھکڑ تک پہنچ کر رہ گئے۔ اس کے سوا اور کہیں ان کے یہاں نہیں ملتا ! البتہ سعدی کے ظریفانہ رنگ میں ہر جگہ ظرافت محض کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اور بہار کا کام دیتا ہے ۔

اردو میں بھی بہت سے ظریف ہیں۔ مولانا اکبرالہ آبادی مرحوم کو ایک خاص ملکہ ہے مگر دو باتیں ہیں ایک تو صرف نظم پر ان کی ظرافت ختم ہوجاتی ہے۔ دوسرے ان کے کلام میں کوئی خاص ظرافت نہیں۔ بلکہ اس کا انحصار محض ایک خاص فرقہ کا خاکہ اڑانے اور ایک خاص جماعت کی ہجو ملیح کرنے پر ہے جس سے ایک تصویر دیکھنے والے کی نظر میں پھر جاتی ہے۔ اور اسی پر تمام لطف کا انحصار ہوتا ہے ۔

برعکس اس کے مرزا نظم اور نثر دونوں میں ظرافت کے بادشاہ ہیں۔ ان کا کوئی خط ایسا نہ ملے گا جس میں ظرافت نہ ہو۔ مگر نہ اورنگ زیب کی طرح یبوست کو مزاجی رنگ پر غلبہ دیتے ہیں اور نہ نعمت خاں عالی کی طرح الفاظ کے گورکھ دھندے کو ہر جگہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ نہ الوری و سوزنی جعفر زٹلی کی طرح فواحش پر اتر آتے ہیں۔ نہ اکبر کی طرح کسی خاص طبقہ اور فرقہ کی طرف سے اظہار تنفر کرتے ہیں۔ اور ان سب عیوب ظرافت سے بچے رہنے کی خاص وجہیں ہیں یبوست سے بچنے کا سبب یہ ہے کہ وہ دراصل فطری ظریف ہیں۔ شاد وخرّم ہشّاش بشّاش دل اپنے پہلو میں رکھتے ہیں تصنع اور آورد کا ان کے یہاں نام بھی نہیں۔ جو لب پر ہے۔ وہ دل میں بھی ہے۔ جو دل میں ہے وہ لب پر بھی ہے۔ برعکس اس کے عالمگیر کے مزاج میں خشکی بھی ہے ظرافت بھی ہے۔ شاہی تمکنت بھی ہے۔ ہر جگہ شان شوکت کو بھی کام میں لایا جاتا ہے تقوی و طہارت بھی دامنگیر رہتی ہے۔ خلقی زندہ دلی بھی ان سب میں تھوڑی بہت شامل ہوجاتی ہے

نعمت خان عالی کی طرح الفاظ کے پھیر میں وہ پڑنا نہیں چاہتے۔ مراعات النظیر یا رعایت الفاظ سے انہیں بیر ہے جو کچھ کہتے ہیں بہت صاف کہتے ہیں مراسلت یا مکاتبت کو جب تک کہ مکالمہ نہیں بنا دیتے انہیں چین ہی نہیں آتا چنانچہ متفخرانہ انداز سے جا بجا اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

الوری۔ سوزنی کی طرح پھکڑ نہیں بکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کی سوسائٹی بہت بلند ہے سوائے ایک دو جگہوں کے ان کے یہاں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے۔ جو کسی کے مرتبہ سے کم ہو۔ عالی مرتبہ لوگوں کی صحبت رہی۔ عالی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ذوق سلیم۔ اور صحیح مذاق لائے پھر ان کو ان باتوں سے نسبت ہی کیا ہوسکتی ہے ۔

اُن کے رقعات کو دیکھئے اور اُن کے مکتوب الیہم کو جانچیئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ کہ وہ کس قدر مزاج داں اور نبض شناس فطرت واقع ہوئے ہیں غیظ و غضب کی حالت ہو کیف و سرور ہو، مزاج کا غلبہ ہو، رنج و غم ہو، خوشی ہو معیبت ہو غرض کچھ ہو یہ ممکن نہیں کہ ان کے قلم سے کوئی لفظ مکتوب الیہ کی شان کے خلاف نکل جائے۔ اور وہ ایک انچ دائرہ مزاج شناسی سے ہٹ جائیں صرف یہی نہیں کہ مدارج کو ملحوظ رکھیں صرف یہی نہیں کہ کوئی لفظ زائد یا خلاف محل استعمال نہ ہو۔ یہ بھی ہے کہ مکتوب الیہم کی شان مزاج اور افتاد طبیعت پر بھی ہر فقرہ روشنی ڈالتا ہے۔ اور اپنا رنگ طبیعت بھی ظاہر کرتا ہے۔

"نگار"

اُردو فارسی کی مُشترک ترکیبیں

ایسی ترکیبیں بہت ہیں جو فارسی اور اردو میں مشترک ہیں۔ ان کو لوگ جب فارسی کی مخصوص ترکیب سمجھ بیٹھتے ہیں تو غلط مبحث ہو جاتا ہے اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح سمجھنے لگتے ہیں اس لئے چند مشترک ترکیبیں، جو زیادہ اہم ہیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

(الف) ایک ترکیب فارسی کی یہ ہے۔ کہ دو لفظ لے کر ملا دیئے اور مرکب بن گیا مگر بھولنا نہ چاہئیے کہ یہ ترکیب کچھ فارسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اردو میں بھی یہی ترکیب موجود ہے۔ فارسی میں اگر جہاں دار، گیتی خداوند، شترسوار، شیردل، راحت منزل، تاج محل، خانہ باغ، کارخانہ، یتیم خانہ وغیرہ ہیں تو اردو میں راج کمار، جگت گرد، بالک ہٹ، تریا ہٹ، مچھی بھون، سکھ بھون، موتی جھیل، رام پھل، سیتا پھل، اندر سبھا، کسان سبھا، اٹاگھر، چڑیا گھر، روشن کھڑکی، بیل گاڑی، گھوڑا گاڑی، پیر گاڑی، چور گلی وغیرہ۔ اسی اردو ترکیب کی رُو سے یہ لفظ بنے جو بالکل صحیح ہیں:-

توتا چشم، ٹکڑ گدا، جگت استاد، جگت آشنا، پیر بھائی۔ استاد بھائی، چڑیا خانہ، عجائب گھر، کٹھ حجت، کٹھ ملّا، امن سبھا، ڈاک خانہ، بھنگڑ خانہ، چانڈو خانہ۔ چھتر منزل، کیسر باغ، ہوا گاڑی۔ کھڑ پیچ، ہاتھ چالاک، چور دروازہ، چور محل، گل تکیہ (یعنی وہ تکیہ جو گال کے نیچے لگایا جاتا ہے۔ سانڈنی سوار وغیرہ۔

"ہندوستانی"

رُوسی ادب

ماں

اس کا دل غم سے بھرا ہوا تھا۔

اور جس وقت اس کے تین شوخ اور کھلنڈرے بچے۔

اس کے گرد کھیل رہے تھے۔ اور شور مچا رہے تھے۔

وہ کسی خیال میں محو تھی اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

بدنصیب بچو تم آخر کیوں پیدا ہوئے

تم بیدمعرک تباہی کے بیدھے راستے پر چلو گے

تقدیر کے لکھے سے بچنے کی کوئی صورت نہیں

اے جانباز اور جفاکش ماں ان کی قسمت پر متردد

انہیں تم درد جوانی ہی سے یہ سمجھا دے۔

ایک ایسا زمانہ بھی ہوتا ہے۔ پوری صدیوں کی صدیاں

جب کانٹوں۔ کے تاج سے زیادہ زیبا اور پسندیدہ

کوئی عزت نہیں ہوتی۔

"اردو"

تبصرہ و آرا

مرزاجی اور دیگر مضامین۔ مصنفہ ایم اسلم صاحب حجم ۳۰۰ سے زائد صفحات۔ کاغذ کتابت اور طباعت حد درجہ نفیس اور دلکش ہے۔ سرورق نہایت خوبصورت رنگین اور تصویر دار ہے۔ اس قدر حسنِ اہتمام سے چھپی ہوئی کتابیں ہماری زبان میں کم ہیں قیمت ۱۲ر نسیم بک ڈپو لاہور سے طلب کیجئے۔

ایم اسلم صاحب ایک خوش بیان ادیب ہیں اس کتاب میں ان کے ۲۳ مختلف مضامین جمع ہیں۔ جو مزاحیہ انداز میں لکھے گئے ہیں اور افسانوں کا لطف دیتے ہیں۔ فراغت کی گھڑیاں گزارنے کے لئے یہ کتاب تفریح کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور دو روپے چار آنے میں یہ نفیس کتاب جو ہر اردو لائبریری کے لئے باعثِ زینت ہو سکتی ہے۔ بہت ارزاں ہے۔ ہم ناظرین ہمایوں سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں

اسلم صاحب کی زبان سلیس اور دلکش ہے۔ اور اگرچہ محاورہ کے اسقام سے کلیتہً پاک نہیں مگر اس سے کتاب کے محاسن میں کمی نہیں آتی سلاستِ زبان محاکات اور لطفِ گفتگو ملاحظہ فرمائیے مس ماڈ ایلین کی آمد کا ذکر ہے مرزا جی میر کلن سے مخاطب ہوتے ہیں۔

"میر صاحب کچھ سنا آپ نے؟" "اجی نہیں" مرزا صاحب نے جھنجھلا کر کہا "گانا دانا
"بیسیوں باتیں ہر روز سنتے ہیں جانے آپ کیا پوچھتے ہیں" نہیں جانتی"
"ولایت والی مس ماڈ الِن آئی ہیں" "تو پھر؟"
"ہاں فرنگن ہے فاحشہ" میر کلن منہ میں گلوری رکھے "ناچتی ہے اور وہ بھی بالکل برہنہ ہو کر"۔
بکری کی طرح جگالی کرتے بولے "شہر میں چرچا تو بہت سنتے ہیں ہم بھی" میر کلن دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے۔ مرزا جی کی طرف
"اجی نہیں میر صاحب" مرزا نے سر ہلا کر کہا "فاحشہ نہیں گردن بڑھا کر کہا۔
رقاصہ ہے" "کھائیے تو ہمارے سر کی قسم"۔
"سمجھے" میر کلن بٹیر کے پروں کو سنوارتے ہوئے بولے "تو "ہاں آپ کے سر کی قسم" "اور پھر" چلئے گا؟"
درگاہ پر قوالی کرتے آئی ہوگی۔ یہ لوگ بھی پیر یادری کو بہت مانتے ہیں "اجی آنکھوں کے بل"۔
خواجہ صاحب نے بلوایا ہوگا"

کارزار (ہفتہ وار) حضرت ابو الاثر حفیظ جالندھری کی ادارت میں یہ پرچہ ماڈل ٹاؤن لاہور سے جاری ہوا ہے۔ اب تک ہماری نظر سے اس کے کئی نمبر گزر چکے ہیں اخبار دلچسپ معلوم ہوتا ہے اور قابلیت سے ترتیب دیا جاتا ہے البتہ بعض مخالفانہ مضامین میں نوک جھونک کی تیزی اور تلخی ذرا محسوس ہوتی ہے۔ رسالے کے مقاصد حسب ذیل بیان کئے گئے ہیں۔

مرزا غالب کے سوانح اور اُن کا کلام

اس موضوع پر مسٹر محمد اکرم آئی سی ایس (پروبیشنر) جو اس وقت آکسفورڈ میں مقیم ہیں۔ ایک مبسوط مقالہ لکھ رہے ہیں۔ وہ بذریعہ ہمایوں ناظرینِ ہمایوں سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ اگر کوئی صاحب غالب کی کوئی نایاب یا غیر مطبوعہ نظم یا خط وغیرہ عاریتہً عنایت کر سکتے ہوں یا ایسے حوالہ جات دے سکتے ہوں جن سے غالب کی زندگی یا کلام کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہو۔ تو وہ مقالہ نگار کو ممنون کرنے اور ایک خالص علمی خدمت بجا لانے سے دریغ نہ فرمائیں غالب کے مآخذِ معلومہ کے علاوہ کسی نئے یا نسبتہً غیر معروف مآخذ کا اضافہ غرض ایسی چیز جو مقالہ نگار کے لئے سوانح و کلامِ غالب کی تنقید و تحقیق کے کام میں باعثِ اعانت ہو شکریئے کے ساتھ قبول کی جائے گی۔ جو صاحب اس کارِ خیر میں حصّہ لینا چاہیں۔ وہ جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں یا خود مقالہ نگار صاحب سے جن کا پتہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ براہِ راست خط و کتابت فرمائیں۔

مسٹر محمد اکرام آئی۔ سی۔ ایس (پروبیشنر)

جیزس کالج۔ آکسفورڈ (انگلستان)

سالگرہ نمبر کے متعلق آرا

ہمیں "ہمایوں" کے دسویں سالگرہ نمبر کے متعلق بہت سی قابلِ قدر آرا موصول ہوئی ہیں جن کے ملخص ہم شکریہ کے ساتھ وقتاً فوقتاً "ہمایوں" میں شائع کرتے رہیں گے۔

آنریبل جسٹس سر شادی لال بالقابہ چیف جسٹس ہائیکورٹ پنجاب

میں نے ہمایوں کے مطالعہ پر کچھ وقت صرف کیا اور رسالہ کو دلچسپ پایا۔

شادی لال لاہور ۳ جنوری ۱۹۳۲ء

سر محمد یعقوب (مجلسِ وضعِ قانونِ ہند)

میں نے ہمایوں کا سالگرہ نمبر بالاستیعاب پڑھا اس رسالے کے مدیر و منتظمین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کہ ان کی کوشش سے یہ پرچہ اپنی دہ سالہ عمر کے زمانے میں نہ صرف اوقاتِ مقررہ پر شائع ہوتا رہا بلکہ ابتدا سے وہ افسوسناک رقابتوں اور بے محل نکتہ چینیوں سے محترز رہا میرے خیال میں اس کی کامیابی کا راز اسی طرزِ عمل میں پنہاں ہے۔ بہ اعتبار ظاہری شان کے ہندوستان میں مشکل سے کوئی رسالہ ہمایوں سے بہتر ملے گا اس کے اکثر مضامین دلچسپ اور پُر از معلومات ہوتے ہیں بحیثیتِ مجموعی "ہمایوں" ہندوستان کے بہترین رسالوں میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے۔

محمد یعقوب مقام نئی دہلی ۴ فروری ۱۹۳۲ء

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا

سالگرہ نمبر حسنِ اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اور مضامینِ نظم و نثر دلکش ہیں۔

محمد اقبال لاہور ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء

پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم اے۔ آئی۔ ای ایس

ہمایوں کا سالگرہ نمبر موصول ہوا سالِ نو کے اس بہترین تحفہ کے لئے دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ مجھے اکثر اردو رسالوں کے خاص نمبر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اس لئے مقابلہ کرنے کا امکان موجود ہے۔ ہمایوں کی غالباً یہ پہلی کوشش ہے لیکن ایک ہی سعی میں اپنے معاصرین پر سبقت لے گیا یہ صحیح ہے کہ بعض رسائل تصاویر کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور بعض دفعہ ایک رسالے میں بیسیوں تصاویر بھر دیتے ہیں لیکن راقم الحروف اب عمر کی اس منزل کو پہنچ گیا ہے۔ کہ ایسی تصویریں جن میں کوئی خاص خوبی نہ ہو بجائے دل خوش کن معلوم ہونے کے ناگوار گزرتی ہیں ہمایوں کے پیشِ نظر نمبر میں بھی تصویریں ہیں لیکن اعتدال اور حسنِ مذاق کے ساتھ بہر رنگ بھی سادگی اور لطف ہی کا مجموعہ ہے مضامین کی تعریف تحصیلِ حاصل ہے یہ کہنا کافی ہے۔ کہ اس ایک پرچے میں ادب کی تقریباً ہر صنف کے قابلِ قدر نمونے موجود ہیں جن کی خوبی کے خود مضمون نگاروں کے اسمائے گرامی ضامن ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اربابِ ذوق آپ کے انتخاب کی داد دیں گے۔

محمد سعید۔ دہلی ۲۷ جنوری ۱۹۳۲ء

سردار حبیب اللہ خان بیرسٹرایٹ لا

اس رسالے کو آپ نے متواتر خرچ اور محنت کے بعد ایک بلند پایہ پر پہنچا دیا ہے۔ مجھے جس قدر اور ہندوستانی رسالہ جات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان میں سے یہ ہر طرح افضل و بہترین ہے بلکہ یورپ کے اعلیٰ درجے کے ادبی و علمی رسالوں سے کسی طرح بھی کم نہیں اعلیٰ درجے کے مذاق کے لوگوں کے لئے یہ رسالہ نہایت ہی دلچسپ و مفید ثابت ہو رہا ہے۔

حبیب اللہ لاہور ۵ جنوری ۱۹۳۲ء

ڈاکٹر ضیاالدین احمد رکن مجلس وضع قانون ہند

"ہمایوں" ایک اعلیٰ درجہ کا ادبی رسالہ ہے۔ اس نے اپنے بلند معیار کو مستقل طور پر نہایت ہمواری کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ میں اس کے مضامین نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔
ضیاءالدین احمد۔ ونڈسر پلیس نئی دہلی ۱۸ فروری ۱۹۳۲ء

مسٹر محمد وسیم۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ لکھنؤ

ہمایوں کا سالگرہ نمبر نہایت دلکش ہے۔ میں نے نصف کے قریب پڑھا تھا کہ میری بہن پڑھنے کے لئے مجھ سے چھین کر لے گئیں۔ اور اب وہ پڑھ رہی ہیں میرے خیال میں یقیناً یہ ہندوستان میں اپنی قسم کا بہترین رسالہ ہے۔ اور لنڈن سے شائع ہونے والے بہترین رسالوں کا ہم پایہ ہے۔
محمد وسیم ۵ فروری ۱۹۳۲ء

مولوی محمد حسین صاحب ادیب ایم اے۔ بی ای ڈی

سالگرہ نمبر کا تحفہ وصول ہوا۔ ایک علمی مذاق والے شخص کے لئے اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔ بصد اشتیاق اسے لیا اور اس کے مطالعہ سے روح کو مسرور اور قلب کو مطمئن کر رہا ہوں۔
کھمم مٹیہ۔ دکن ۹ جنوری ۱۹۳۲ء

اخبارات و رسائل کے ریویو

رسالۂ ندیم (گیا) فروری ۱۹۳۲ء

رسالہ ہمایوں لاہور نے اپنی دہ سالہ زندگی میں جو اردو کی خدمت کی ہے اور صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اس سے اردو داں طبقہ ناواقف نہیں جنوری ۱۹۳۲ء کے ہمایوں کا سالگرہ نمبر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اس رسالہ کا مطمح نظر بجائے تجارتی مفاد کے اردو کی صحیح خدمت ہے۔ ۲۱۶ صفحات کا یہ ضخیم سالگرہ نمبر زیادہ تر ملک کے مشاہیر ادب کے مضامین سے مزین ہے اجتماعی زندگی پر ایک نظر (ایڈیٹر ہمایوں) آزاد نگارستان اور دادا جان (مرزا فرحت اللہ بیگ) ڈیمانسٹریشن (پریم چند) جنگ و جدال (سید سجاد حیدر صاحب یلدرم) دامن ہمایوں میں ادب کے گوہر بے بہا ہیں ہر اہل ذوق کو اپنا ادبی ذوق پورا کرنے کے لئے اس سالگرہ نمبر کا مطالعہ ضروری ہے۔

اخبار مدینہ (بجنور) ۲۱ جنوری ۱۹۳۲ء

لاہور کے علمی اور ادبی رسالہ ہمایوں نے اپنا سالگرہ نمبر اہتمام خاص کے ساتھ شائع کیا ہے۔ لاہور سے جس قدر ادبی رسالے شائع ہوتے ہیں ان میں ہمایوں ہمارے نزدیک سب سے بہتر ہے اشاعت میں باقاعدہ اور انتخاب مضامین کے اعتبار سے سلیم الذوق اور یہ اسلئے کہ اسکا مقصد اشاعت تجارت اور زر اندوزی نہیں جو بالعموم عامیانہ مذاق کی پیروی پر مجبور کر دیتی ہے اور اسکا ادارۂ ترتیب تعلیمیافتہ اور صحیح المذاق افراد پر مشتمل ہے یہ سالنامہ بھی اس اعتبار سے بہت خوب ہے دو سو سے زائد صفحات میں سرورق نہایت دیدہ زیب اور سلامت ذوق کا آئینہ دار تصاویر شامل کرنے میں محض تعداد کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ ہر تصویر آرٹ کی خوبیوں کے باعث مرصع رسالہ ہوئی ہے انہیں التجا بے محبت معمولی میڈیا غنیمت اور حسرت ان غنچوں پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے بے پناہ ہے راقم الحروف شاید صرف اس تصویر کیلئے رسالہ کو خرید لیتا حسان الہند کا ... بھی اچھی ہے ٹیلپن کا خواب بہت خوب ہے مضامین بالعموم اچھے مفید اور دلچسپ ہیں۔ ان میں اجتماعی زندگی پر ایک نظر، ڈیمانسٹریشن، جنگ و جدال، تاریخ عالم پر ایک نظر وغیرہ زیادہ بہتر ہیں۔

فہرستِ مضامین "ہمایوں"

جلد: ۲۱ — نمبر: ۴

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۲ء

تصاویر: شکر رنجی، جنگل کا بادشاہ

شکر رنجی:۔ یہ دلکش تصویر فرانس کے مقبولِ عام مصور بوگرو کی بہترین تصاویر میں سے ہے۔ اس مصور کی تصاویر کثرت سے مختلف النوع ہیں اس لحاظ سے اُس کا تخیل حیرت انگیز طور پر جامع اور محیط الکل سمجھا جا سکتا ہے موجودہ تصویر اس کے فن کا بہترین نمونہ ہے۔ صاف معلوم ہو رہا ہے۔ کہ رنجیدہ لڑکی کے ملال کا دورہ ختم ہونے کو ہے۔ اور ابھی صفائی ہو جائے گی انسان کی خوش قسمتی ہے کہ رنج و ملال کے جذبات زیادہ دیرپا نہیں ہوتے۔

جنگل کا بادشاہ:۔ "جنگل کے بادشاہ" کے سر کی یہ لاجواب تصویر جو شیر کے چہرے کے بہترین مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ روزا بونر کے مرقع سے لی گئی ہے اور میاں بشیر احمد صاحب کے "جنگلی مضمون" کے ساتھ ناظرین کی دلچسپی کے لئے دوبارہ شائع کی جاتی ہے۔

ہمایوں کے سالگرہ نمبر کے متعلق آرا

آنریبل جسٹس سر شاہ محمد صاحب سلیمان ایم اے کینٹب بیرسٹر ایٹ لا چیف جسٹس الہ آباد ہائیکورٹ

"ہمایوں" کا سالانہ نمبر جو آپ نے مجھے ازراہِ نوازش بھیجا ہے موصول ہوا۔ اس کے مضامین کا معیار اعلیٰ درجے کا ہے۔ اور ظاہری محاسن کے اعتبار سے بھی یہ بہت بلند پایہ رسالہ ہے دعا ہے کہ ہمایوں ہر طرح کامیاب ہو۔

آپ کا مخلص ایس۔ ایم سلیمان ۱۳ جنوری ۱۹۳۲ء

آنریبل میاں سر فضل حسین صاحب بالقابہ رکن مجلس حکومت ہند

مجھے "ہمایوں" کا سالگرہ نمبر کیپ ٹاؤن میں ملا۔ میں نے اسے پڑھا اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز میں مسٹر نائیڈو، مسٹر بیجپائے اور بعض دوسرے دوستوں کو دکھایا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ ہندوستانی رسائل کی دنیا میں "ہمایوں" خوبی کے اس قدر بلند پایہ معیار پر پہنچ چکا ہے میں آپ کو اس محنت اور استقلال پر مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک ایسے بزرگ کی یہ نفیس یادگار قائم رکھی جس کو اگر موت مہلت دیتی تو وہ موجودہ ہندوستان کے کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ موثر اور کامیاب طریقہ پر ملک و ملت کی خدمات انجام دے سکتا۔

آپ کا مخلص فضل حسین نئی دہلی ۱۴ مارچ ۱۹۳۲ء

پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم ایڈووکیٹ ہائیکورٹ پنجاب

"ہمایوں" کا سالانہ نمبر اس سال نہایت دلچسپ ہے۔ مجھے اپنے رفیق مرحوم مسٹر شاہ دین صاحب کی دستخطی تحریر کشمیر جہلم دریا اور بعض اشعار پڑھ کر بہت مسرت ہوئی اور وہ زمانہ یاد آیا جب کہ ہمایوں میرے دوست شاعر اور ادیب تھے۔ دنیوی منزلتیں ان کو بہت سی حاصل ہوئیں۔ اور ہم دونوں ادبی مشاغل میں مگن رہتے تھے۔ اس سال کے سالنامہ نمبر کو میں مجلد کرا کے اپنے اردو کتب خانہ میں رکھوں گا بعض مضمون ایسے ہیں جو مستقل وقعت رکھتے ہیں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ سرورق کے لئے ہندوستان سے باہر جانے کی ضرورت کیا ہے۔ شالامار کا نظارہ یا تاج محل یا اور کوئی ہندی منظر کافی ہو سکتا ہے۔ کیا "پنجاب خوش شنو است ہمایوں دیار ما" فراموش ہونا چاہئے

شیو نرائن شمیم ۲۲ جنوری ۱۹۳۲ء

جہاں نما

پردے کے متعلق شہر یارِ دکن کا اعلان

گذشتہ مہینے اعلیٰ حضرت نظامِ دکن چند دنوں کے لئے لکھنؤ میں رونق افروز ہوئے۔ تو اثنائے قیام میں معائنہ کے لئے مسلم گرلز سکول لکھنؤ میں بھی تشریف لے گئے۔ امراء و اعیانِ دولت کے علاوہ شہزادے اور شہزادیاں بھی حضور کی معیت میں تھیں۔ سکول کی چھوٹی بچیوں نے اظہارِ عقیدت کے طور پر شہزادیوں کو گلدستے نذر گذرانے۔ مجلس میں بہت سی مسلمان خواتین بھی اعلیحضرت اور شہزادیوں سے شرفِ باریابی حاصل کرنے کی متمنی نظر آتی تھیں۔ سکول کی چھوٹی اور بڑی لڑکیوں نے اس امر کے پیشِ نظر کہ شہزادیاں بھی مجلس میں رونق افروز ہوں گی۔ عمر میں پہلی دفعہ پردہ ترک کیا اور اس مخلوط انجمن میں بے نقاب شامل ہوئیں۔ سر سید وزیر حسن صدرِ مجلسِ منتظمہ نے اعلیحضرت کا خیر مقدم کیا اور ایک مختصر سا سپاس نامہ پڑھا۔

اعلیحضرت نے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے سر وزیر حسن کو اختیار دیا کہ حضور کی طرف سے اس امر کا اعلان کریں کہ حضور اس بات سے بہت متاثر ہوئے ہیں کہ لڑکیوں نے پہلی دفعہ ان کے اعزاز میں پردہ ترک کیا ہے اور امید رکھتے ہیں کہ لڑکیاں دودمانِ آصفیہ کی پیش کردہ مثال سے پردہ ترک کرنے میں تقویت حاصل کریں گی اور مقتضائے وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس رسم کو کلیتہً ترک کر دیں گی۔

بیسویں صدی کی ترقیاں

یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ موجودہ صدی میں بہت سے قدیم عقائد جن کی عظمت قرن ہا قرن سے مسلمہ تھی بالکل مٹ چکے ہیں۔ اس موقع پر ایک اہم سوال اٹھتا ہے اور وہ یہ کہ کیا اس صدی نے پرانے مسلمات کی جگہ کچھ نئے مسلمات بھی پیش کئے ہیں یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اکثر اصحابِ فہم و تدبر نفی میں دیتے ہیں۔ "ورلڈ یونیٹی میگزین" کے ایک مقالہ نگار نے موجودہ دور میں ذہنی اور روحانی ترقیوں کے حصول پر مخالفانہ نقطۂ خیال سے تبصرہ کیا ہے۔ بیسویں صدی کے ربعِ اول میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے جن کی جدوجہدِ حیات کا قصر متزلزل بنیادوں پر استوار ہو رہا ہے۔ عورتیں اور مرد مصروفِ عمل اور سرگرمِ کار نظر آتے ہیں مگر ہزاروں لوگ یہ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں کہ ان کی اس

سعیِ پرجوش کا مقصد کیا ہے. اور حاصل کیا ہے۔ ہر طرف لوگ مختلف النوع مصروفیتوں میں لگے ہوئے ہیں لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مصروفیتیں کسی خاص مصرف کی بھی ہیں یا نہیں اور کونسی مصروفیت کسی دوسری مصروفیت کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے. وہ تمام تصورات جو پہلے انسانی اعمال اور انسانی سرگرمیوں کے محرک اور مقصد ومنتہا تھے اب فنا کردئے گئے ہیں. اور ایسے لوگوں کی تعداد روز بروز افزوں ہورہی ہے جو نہایت صدقِ دل سے یہ سوال کرتے ہیں کہ دنیا جینے کے قابل بھی ہے یا نہیں؟ آخر اس تمام جدوجہد کا کوئی خاص مقصد بھی ہے؟"

والٹرلپ مین نے اپنی کتاب "مقدمۂ اخلاق" میں لکھا ہے. کہ موجودہ زمانے میں انسان نے "پرانے توہمات" اور رسوم وقیود سے آزادی تو حاصل کرلی ہے۔ لیکن کیا اس نے ان پوشیدہ امراض کی کوئی دوا بھی تجویز کی ہے۔ جو آخر ان کہنہ علاجوں کی طرف رجعت کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پرانے مسلمات اور پرانے خیالات کی تباہی سے بلاشبہ ہلچل اور سنسنی پیدا ہوگئی ہے لیکن اب یہ تباہی لانے والے خود اُس سوار کی طرح نظر آتے ہیں جو "زیب اسپ وزینت برگستواں" کے بعد منزل گہِ مقصود سے بالکل نابلد ہو۔ امریکہ کے پروفیسر ٹیلرسن نے موجودہ صورتِ حال کا نقشہ خوب کھینچا ہے. وہ کہتے ہیں کہ آج کل کے انسان نے صرف اتنا غور کرنے کی تکلیف کی ہے. کہ "پرانے مسلمات کے دلائل کی ظاہری اور رسمی صورت میں کیا نقائص ہیں۔ اس کی فکر یہاں تک نہیں پہنچی. کہ یہ مسلمات محض اس لئے کالعدم قرار دئے جانے کے مستحق نہیں کہ ان کے اثبات کے پرانے دلائل ناقص یا غلط ہیں۔ آجکل کے لوگوں نے ان قدیم مسلمات کو نئے دلائل وبراہین کی کسوٹی پر نہیں پرکھا۔ حالانکہ آخری حکم لگانے سے قبل صحیح منطق اس امر کا تقاضا کرتی ہے. موجودہ انسان کے تدبر کی پرواز محض بڑی باتوں کے انکار تک پہنچی ہے. بڑی باتوں کے اقرار تک نہیں پہنچی۔

زندگی کے قدیم معیار پر کسی کو اعتبار نہیں رہا۔ اکثر لوگ وقتی فیصلوں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ مادیت عشرت پسندی کی طرف لے جارہی ہے۔ انسان ہر قسم کی زنجیروں سے آزاد ہورہا ہے، ایسے متشککین کی تعداد میں روزافزوں ترقی ہورہی ہے. جو کسی قدیم اخلاقی معیار کو مسلمات میں سے نہیں سمجھتے۔ بعض لوگ علمیت اور سیاسی قوت کے نشے کے رسیا ہیں۔ تو بعض لوگوں نے اخلاقیات پر حسن اور فنونِ لطیفہ کو ترجیح دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ فلسفۂ اخلاق کے ماہر اس فیصلہ کو غلط قرار دیتے ہیں. بعض طبقات میں جنسی ترقی اور مقابلہ کے جنون کا جوش آشوبِ محشر کا نقیب بن رہا ہے۔

چند دن جنگلوں میں

جنگل! جنگل! دُور دُور تک! درخت ہی درخت گنجان! گھنے! گھن دار! دن دہاڑے رات ــــــ درندے چرندے پرندے! درندے! کسی شاعر کی طرح دھاڑنے، چنگھاڑنے، اکھاڑنے "پھاڑنے" والے! ــ چرندے!؟!؟ اور پرندے! (ہاں) اُڑنے والے پھرنے بلکہ چگنے چھپانے گھونسلوں میں رہنے حق سرہ کہنے والے! جنگل ہاں وہی جنگل جس کے متعلق اسد الشعرا غالب نے لکھا کہ "مجنون جو مرگیا ہے تو جنگل اُداس ہے" اگرچہ عرب میں جہاں مجنوں کا وطن تھا جنگل نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو ان میں درخت نہیں ہوتے۔ (تو پھر یہ کیسے جنگل ہوئے) اور ہندوستان میں جہاں جنگل ہوتے ہیں مجنوں نہیں ہوتے۔ اور اگر ہوتے ہیں تو اُن کے لئے کسی اَور شاعر کو یہ مصرع لکھنا پڑے گا کہ ع

"لیلیٰ جو مرگئی ہے تو مجنون کا بیاہ ہے"

تو پھر یہ کیسے مجنوں ہوئے؛ ہاں وہی جنگل جس کے متعلق جناب شمس العلما مولانا سید امداد امام اثر نے اسی راقم کو تقریباً دس سال ہوئے پٹنے میں اپنے پوتے پوتی کی باہمی شادی پر اپنا یہ شعر سنایا تھا ؎

صحرا صحرا جنگل جنگل مارے مارے پھرتے ہیں   آہو وحشی جان کے ہم کو ساتھ ہمارے پھرتے ہیں

بلکہ اُسی روز انہوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا تمہارے اور تمہارے خُسر کے لئے میں ایک ایسی دوا تجویز کئے دیتا ہوں، کہ تم لوگ کبھی بڈھے ہی نہ ہوگے۔ میاں صاحب تو خیر خدا بخشے ہمیشہ سے ایک ازلی جوان تھے۔ جوان جئے جوان ہی رحلت فرما گئے۔ لیکن مجھے کوئی دوائی فوراً بڈھا ہوجانے سے روک لے تو جانوں۔ سید صاحب موصوف نے Kali Phos (کالی فوس) دوائی لکھ دی۔ میں نے انہیں دنوں میں کلکتہ پہنچ کر اُسے حاصل کیا۔ دس سال بعد جو چند ہفتے ہوئے میں نے اپنی گنگا جمنی دوائیوں کی الماری صاف کرنے کو کھولی تو یقین مانئے کہ وہی باوفا "کالی فوس" جوں کی توں بند کی بند پڑی ہوئی دیکھی۔ اس پر میں نے اپنے ضمیر بشیر وندیر سے پوچھا کہ بتا بے اب تو بوڑھا ہے یا جوان۔ میرے ایک عزیز جو اندریں وقت لقائی ہوش وحواس سیالکوٹ میں سب جج کے عُہدۂ جمیلہ پر قبضہ فرمائے ہوئے ہیں اس کے گواہ ہیں۔ بریکٹ کے اندر لکھا جاتا ہے کہ انہوں نے ہمارے ایک مشترک وکیل ونیم حکیم نیک طبع عزیز ماں ساکن "دواکل" شیخوپورہ کی دل ودماغ سے نکلی ہوئی نصیحت کے مطابق اسی "نیک بخت" دوائی کا استعمال دو ماہ ہوئے بڑے شد ومد سے اس طرح شروع کیا کہ کھانے کے بعد اور شاید کھانے سے پہلے بھی اپنے ہی بستر پر چت لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتے اور نہ ہُوں نہ ہاں کرتے اور یوں چپ چاپ طاقت حاصل کرتے جاتے۔ سب جج صاحب نے بزور فرمایا کہ اس "کالی فوس" نے مجھے بے انتہا فائدہ پہنچا دیا ہے تم اسے ساتھ کے کھیلے ہوئے اِسے استعمال کرو۔ کہ یہ اعصاب کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے اور جہاں اب تمہیں بھوک کم لگتی ہے۔ اور کم کم دو

ہو جانے کی وجہ سے "صوفی" اور "خدارسیدہ" ہو جاتے ہو۔ وہاں اسے نگل کر انشا اللہ دو چار ہی سیکنڈ میں ہر ایک کو کھاؤں پھاڑوں کرنے لگ جاؤ گے"۔ اس پر میں نے اُن سے عرض کی کہ "یا سب جج دو عالم! دس سال سے مجھے اِس کا علم ہے۔ اور برابر دس سال سے میں اِس کے فوائد کی جزئیات کو اپنے دماغ میں جگہ دیئے ہوئے ہوں"۔ (ہزاروں باتوں کا اسے پڑھنے والے مجھے علم رہا ہے جن پر عمل میں نے کبھی نہیں کیا پس اے بھائی اے تو کہ ذرا سی فارسی بھی جانتا ہے۔ من نہ کردم شما حذر بکنید)۔ اس پر میں نے حضرتِ اثر (عظیم آبادی) والا سارا قصہ نہ کہہ سنایا۔ سب جج صاحب خوش ہوئے جوش میں آئے وکیلا انعام واکرام دیئے رخصت ہوگئے۔ میں نے سوچا بس غفلت کا زمانہ ہو چکا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہے۔ اب عمل کرنا شروع کر دو۔ مسٹر ۔۔۔ کے پاس صحت کی خاطر جا ہی رہے ہیں بسم اللہ کر کے ایکبارگی صحت کو بہتر بنانا شروع کر دو ۔۔۔۔۔۔ قطع کلام معاف مگر محض خوشنودیِ حق اور افادۂ عام کی غرض سے مطلع کیا جاتا ہے کہ عام انگریزی ڈاکٹروں کی "اے لو پاتھی" کے خلاف ایک خفیہ تحریک "ہومیو پاتھی" مدتِ مدید سے دنیائے مغرب میں کامیابی کے ساتھ جاری رہی ہے۔ اِس سے ملتی جلتی اس کی ایک شاخ جیسے ہماری کی بندھیا چل ہے Scheusslers Twelve Tissue Remedies یعنی "شواس لرصاحب کی بارہ نسُوی" دوائیں ہیں۔ اس نظامِ حکومت کے مطابق انسان کے جسم میں کل دس نمک ہیں جہاں ان دسوں میں سے کسی ایک نمک کی کمی واقع ہوئی وہیں فوراً انسانی جسم کی کَل کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہونے لگ گیا۔ یا اس کا دماغ پھرکی کی طرح چکر کھانے لگا۔ یا اوپر تلے سینکڑوں ڈکاروں کی بلا وجہ رسیدیں آنے لگیں اور یا وہی شاعروں کے لختِ جگر والے جگر یا دردِ دل والے دل میں اضمحلال واختلال وانفصال وانفعال وزوال کی بیسیوں علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ تم بھی اے ہم جنسو اپنی علالت کی علامات کا بنظرِ غائر مطالعہ کر دا اور دیکھ لو اور سمجھ لو کہ تمہارے اندر کون سے نمک کی کمی ہو گئی ہے پھر بہ "ہمایوں" کے پاس جو ایک پتہ لکھا ہوا ہے اُس پتے پر ایک خط لکھ مارو وی پی پارسل تمہارے نام چند ہی روز میں آدھمکے گا۔ مرسلہ کھاؤ (میٹھی گولیاں ہوتی ہیں) اور یوں نمک حلال بن کر بجائے منحوس و مردود کے مضبوط و مربوط ہو جاؤ۔ واللہ عزیز حکیم (ترجمہ: اللہ ہر ایک کا عزیز ہے اور ہر ایک کا حکیم!)

میں بھی گھر سے نکلتے ہوئے اپنے عزیز کی ہدایات "و نصائحات" کے مطابق اِن "نمکات" میں سے دو شیریں نمک Kali Phos کالی فوس اور Kali Mur کالی میور لے آیا۔ پہلی اے دوستو۔ اعصابی قوت کی دوا ہے۔ کوئی عصب "غضب" ہو تو اس نمک کے نصب کرنے سے بقول شخصے کسب صحت ہوتا ہے (دیکھو مخزن القوافی حرف ب) دوسری جگر و معدہ کی شقاوت و بغاوت کا پھر بقول شخصے سدِ باب کرتی ہے۔ میں خنگل کی سمت جب آیا (اس "سمت ردی" کی تفصیل کے لئے مضمون ہذا کا دوسرا حصہ ملاحظہ ہو) ہاں جب آیا تو ان "مقوی نمکیات" کو جذب کرنا شروع کر دیا اور سب جج صاحب کو اطلاع دی کہ بھائی جان ہم تم ایک عمر نیکی کرنے میں جسم و جان گھلاتے رہے نہ دنیا کی پوری عزت ملی نہ ابھی تک جنت کی راحت نصیب ہوئی۔ اب "کالی فاش" اور کالی موٹ سے خدا نے چاہا تو جسم و جان و دل و دماغ و رُوح میں قوت و شجاعت و بسالت و شہامت دن دونی رات چوگنی ترقی کریں گی۔ نیکی کو بہت آزما چکے۔ اب ذرا برائی کو بھی آزما دیکھیں کہ کیا بُروں کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو نیکوں کا ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ (قارئین کرام معذرت)

نادم ہوں کہ صرف ایک "جنگل" کے لفظ نے اتنی تقریر دلپذیر کرائی۔ بس اب تھوڑی سی اور باقی ہے مثلاً یوں کہ):۔

اے جنگل! اے تو کہ تجھے دیکھ کر خدائے عزوجل کی قدرتیں یاد آتی ہیں! اے جنگل! جس کے سایوں میں بیٹھ کر میں اُسے یاد کیا کرتا ہوں جس کا گھونسلا میرے دل کے کیکر میں ہے۔ ارے او جنگل جس میں "منگل" ہوتا ہے اور تمام وہ دن بھی جب انسان کو دیس نکالا دیا گیا ہو اے جنگل اے وغیرہ وغیرہ وغیرہ . . . . . .

ـــــــــــــــــــ

یہ تو تھی تمہید علم ادب کے اکھاڑے میں مضمون نویسی کی کُشتی کے لئے مصنّف کی تیاری اما بعد ــــــــ میرے ایک عزیز دوست ہیں (یعنی پہلے دوست تھے پھر عزیز بنے) (اور چونکہ وہ نیک آدمی ہیں۔ اور اس لئے ایک ادبی مضمون میں ان کا پورا نام لینا نیکی و ادب دونوں کے خلاف ہے لہٰذا آپ بھی اتنے پر ہی قناعت کرلیں کہ میرے ایک دوست ہیں) مسٹر ض معمول کے موافق اُن کی ایک بیوی ہے۔ انہیں کہئے ض بیگم (اگر بفضلِ خدا پردہ دار ہوتیں تو ض ب لکھنا پڑتا) ان میاں اور ان بیگم کے دو بچے ہیں۔ دونوں لڑکے ایک کو کہئے ض زادہ نمبر ۱ (عمر دس سال) دوسرے کو ض زادہ نمبر ۲ (عمر ڈھائی سال) ض زادہ نمبر ۱ کا نام جو خوب ٹٹ بٹ انگریزی بولتے ہیں مع خدائے جبار اور اپنے پدر بزرگوار کے نام کا ہم وزن و ہم قافیہ ہے لیکن حضرت پدر کی شاعری یہیں تک پہنچ کر ختم ہوگئی۔ کیونکہ ض زادہ نمبر ۲ کا نام محض لفظ مجبور کا ہم نوا ہے۔ گو اس سے یہ نہ سمجھئے کہ وہ نئی پود والوں سے کسی طرح کم خوفناک ہیں چنانچہ میزبانی کے پہلے ہی روز مجھ سے دریافت فرمانے لگے کہ "یہ کُچھ کی "کُرسی" کون کی ہے"؟ مطلب یہ تھا کہ گو بالفعل اس کرسی پر تم بیٹھے ہو مگر یہ ہے ہماری قبضہ وملکیت کے اس فاروقِ اصغر کا نام میں نے اُسی دن سے "مسٹر کون کی" رکھ دیا! مسٹر ض جنگلات کے ایک "خاص" افسر ہیں اور اپنے کام کے ساتھ ساتھ اکثر مجھے بُلا بھیجتے رہتے ہیں۔ ڈیرہ دون، باندہ، پیلی بھیت اور ایک بلدوانی غرض جہاں جہاں یہ گئے گو چند روز کے لئے سہی میں بھی ان کے ہاں جا دھمکا مگر تصدیق کر لیجئے۔ کہ $\frac{1}{4}$ جا دھمکا۔ اور کم از کم $\frac{3}{4}$ مدعو کیا گیا (اپنا کریکٹر سکیچ ہے) میں گو ابتدا میں ایک دیہاتی تھا لیکن اب اپنی موجودہ عمر کے $\frac{5}{8}$ حصے کو ایک شہر میں بسر کرکے اس لئے ایک نیم دیہاتی بھی نہیں کہ ان ۲۵ سالوں میں میرا دیہاتی وطن بھی ایک نیم شہر بن چکا ہے (چنانچہ آج کل وہاں ایک نوزائیدہ میونسپلٹی کی الکشن کا گرد و غبار اٹھ رہا ہے) لہٰذا آپ ہی اندازہ کرلیں۔ اس وقت میں کتنے؟ شہری ہوں اور کتنے؟ دیہاتی۔ قصہ مختصر میں یہی جو کچھ بھی ہوں۔ ایک مکان میں رہنے اور بیٹھ رہنے کا اس قدر خوگر ہوں کہ بس مکان چنبد نہ جنبد من مُحمد۔ اپنے شہر ہی نہ کہ اپنے مکان اپنی ایک بیوی اپنے چار بچوں کو چھوڑ کر کہیں اور جانا کہیں اور رہنا کسی اور سے بات چیت کرنا میرے لئے باعثِ صد کلفت و موجب ہزار مشقت ہے لیکن کیا کیا جائے کہ کسی نہ کسی طرح لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا پر عموماً عمل نہیں ہوتا پر نہیں ہوتا اور یوں اس دفعہ میں اپنا گھٹا کنبہ چھوڑنے پر مجبور و مجبوراً مسرور ہوا۔ شہر میں طبیعت محض ذرا سی باغی ہوئی۔ کہ اُدھر عزیزوں نے اِدھر خود بدولت نے اپنے آپ کو یہ زرّیں مشورہ دیا کہ چند دنوں جنگل کی ہوا کھاؤ۔ مدت سے ان جنگلی افسر دوست کا بھی تقاضا تھا ان کے ساتھ یہ بہانہ کہ تمہارے

تقاضوں پر آرہا ہوں۔ دراصل یہ مطلب کہ جنگل کی آب دہوا میرے کمزور جسم و جان کی مالش کرے ـــــــ خیر چل نکلا!

لاہور سے پنجاب میل میں بریلی کو، بریلی سے چھوٹے ڈبوں والی ریل میں ہلدوانی کو چلا چلا اور پہنچ گیا۔ مسٹر ص کے ہاں وارد ہوا۔ بڑی دقت ہے۔ کہ یہ بڑے مہمان نواز ہیں اور میں بالکل اس کے برعکس خیر وارد ہوا متمکن ہو گیا۔ اب تھوڑی سی۔ . . ان ٹروڈکشن" ہو جائے۔ (کاش میں خواجہ حسن نظامی یا مرزا فرحت اللہ بیگ ادام اللہ مضامینہم فی ہمایوں کے قلم کا مالک ہوتا تو ایسا ٹھیک ٹھیک نقشہ ان مسٹر کا کھینچ کر پیش کر دیتا کہ اس انسانی شیر کی شکل آنکھوں میں پھر جاتی۔ مگر بالفعل اتنا کافی ہے کہ مسٹر موصوف سیمل کے درخت کی طرح لمبے چوڑے وجیہ گندمی رنگ پختہ چال تقریباً چالیس سال کے نوجوان ہیں۔ دس گیارہ بجے کے بعد، تپلون کوٹ والے جنٹلمین مگر یوں شب و روز بھلے مانس صاحب لوگوں کی صرف ایک خاصیت ان میں موجود ہے کھانے کے وقت دفتر کے کام کے وقت ملاقات کے وقت غرض متعدد بار وہ جب نوکر کے بلانے کو "دیکھو ــــــ ت!" کہتے ہیں تو جنگل کے شیر اپنے "بلوں" میں سوتے سوتے چونک پڑتے ہیں۔ باقی ایک مذہبی آدمی کی طرح ضرورت سے زیادہ دیانت دار چیونٹی کی طرح اپنے کام میں منہمک، شیر کی طرح دلیر، چیتے کی طرح جری (واضح ہو کہ میں بطور ایک نیک بخت مہمان کے صرف اپنے میزبان کی خوبیاں بیان کر رہا ہوں) چنانچہ کچھ کام کرنے کے بعد صبح کو یعنی کبھی دس کبھی گیارہ کبھی بارہ بجے تک جب غسل کر چکتے ہیں تو تہ بند نیچے اور رومی ٹوپی اوپر پہن کر پہلے نماز اور بعد میں برآمدے میں بیٹھے قرآن شریف کی عربی با آواز بلند پڑھتے ہیں کہ آدمی کہیں ہو چلتے چلتے رک جاتا ہے یا بیٹھے بیٹھے اٹھ بیٹھتا ہے یعنی ۵/۱۱ جنٹلمین ہوں مگر واقعی ۱/۱۱ بھلے مانس اور فی الحقیقت ۱/۱۱ مسلمان ضرور ہیں۔ (مضمون کہیں ان ہجوں کی کثرت سے خراب نہ ہو جائے۔ بہت خوب اس سلسلے کو ختم کر دیتا ہوں۔ اگرچہ اے دل آنرا کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک!) مسٹر ص نے ارادہ کر رکھا تھا کہ جب آئے تو اس کی یک رنگی "ہمایونیت" کو ذرا کم کرنے کے لئے فوراً اسے ہلدوانی کے حدود اربعہ کے اندر سے کہیں باہر لے جائیں۔ ان لوگوں کے فائدے کے لئے جو بوجہ پنجابی یا کسی اور طرح شریف الطبع ہونے کے میرے مانند یو۔پی کے جغرافیائی حالات سے ناواقف ہیں میں ایک نقشہ اس علاقے کا پیش کرتا ہوں جس میں میری جنگل کی زندگی کے ۱/۱۲ ۱۲ دن کٹے ملاحظہ ہو:۔

سانوں دیہہ
رام نگر
پہاڑ
چھوئی
پاول گڑھ
پہاڑ
کوٹہ
نینی تال
پہاڑ
کاٹھ گودام
کالاڈھونگی
ہلدوانی
لال کنواں
میدان
میدان
میدان
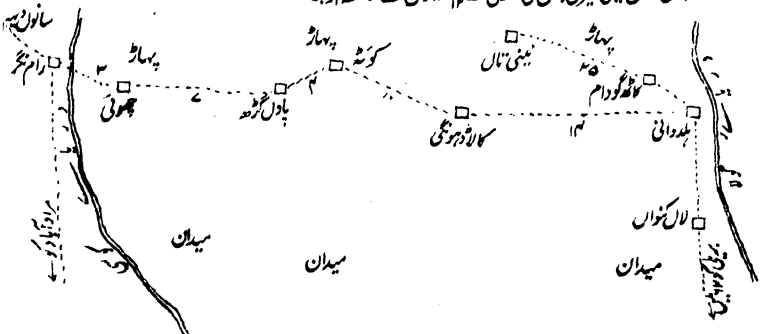
بریلی کو تو سب جانتے ہیں۔ اور جو نہیں جانتے انہیں جانناچاہئے۔ کہ نویں جماعت میں To Carry Coals to Newcastle کا ترجمہ اُلٹے بانس بریلی کو لادنا ہمیں بتایا اور لکھایا گیا۔ بریلی اس طرف کو متمدن دنیا کی سرحد ہے پھر ۶۲+۲۵ میل پھاند جاؤ تو نینی تال مہذب مقام ہے۔ ان دونوں کے درمیان سب کچھ ایسے ویسے مقامات ہیں جہاں کم از کم لال کنوئیں کے پکے پہاڑوں تک اللہ میاں کا جلوہ ہے۔ اور یا ماشا اللہ گیدڑوں اور بھیڑیوں اور شیروں اور لنگوروں کا اور شہر اور قصبے اور گاؤں جتنے اور جیسے بھی ہیں وہ جہاں تک میرا اور آپ کا خیال ہے۔ زیادہ تر اس لئے بنے ہیں کہ میرے دوست وہاں کے مستقل نگہبان ہوں اور ہیں ان کا عارضی مہمان، وہ سرکار کے جنگلی افسر ہوں اور میں آپ کا جنگلی مضمون نگار!

جاننا چاہئے کہ جتنے مقامات کو میں نے اوپر کے نقشے میں نقطوں کے اوپر بٹھایا ہے۔ وہ اس نقشے میں خاص اسکیل کے مطابق قائم کئے گئے ہیں۔ اسکیل ۱ = ۲ ہے۔ ناپ کر دیکھ لیجئے۔ کہ کہاں سے کہاں تک کتنا فاصلہ ہے کتنا نہیں ہے!

یہ علاقہ جسے بھابر و ترائی کہتے ہیں۔ عام انگریزی علاقے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ ایک قسم کی سرکاری ریاست ہے جس کا بہت سا حصہ پرانی دیسی ریاستوں کے سابقہ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس علاقے کو خام کہتے ہیں۔ یہاں خود سرکار زمیندار ہے۔ اور صرف بعض بعض حصے بندوبستی ہیں۔ دامن کوہ کا علاقہ جو نینی تال کے پہاڑوں کے نیچے نیچے چلا گیا ہے۔ بھابر کہلاتا ہے۔ اس کے جنوب کی طرف ترائی ہے۔ یعنی وہ خطۂ زمین جہاں پانی سطح کے قریب ہی دستیاب ہوتا ہے۔ بھابر اور ترائی کا علاقہ لمبائی میں پہاڑ کے ساتھ ساتھ ۵۷ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی چوڑان صرف سولہ سترہ میل ہے۔ ندیاں جو پہاڑوں سے آتی ہیں۔ سردیوں میں اکثر بھابر میں جذب ہو کر نیچے ترائی میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ دریائے کوسی رام نگر میں گم ہو کر آٹھ میل کے فاصلے پر جالا بن کے قریب پھر سطح زمین پر نکل آتا ہے۔ بھابر کا حصہ سمندر کی سطح سے تقریباً ایک ہزار فٹ بلند ہے۔ بھابر کی آب و ہوا کم از کم سردیوں میں صحت بخش ہوتی ہے۔ لیکن ترائی کی حالت دگرگوں ہے۔ اور وہ اپنے موسمی بخار کے لئے دور دور تک مشہور ہے۔ لیکن خاطر جمع رکھئے یہ مضمون صرف بھابر سے تعلق رکھتا ہے۔

اب ایک مؤرخ کی طرح تاریخ پر ایک نظر ہو جائے۔ یہاں اس امر کا اعتراف و بیان ضروری ہے۔ کہ تاریخی نقطۂ نگاہ سے جو کچھ بھی عرض کیا جائے گا۔ اس کی محض یہ حیثیت ہے۔ کہ جو کچھ کسی بھلے مانس سے بات چیت میں معلوم ہوا وہ نوٹ کر لیا۔ تفریح اور فراغت کے دن ہیں۔ کون یہ مصیبت اپنے سر لے۔ کہ ایک تو جنگل کے متعلق تفریحی مضمون لکھے اور دوسرے گڑے زمین کو کھود کھود کر پرانے مردے اکھاڑنے۔ اتنا جگرا ہوتا ہے۔ تو جنگل کو کیوں آتے شہر میں بیٹھے بیٹھے محمد حسین آزاد نہ بن جاتے؛

قصہ یہ ہے۔ کہ دو چار روز ہوئے مجھے بتایا گیا۔ کہ مسلمان بادشاہوں کے وقت میں یہ علاقہ ایک سرکاری شکارگاہ تھا اور انہیں ہمارے بھیڑیوں اور شیروں کے باوا جان ان جنگلوں میں تیغِ اسلام کے سایہ میں امن کی زندگی بسر کرتے تھے چنانچہ اسی حصہ ملک میں ایک مقام ہے (ہلدوانی سے مشرق کی طرف جہاں میں نہیں گیا۔ سو دروغ برگردنِ راوی) اُجسے نانک متھا کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بابا نانک سکھ مت کے بانی وہاں آئے تھے۔ انہوں نے یہاں آ کر جب اپنے ڈیرے جمائے

تو ایک ہندو گرد گورکھ ناتھ نامی نے اُن کا مقابلہ کیا۔ اور عناصر کے ساتھ سازش کر کے اس زور سے آندھی چلوا دی۔ کہ جس پیڑ کے نیچے بابا نانک تشریف رکھتے تھے۔ وہ جڑ سے اکھڑ کر ان پر گرنے لگا لیکن ادھر بھی خدا کا فضل شامل حال تھا۔ انہوں نے کہا رُک جا بیچارا جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ چنانچہ جا کے دیکھ لو (میں نے جا کر نہیں دیکھا) کہ ابھی تک اس کی بعض جڑیں زمین کے اوپر لہلہا رہی ہیں۔ پھر ہندو جادوگر نے کھانے پینے کی سب چیزیں برباد کر کرا دیں چنانچہ یہاں کے کنوئیں کا پانی بھی سکھا دیا۔ مگر اس کا انتظام بھی اُدھر سے خاطر خواہ طور پر ہو گیا۔ پھر جب نانک جی قریب کے پہاڑوں کی طرف گئے اور ان کے چیلوں کو سخت بھوک لگی۔ تو اتفاق سے کہیں ریٹھے کا درخت پاس تھا۔ نانک جی کی دعا سے اس کی ایک شاخ کے ریٹھے کڑوے سے میٹھے ہو گئے۔ اور اب تک میٹھے چلے آتے ہیں چیلے آناً فاناً درخت پر چڑھ گئے۔ اور خوب کھانے کھلانے لگے۔ دوسرے روز جو ان لوگوں کی نیت بدلی توجی میں سمایا کہ کچھ دوسرے دن کے واسطے بھی لے چلیں۔ لیکن یہ پتہ نہ تھا کہ خدائے رزاق صرف حال کی کفالت کرتا ہے مستقبل کے لئے بے ضرورت کھتے نہیں بھر دیتا۔ اب کی جو درخت پر چڑھے۔ تو دوسری شاخ کے پھل کو معمول کے موافق کڑوا پایا چنانچہ جا کے اسے بھی چکھ لو اُسے بھی۔ (میں نے جا کر نہیں چکھا۔ مگر دروغ برگردن مسٹر ض جنہوں نے پرسوں اپنے بکس میں سے وہ میٹھے ریٹھے نکال کر مجھے کھانے کو دیئے۔ پہلا ریٹھا تو کچھ کڑوا ہی تھا لیکن دوسرے پر جب مسٹر ض نے تھوڑا سا کھا کر اصرار کیا کہ یہ یقیناً میٹھا ہے۔ تو میں نے بھی میٹھا ہی پایا ہوگا۔ کہ فوراً آمنا و صدقنا کہہ دیا!) اس مقام پر ایک گوردوارہ ہے جس پر ایک مہنت صاحب قابض ہیں۔ اس وقت اس کے ساتھ تقریباً سولہ ہزار بیگھہ زمین وقف ہے اور مہنت صاحب کی بسر اوقات اس پر موقوف ہے مسلمانوں نے ایک زمانہ میں کل چوراسی ہزار بیگھہ اراضی اس گوردوارے کے لئے مرحمت کی تھی۔ اور یہ گوردوارہ بھی انہیں کا تعمیر کردہ ہے۔

اس حصۂ ملک میں جو چند شہر یا قصبے ہیں وہ دراصل منڈیاں ہیں جہاں زیادہ تر سردیوں میں کاروبار ہوتا ہے بظاہر یہ شہر قصبے زیادہ متمول یا مہذب معلوم نہیں ہوتے۔ مگر ابھی آج کے اخبار میں دیکھا کہ ۲۷ فروری کو ہلدوانی میں سات کانگرسی عورتیں گرفتار ہوئیں۔ خانہ بدوش پہاڑی لوگ سردیوں میں پہاڑوں سے اتر آتے ہیں۔ اور گرمی ہوتے پھر سرکار انگریزی کی طرح پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ امسال پہاڑوں پر کم برف باری ہونے کی وجہ سے میں نے انہیں رام نگر کی سڑک پر دیکھا کہ گویا ایک قوم کی قوم نقل مکانی کر رہی ہے۔ سامان کچھ بیل گاڑیوں میں کچھ مردوں کی بغل میں کچھ عورتوں کے سر پر (ان کی عورتیں ان کے مردوں سے زیادہ جفاکش ہوتی ہیں) اور عورتیں مرد بچے کہیں اکٹھے کہیں آگے پیچھے اس طرح چلے جاتے ہیں گویا جرمن قوم نے بلجیم پر حملہ کیا۔ اور بلجیم والے اپنا سب مال متاع اٹھائے جا رہے ہیں۔ اور جہاں رات ہوتی ہے۔ ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

اس علاقے کا بہت سا حصہ جنگل ہے اور جنگل ہی سے اس کی آمدنی کا بیشتر حصہ حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ یوں کہ جنگل کو مختلف خطوں میں تقسیم کر کے ایک خاص جنس کے درختوں کو نیلام کر دیا جاتا ہے۔ البتہ گرد و نواح کے دیہاتیوں کو

اپنے مکانات کے لئے اور ایندھن وغیرہ کے لئے لکڑی لے جانے اور جنگل میں اپنے مویشی چرانے کا حق بھی حاصل ہوتا ہے بالعموم ان جنگلوں سے دو ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ وصول ہوتا ہے۔ اگرچہ گذشتہ سال کسی حکمت سے سرکاری افسر نے ساڑھے پانچ لاکھ روپے سمیٹ لئے۔ اب معاشی سرد بازاری کے باعث اور بقول بعض نمک خوار ٹھیکیداروں کے کانگرسی تحریک کی وجہ سے اجناس کی قیمتیں بہت گرگئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج کل سنسان جنگلوں میں بھی سیاسی شہروں کی طرح جاںسے گئے لُوٹے گئے کا شور مچا رہتا ہے۔

ان جنگلوں میں سال اور کھیر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لال کنوئیں کے سٹیشن کے قریب ایک نیم انگریز نے لکڑی کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول رکھا ہے۔ اس میں سال کی لکڑی سے جرمن کلوں کے ذریعے سے بڑے چھوٹے تختے بنائے جاتے ہیں اور مختلف کمپنیوں اور دکانوں کو مہیا کئے جاتے ہیں۔ کارخانے میں نوے ہزار کا سرمایہ لگایا گیا ہے اور چند سمجھ دار سفید لوگ اس سے ہزاروں روپے سال کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس کے مقابل میں ہم کالے لوگوں کا ایک کارخانہ ملاحظہ ہو کالاڈھونگی کے قریب جنگل میں ایک جگہ بہت سے دیگچے چولھوں پر چڑھے ہوئے نظر پڑے میرے دوست نے کہا۔ آؤ ہماری دیسی صنعت کا ایک نمونہ دیکھو۔ چند ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں تھیں۔ کچھ پہاڑی مرد اور بہت سی پہاڑی عورتیں باہر کھڑی ہوئی بڑے بڑے چولھوں پر دیگچے چڑھائے کچھ اُبال رہی تھیں۔ کھیر کے درخت کو چیر کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تراش کر انہیں پانی میں ڈال کر ابالا جاتا ہے۔ پھر یہ رنگدار پانی چھانا جاتا ہے۔ اور الگ ایک گھڑے میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ وہ جم کر کتھا بن جاتا ہے اور یہ کتھا پان میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے دیکھ کر چلتے ہوئے کہا۔ سن لو کتھا ہماری ساری پہاڑی عورتیں کتھا ہماری کتھا ہماری کہہ کر ہنس پڑیں۔ اور ہم صاحب لوگ بن کر رخصت ہوگئے کہ ہمارا فرض ادا ہوگیا۔

ہندوستان کے جنگلوں میں حکومت کی طرف سے ٹھیکیداروں کو درخت کے درخت نیلام میں فروخت کر دئے جاتے ہیں۔ کٹائی چرائی کے بعد وہ کارخانہ داروں اور تھوک فروشوں کے پاس اپنا مال فروخت کر دیتے ہیں۔ پھر وہاں سے لکڑی مختلف طرح بکتی ہے لیکن مسٹرض نے بتایا کہ یورپ میں حکومتیں اپنے جنگلوں میں سب کام خود کرا کے دوکانداروں کی طرح نفع اٹھاتی ہیں کلیں کارخانے جنگلوں میں قائم ہیں۔ طلب کے مطابق سامان رسد سے اشیا تیار کی جاتی ہیں اور فایدہ اٹھایا جاتا ہے۔

ہاں اپنے طریقے میں ہماری سرکار بھی بڑی جنرس واقع ہوئی ہے چنانچہ میرے مسٹرض نے اپنے علاقہ کے ایک حصے میں سونے کا ٹھیکہ بیس روپیہ سالانہ کو دیا ہے۔ سونا! سونا! سنہری سونا! ٹھیکیدار صاحب ندی کے خشک پاٹ کی ریت کوٹے لے کر چھانتے چھنواتے ہیں۔ اور سونے کے اتنے ذرے جمع کر لیتے ہیں۔ کہ اُس کے لئے بیس روپے سالانہ کی رقم پیشگی لٹا دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

اب قبل اس کے کہ آپ کو مسٹرض کی موٹر میں بٹھاؤں اور پھر جنگل کی طرف لے چلوں۔ ذرا اس علاقے پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ ہلدوانی سے لال کنواں پھر نینی تال اور پھر دررے پر مسٹرض کے ساتھ ساتھ کالاڈھونگی سے کوٹہ، کوٹہ سے پادل گڑھ ،

پاؤں گڑھ سے چھوئی اور چھوئی سے رام نگر (دیکھئے پھر سے نقشے کو!) یہاں سے وہاں، وہاں سے وہاں، وہاں سے وہاں، یوں گئے ہم، یوں گھومے، یوں بھاگ دوڑ کی ہم نے!

سردیوں کا آخری زمانہ، فروری کا اخیر، سامنے نینی تال کے اونچے پہاڑ، اُن کے نیچے گویا ان کی آغوش میں پہاڑیاں جن کی جنوبی گھاٹیاں سبز و سرخ درختوں کے گنگا جمنی ملبوس سے مزین، پھر کہیں ذرا چڑھائی کہیں ذرا اترائی نشیب و فراز کی آنکھ مچولی پھر اُدھر پہاڑیوں سے آبشار کا گرنا اور اِدھر وادیوں میں پانی کا نہر بن کر بہہ نکلنا، اُدھر کنجو کے خزاں دیدہ درختوں کی بہار اِدھر خشک ندیوں کے پاٹ کی چمک یعنی حسن اپنے زوال میں بھی دل ربا و جان افزا کبھی کشمیر کی یاد تازہ ہوتی تھی کبھی سوئٹزرلینڈ کی، موسم ایسا کہ سردی، ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم اور اونچائی بھی اسی طرح بس نہ زیادہ بہت نہ کم۔ پہاڑوں کی جگہ پہاڑیاں دریاؤں کی جگہ ندیاں، چڑھائی میں تھوڑا چڑھاؤ۔ اترائی میں تھوڑا اتار، غرض پہاڑی علاقے میں میدان کی سی وسعت یا یوں کہئے کہ میدانوں میں پہاڑ کی سی عظمت۔ بلندی و پستی کی ایک خوش منظر آرامگاہ!

جنگلوں کی یہ کیفیت ہے کہ کہیں تو کوسوں تک گنجان جنگل چلا جاتا ہے۔ ماسوا اس کے کہ کہیں کہیں چرائی کٹائی کے نشانات نظر آتے ہیں اور کہیں یہ حالت ہے کہ جنگل کے بیچ میں کھلے میدان اور پھر درختوں کے جھنڈ آجاتے ہیں۔ ان کھلی روشن جگہوں کو جنگل کی زبان میں چوڑ اور چاندر کہتے ہیں۔ اور ان تاریک گھری ہوئی جگہوں کو بوجھی یا بجھیا۔ اور اگر وہاں کچھ پانی بھی ہو تو کچھار چنانچہ میر انیس کا مصرع ہے "جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں" اس علاقے میں نہریں اور آبجوئیں کثرت سے ہیں یہاں تک کہ سردی کے موسم میں یہ چھوٹی چھوٹی پختہ سنگیں نہریں ہی ہیں جن سے کھیتوں کی آبپاشی ہوتی ہے۔ ان کی تہ پتھر کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے۔ ان کی چوڑائی بالعموم دو چار گز اور زیادہ سے زیادہ دس گز ہوتی ہے اور ان کی گہرائی صرف دو چار فٹ۔ پانی خوب صاف شفاف اور ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا ہے۔ اور نہایت تیزی سے بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔

نور کے تڑکے اِن اونچے نیچے کھیتوں کی سیر جھٹپٹا ہوتے یا تاروں کی چھاؤں میں جنگل کی فضا ایسی فرحت بخش ہوتی ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے مہذب انسان بھی اپنے علم و فضل کو بھول کر فطری زندگی کا لطف اٹھانے لگتا ہے۔

اِس غفلت کے خواب سے مجھے مسٹر ض کی موٹر نے جگا دیا۔ آخر اس علاقے میں میں آسمان پر سے تو نازل ہوا نہ تھا ریل میں ہلدوانی آیا۔ پھر جو "صاحب جنگل" کے تحت جنگلوں میں دور دور تک بس بنگلے پھیلے پڑے تھے۔ ان میں ایک دن یہاں دو دن وہاں ٹھہرتا ہوا سارے شمالی علاقے کی سیر کرتا چلا اور یہ سیر موٹر اور ہاتھیوں اور اونٹوں اور ملازموں اور فیلبانوں اور ساربانوں کے وسیلے سے ہوئی کبھی ہر دو، کبھی ہر دو سے، روز یہ ہوتا کہ :- ہوتا ہے جادہ پیما نو کارواں ہمارا۔ موٹر متذکرۃ الصدر نے مجھے کیونکر بیدار کیا۔ اس کا قصہ یوں ہے۔ کہ اس جنگلی علاقے میں جو پورے ایک سو چودہ میل ہم اس موٹر میں گھومے تو گھومے کیا خوب پھینکے گئے۔ سڑکیں اکثر ایسی کہ موٹر میں مُردے بھی ہوں تو صُور پھنکنے سے پہلے ہوش میں آجائیں، کبھی ہمارے سر کی ٹکر موٹر کی چھت سے کبھی ہم آپس میں دھکم دھکا، غرض کہ ایک اچھا خاصہ مفت کا سینما کہیں جنگلی رستوں پر، کہیں خشک ندیوں کے پتھریلے پاٹ

کے پار کہیں گھاٹیوں میں کہیں چٹانوں پر کہیں سڑک ایک طرف کو اونچی اور دوسری طرف اتنی نیچی کہ دایاں پہیہ زمین سے اُٹھنے کو تیار اور دل دھڑکے کہ بس ابھی گرے ابھی گرے کہ اتنے میں مسٹر ض کے بے باک اشاروں پر موٹر یہ جا وہ جا ہم بھی خوش وہ بھی ہمیں دیکھ کر خوش لیکن پھر وہی کم بخت سڑک کہ پیچھا نہ چھوڑتی تھی یعنی وہی جھٹ پٹ کھٹ۔ پٹ کھٹ پٹ جھٹ پٹ کی آوازیں اور یک لخت گرڑڑڑ ارے یہ کیا آفت آگئی۔ اف جو ہونا تھا سو آخر ہو ہی گیا جنگل کی سڑک غصے سے بل کھا رہی تھی۔ کہ یہ کالے لوگ کہاں مجھ پر سوار چلے جاتے ہیں، ایک جگہ موٹر جو مڑے تو سڑک بیچ سے اونچی اور دونوں طرف گڑھے پڑے ہوئے موٹر وہیں اٹک کے رہ گئی۔ اب لاکھ جتن کر نتیجہ صفر مسٹر ض پرانے گھاگ تھے جی میں مسکرائے۔ مگر ذرا دل بہلانے کو کہنے لگے اب کیا بنے گا، میرے ہوائیاں چھوٹ گئیں۔ دور دور جنگل نہ آدم نہ آدم زاد، بس ایک مسٹر ض اور اُن کا کینہ اور ضمیمے کے طور پر میں۔ موٹر میں سے ہم اُترے اتارے گئے، گدّوں کے نیچے سے طرح طرح کے اوزار نکلے جن سے پہیوں کو اونچا کیا۔ سڑک کو پھاوڑے سے تراشا حسنِ اتفاق سے کچھ پہاڑی عورتیں جنگل میں دور نظر پڑیں انہیں بلایا اور کہا کہ ذرا اپنی درانتی سے بہت سی گھاس کاٹ کر ہم کو دو۔ وہ ہنستی ہنستی گھاس کاٹتی تھیں اور ض زادہ نمبرا اور میں اُسے سڑک کی "گڑھیل" لیکوں میں بھرتے جاتے تھے کہ پہیئے ذرا اونچے کئے جائیں۔ اُدھر یہ کام ہو رہا تھا اُدھر ض بیگم نے ایک پھبتی کہی کہ اور کچھ نہیں تو ٹ کے مضمون کے لئے تو کچھ مصالحہ تیار ہو گیا۔ اس سے ہم خوش ہو گئے اور اللہ میاں کی حکمت پر ایاک نعبد اور سمع اللہ لمن حمد کہنے لگے۔ غرض خدا خدا کرکے سڑک تیار ہوئی پھر لگے شہری مرد اور جنگلی عورتیں موٹر کو پیچھے سے دھکیلنے۔ اے لو تھوڑی سی چلی۔ جان میں جان آگئی۔ بارِ خدایا تیری عنایات بھی کیسی ہیں۔ کہ اتنے میں پھر پہیہ پھنس گیا۔ یا الٰہی خیر، تھوڑا سا پھر تراشا اور پھر دھکیلا۔ موٹر چل نکلی۔ سبحان اللہ، آج یقین آگیا کہ خدا ایک ہے اور میں اس کا بندہ ہوں۔ پھرّ فرّ پھرّ فرّ چلے بنگلے کی طرف اور دھک سے جا ٹھہرے!

ان مزیدار دقتوں کے علاوہ سڑکوں پر چلتے ہوئے موٹر کی دھگ دھگ اور پھٹ پھٹ سے جو افراتفری بیچارے بے قصور مویشیوں کو پڑ جاتی تھی۔ وہ دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ بالخصوص بچھڑوں بچھیاؤں کی ایک دوڑ جس کا باعث ہم تھے حضور وائسرائے کی گھوڑ دوڑ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس بچھیا دوڑ میں دوڑنے والے اور والیاں اپنی دم دُبا کر نہیں اٹھا کر ایسی بے تحاشا دوڑیں کہ یہ واقعہ انسانی ملاحظات کی تاریخ میں ہمیشہ گرد آلود حرفوں سے لکھا جائے گا۔ سب سے بے وقوف جانور زیارۂ کردہ سڑک پر سب سے زیادہ دور تک ہمارے آگے آگے اور پھر ہمارے ساتھ ساتھ بھاگتے تھے۔ مجھے دیکھ کر خیال آیا کہ شاید اسی طرح تہذیب کی شاہراہ پر ترقی کی دوڑ میں سب سے تیز وہی دوڑ رہے ہوں جو سب سے زیادہ بیوقوف اور جاہلِ مطلق ہوں کیا عجب ہے کہ اسی طرح کوئی ہم سے زیادہ قوی اور فہیم اور فریب کار "طاقت" اپنی دھگ دھگ اور پھٹ پھٹ سے ہمیں بھگا بھگا کر اپنی زندگی کے لئے سامانِ تفریح پیدا کر رہی ہو لیکن اس طاقت کو آگاہ ہو جانا چاہیئے کہ جب سے ہم نے "وہ بچھیا دوڑ" دیکھی ہے ہمارے دل میں اُس طاقت کی "چالوں" کے متعلق سخت شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ اور وہ دن دُور نہیں جب ہم اپنے

آپ سے اور کائنات سے تنگ آکر اس کی "دھگدھگی" کی راہیں مسدود ہو جائیں گے کہ بلا سے ہم لہولہان ہو جائیں لیکن اُس کو بھی اس مذاق کا (معاذ اللہ) کچھ مزا چکھا دیں!

جو کام سڑکوں پر موٹر کا تھا وہ جنگلوں میں ہاتھی کا قرار پایا۔ ہاتھی کو جنگل کا سٹیم رولر (سڑک کوٹنے والا انجن) کہئے جھومتا جھامتا اپنے بھدے پن میں شاندار۔ یہ جانور نہایت زیرک اور دوربین ہے جنگل میں جہاں جھاڑ جھنکاڑ ہو وہاں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ لیکن قدم جب ایک بار رکھ دیتا ہے۔ تو پھر پیچھے کو نہیں ہٹاتا جو کچھ پاؤں تلے آجائے اسے روند ڈالتا ہے جو کچھ سامنے آجائے۔ اُسے ٹکر مار کر توڑ دیتا ہے۔ اور چاہے تو اچھے خاصے پیڑوں کو جڑ سے اکھیڑ کے رکھ دیتا ہے۔ ہاتھی فی الحقیقت جنگل کا انجنیر ہے۔ رستہ ڈھونڈتا ہے رستہ صاف کرتا ہے رستہ بنا دیتا ہے۔ انجن ڈرائیور انجن ریل گاڑی سب کچھ یہی ہے بس آپ اوپر بیٹھے رہے۔ یہ اپنا کام کرتا چلا جائے گا۔ خیر ایک مہاوت گردن پر بیٹھا ہو تو "بیل" (اٹھ چل)، "بیٹھ ڈم" اور بالخصوص "دھت دھت (ٹھہر، ہٹ)" "بری بری" (مت کر) سے قواعد اردو کی بھولی ہوئی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

کالا ڈھونگی کا جنگل قابل دید ہے۔ بڑے درختوں کی شان، چھوٹے درختوں کی نزاکت، خوبصورت جھاڑیاں کہیں کہیں گھاٹیاں۔ بس جی چاہتا تھا کہ زندگی کے کچھ دن یہیں بے فکر ہو کر کاٹئے لیکن عربی، فارسی والی "فکر" نے بہت جلد اردو کی فکر پیدا کر دی۔ چیزوں سے لطف اُٹھانے کی صلاحیت اس عاصی و احقر "مَیں مضمون نویس" میں اس درجے تک مفقود ہو چکی ہے۔ کہ ذرا لطف آیا اور وہیں معاً یہ خیال بھی دل میں چٹکیاں لینے لگا کہ اس لطف کے زور سے ایک لطیف مضمون لکھ دو۔ واہ ہم بھی لکھنے والوں کے لئے ایک دلکش موضوع بنے جاتے ہیں ایک معما ضرور لیکن ایک بہت جلد حل ہو جانے والا معما۔

جنگل کی سیر کر رہا تھا ہمسفر ساتھ تھے۔ سال کے درخت سروسہی کی طرح کوسوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس خیال سے کہ شاید اس کی ٹہنیاں گھونٹ کر پی لینے سے قد لمبا ہو جائے مجھ پست قد نے اس درخت میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ ہلدو، سال، سیمل، کنجو، باکلی، کھیر، روہنی، املتاس، بیل، رتی چنبیلی یہ ہے میرا پہلا سبق اور اسی سبق کی تصویروں سے ان جنگلوں کی لاکھوں جلدوں والی کتاب آراستہ پیراستہ ہے، ہلدو، سال سیمل شاندار درخت ہیں ان کو دیکھ کر کشمیر کے دیودار اور سفیدہ یاد آئے لیکن یہاں دیکھنے میں نہ آئے۔ ہلدو جس طرح اپنی اونچائی میں اسی طرح اپنے پھیلاؤ میں بھی ایک شاندار درخت ہوتا ہے۔ لیکن اُس کی لکڑی صرف چھتوں کے اندرونی حصے کے لئے کام آتی ہے سال کا پھیلاؤ بہت کم ہوتا ہے یہ ایک سیدھا اونچا خوبصورت درخت ہے جو ہندوستان کے قیمتی درختوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ جہاں اُگے وہاں صرف اپنوں کی موجودگی کو روا رکھتا ہے۔ غیروں کو اکثر پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ جہاں سال ہوں وہاں عموماً سال ہی سال ہوتے ہیں یعنی اپنے قبیلہ والوں کا بے حد جانبدار ہے۔ لیکن قبیلے والوں میں بھی پھوٹ پڑتے دیر نہیں لگتی۔ زندگی کا نام ہے جہد للبقا۔ جہاں بہت سے سال ہوئے وہ لگے ایک دوسرے کو دھکیلنے اور کچلنے نتیجہ وہی جو ہر جگہ ہوتا ہے،

کہ قوی کمزوروں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک وزان کی بھی باری آجاتی ہے مگر وہ روز بعض اوقات عمر نوح کے بعد آتا ہے۔ کیونکہ اگر کسی ہاتھی کے حملے یا کسی ٹھیکیدار کے کلہاڑے سے بچ رہے تو سال عموماً تین تین سو سال تک زندہ رہتا ہے بلکہ اس کی امکانی عمر اس سے دُگنی تک ہو سکتی ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ کھیر سے کتھا بنتا ہے۔ یہ ایک قسم کا کیکر ہے اور اس کی شکل وصورت کیکر سے بہت ملتی جلتی ہے،، دھنی یہاں بکثرت دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کی شناخت بآسانی اس کے لال لال بیر کی طرح کے پھل سے ہو جاتی ہے جو گچھوں کی شکل میں لگتا ہے جنگل میں سینکڑوں جگہ پہاڑی عورتیں اپنے ٹوکرے لئے ہوئے روہنی کا پھل جمع کرتی اور اسے مل مل کر وہ لال آٹا سا اس سے بناتی ہیں جس کا نام کمیلا ہے جو ایک مشہور دوائی ہے۔ دن دن بھر وہ یہ محنت کرتی ہیں تب کہیں جا کر شام ہوتے تک وہ بمشکل دو یا تین آنے کما سکتی ہیں۔ ہم وطنو! کیا یہ زندگی ہے یا محض موت سے گریز؟ سیمل سفید تنے والا ساں سے بھی زیادہ پر شوکت درخت ہے جنگل کا وجیہ جوان اس کی روئی سے سبک سروں اور نازک دماغوں کے نرم تکیے تیار ہوتے ہیں۔ اور اس کی لکڑی سے دیا سلائی کے سارے چوبی لوازمات تیار کئے جاتے ہیں چنانچہ بریلی میں سویڈن والوں نے جو دیا سلائی کا ایک بڑا بھاری کارخانہ قائم کر رکھا ہے اُس کے لئے وہ انہیں بھابر ترائی کے جنگلوں کے سیمل کی لکڑی حاصل کرتے ہیں، املتاس اور بیل کو میں نے بھی پہچان لیا۔ املتاس کی لمبی لمبی لکڑیاں جیسے لاٹھی مار پولیس کے ہنٹر اور بیل کے گول گول پھل جیسے ہاکی کرکٹ کے گیند، مگر یہ جنگل وہ نہیں جن پر صرف ٹھیکیدار ریجھے بلکہ یہاں تو سنار کے منہ میں بھی پانی بھر آئے، جگہ جگہ میں نے بعض درختوں کی ٹہنیوں سے سرخ سرخ دانے لٹکے ہوئے دیکھے ننھے ننھے گول گول خوبصورت سڈول سب ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور لطف یہ کہ یہاں یہ دانے ایک قسم کے درخت سے لٹک رہے ہیں اور ابھی چند قدم آگے دوسرے قسم کے درخت سے لٹکتے نظر آتے ہیں۔ حیران ہوا کہ کیا ماجرا ہے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ رتی کی بیل ہے جہاں موقع پاتی ہے جو درخت پاس ہو اس پر چڑھ جاتی ہے۔ جا بجا رتیاں ہی رتیاں لٹک رہی ہیں ننھی ننھی سرخ گولیاں جن سے جنگل کی پریاں اپنے کھیل کھیلتی ہونگی! ایک ہی دن میں اتنی رتیاں نظر سے گذریں کہ غالباً کوئی سُنار یا ریاضی کا طالب علم ہی بتا سکے کہ ان کے کتنے ماشے اور تولے اور چھٹانکیں اور سیر اور من ہو گئے۔ ہائے ہائے ظالموں نے نازک اندام بھولی بھالی رتی کو بھاری بھر کم بد دماغ من کے پلے باندھ دیا۔ ارے کم بختو تمہارے علم وفضل نے حُسن وخوبی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا! کب نوع انسان تمدن کے پنجے سے چھوٹے اور کب وہ اپنی فطری زندگی اور طبعی قوت کو دوبارہ پالے!

جنگل کے چپ چاپ ساکن درختوں کی آبادی میں جنگل کے بولنے والے چلتے پھرتے جانوروں کی آبادی بھی آباد ہے۔ درختوں کو ہم دیکھ چکے۔ اب بعض جانوروں کی کہانی بھی سُن لیں۔ میرے خیال میں جس قدر ایک آدمی زیادہ خوف کھاتا ہے اسی قدر زیادہ خوفناک جانوروں کی کہانیاں سننا چاہتا ہے۔ کم از کم یہ میرا تجربہ ہے اپنے متعلق۔ مسٹر ض جب مجھے ملتے ہیں میں ہمیشہ اُن سے شیروں کے متعلق تازہ ترین حالات سننے پر اصرار کیا کرتا ہوں یوں ان کے پاس بار بار آنے سے اتنا حوصلہ ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ پچھلے دنوں جب کالاڈھونگی کے جنگل میں انہوں نے مجھے ایک شیر کے پنجے کا نشان دکھا کر کہا کہ شیر

آج رات ہی یہاں سے گذرا ہے۔ تو میں تصور میں آٹھ گھنٹے پہلے کا خیال کرکے بھی مطلق نہیں ڈرا بلکہ اپنی جگہ پر قائم رہا اور "نقش پا" کو پامردی اور استقلال سے ٹکٹکی لگا کر دیر تک دیکھا کیا (شیر، چیتا، بھیڑیا، سانبھر، چیتل، کاکڑ، یہ دونوں ہرن کی قسمیں ہیں) خنزیر، جنگلی کتا، بندر، لنگور، سن لیجئے ان حضرات کی ہمسائیگی میں جنگل کے بنگلوں میں اور بنگلوں کے کمروں میں محفوظ ہو کر میرا دل ذرا بھی نہ دھڑکا۔ بلکہ میں نے اپنے دل سے اور دل کے ذریعے دماغ سے اور دماغ کے ذریعے گرد و نواح کے جانداروں سے یہ صاف صاف کہہ دیا کہ ہم تم ایک ہی خدا کے بندے ایک ہی رسول کے پیرو اور جہاں تک بندروں لنگوروں کا تعلق ہے (خدانخواستہ) ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں پس اے دہاڑنے والے شیرو اور اے کاٹنے والی چیونٹیو! میں ان جنگلوں میں انسانوں کی طرف سے ان کا ایلچی مقرر ہو کر تمہاری خدمت میں صلح و امن کا پیغام لایا ہوں۔ بلکہ چونکہ میں اپنی بندوق کی شکل بھی کم دیکھتا ہوں اس لئے میں تو عموماً تمہاری درازئ عمر کی دعائیں ہی مانگتا رہتا ہوں چنانچہ پچھلے روز جب مسٹر ض مجھے سال اور دوسرے جنگلی پیڑوں کی عمریں بتا رہے تھے۔ تو میں نے ان سے پوچھا کہ جنگلی جانوروں کی عمریں کیا کیا ہوتی ہیں اس پر انہوں نے رسالہ "انڈین فارسٹر" کا فروری ۱۹۳۲ء نمبر دکھایا۔ جس میں "ہندوستان کے دودھار جانوروں کی عمریں" کے عنوان سے ایک مستند مضمون درج تھا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ہمارے بزرگ بندروں کی اوسط عمر سات سال، پوری عمر پندرہ سال اور زیادہ سے زیادہ پچیس تیس سال تک ہوتی ہے۔ حضرت لنگور دس سے پندرہ سال تک زندہ رہتے ہیں اسی طرح چیتے کی ۶ سے ۱۵ بھیڑیے اور گیدڑ کی ۱۰ سے ۱۵، لگڑ بگڑ کی ۱۲ سے ۲۴، لومڑی کی ۱۳ سے ۱۵، بارہ سنگھے کی ۱۴ سے ۲۳، خنزیر (علیہ اللعنت) کی ۱۵ سے ۲۰، شیر کی قید میں عموماً ۴ یا ۵ اور آزادی میں ۱۱ سے ۱۹ تک، ریچھ کی ۲۰ سے ۴۳ تک لیکن ہاتھی کی ستر بلکہ سو سال تک ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ ہاتھی انسانی قید میں زیادہ عمر پاتا ہے جنگلی زندگی میں کم۔

اب چلئے آپ بھی انتظار کر رہے ہونگے۔ اب شکار کھیلیں، ہاتھی پر چیتے کا اور شیر کا شکار، موٹر پر کوؤں اور چیلوں کا، اور پیدل چل کر مرغیوں کا فاختاؤں کا لوؤں کا اور اور (شکاریوں کا قاعدہ ہے کہ): ؎

سامنے آجائے جو کچھ دیکھ منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا

پہلے میری "شنید" سنئے پھر میری "دید" کی باری آئے گی! لال کنوئیں کے جنگل میں ہمارے افسر ایک واقعہ کے متعلق تفتیش کر رہے تھے۔ میں نے سن پایا کہ چند روز ہوئے وہاں انگریز پولیس "سپرنٹنڈنٹ" نے شیر کا شکار کرنے کو ایک کٹرہ بندھوایا راتوں رات شیر نے گلا لا کر دیا۔ یعنی کٹرہ کو مار دیا۔ (یہ قاعدہ ہے کہ اس طرح ایک بے گناہ کٹرہ جنگل میں بندھوا دیا جاتا ہے رات کو شیر یا چیتا آکر اسے مار دیتا ہے۔ صبح آپ اسے مرا ہوا دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں پاس کے درخت پر "مچان" یعنی ایک بے پایہ چارپائی بندھوا لیتے ہیں وہاں سہ پہر کو بیٹھ جاتے ہیں۔ شام تک انتظار کرتے ہیں شیر آتا ہے۔ پھر تو اگر آپ کے حواس باختہ نہ ہو جائیں۔ تو آپ اس پر گولی چلا کر "شیر افگن" بن جاتے ہیں) اتفاق سے اسی دن ایک امریکی امیر تاجر ادھر آنکلا اور وہ

جنگل کے سرکاری رکھوالے کو کچھ چاندی سونا دکھا کر اپنے "مچان" بندھوا کر درخت پر ہو بیٹھا۔ "سپرن ٹانڈنٹ" صاحب کو پتہ چل گیا۔ وہ ہاتھی پر جھومتے جھامتے تشریف لائے۔ اور امریکی کو اترنے کا حکم دیا۔ وہ اترا۔ مفصل حالات سن کر اپنے قصور کا معترف ہوا۔ اس پر "سپرن ٹانڈنٹ" صاحب نے خسروانہ فیاضی کے طور پر اسے پھر تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن جب انہوں نے سنا کہ شیر مار لیا گیا۔ تو ان کا شکاری غصہ زور پر آیا اور انہوں نے سرکاری رکھوالے کی "رپٹ" کر دی۔

ایک امریکی "تاجر" کی "شیر افگنی" کی داستان نے دوسرے "سفید رنگ" تاجروں کے دل میں بھی گدگدی پیدا کر دی چنانچہ جب ہم کالاڈھونگی میں مقیم تھے تو ایک دن صبح کو ایک موٹر نے اپنی آمد آمد کا آوازہ بلند کیا۔ حیران ہوئے کہ یہ نووارد کون ہیں۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ دو اطالوی مسٹر ض سے شیر کا شکار کھیلنے کی اجازت لینے آئے ہیں۔ وہ مسٹر موصوف سے اطالیانہ انگریزی میں باتیں کرتے تھے میں پاس کھڑا یہ دیکھ رہا تھا۔ کہ "مسولینی" کی دھاڑ چنگھاڑ کا کچھ ان کے لب و لہجے میں بھی نشان ہے کہ نہیں مگر میں نے دیکھا کہ چھپ کر شیر مارنے کی آرزو نے ان میں سے ہر ایک کو جنگل کے افسر کے آگے بالفعل ایک رُوباہ بنا رکھا تھا۔

اسی کالاڈھونگی کے گاؤں کے قریب ایک انگریز میجر متمکن ہے۔ مضافات میں دور دور تک اس کی جائداد پھیلی ہوئی ہے۔ گویا وہ ایک بڑا رئیس اور امیر کبیر ہے۔ (افریقہ میں بھی اس کی جائداد اور اراضی ہیں) یہ میجر بڑا تجربہ کار شکاری ہے اس نے اتنے مردم خور گلدار (چیتے) اور شیر مارے ہیں۔ کہ پہاڑی لوگ اُسے "چھوٹا پرمیشر" کہتے ہیں۔ ہمارے آنے سے دو چار ہی روز پہلے بعض پہاڑی لوگوں نے اس کے پاس آکر دہائی دی۔ کہ فلاں مقام پر ایک شیر اکثر ہمارے مویشی مار کر کھا جاتا ہے۔ اس پر صاحب کٹہرا بندھوا کر بغیر مچان کے ایک درخت پر بیٹھ گیا۔ جب شام کا وقت ہوا تو ایک شیر دور سے آتا دکھائی دیا۔ وہ پہنچا تھا کہ دور ایک اور شیر نظر پڑا۔ وہ بھی ادھر ہی کو آیا۔ پھر یہ پہنچا تو دور سے ایک تیسرے شیر کی شکل بھی دکھائی دی۔ لیکن اسی پر بس نہیں بلکہ ایک چوتھا شیر بھی وہاں آوارد ہوا۔ چار شیر اور ایک لاش۔ چاروں لگے غرانے میجر پہلے تو تماشا دیکھتا رہا پھر تاک کر اس نے سب سے بڑے شیر پر جو تقریباً بارہ فٹ لمبا تھا۔ گولی چلائی اب زخمی شیر اور دوسرے شیروں میں سخت لڑائی ہونے لگی۔ زخمی شیر سمجھا ہو نہ ہو ان حاسد بھائیوں نے مجھ پر حملہ کیا ہے غصے میں آگیا اور ان پر جا پڑا۔ سارے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اور سارا جنگل ان کی چیخ پکار سے گونج اٹھا۔

یہ کہانیاں سن سن کر میں نے بھی کمر ہمت باندھی! درجی سے کہا کہ افسوس اک عمر دوسروں کا شاید لیکن اپنا یقیناً "شکار" بنا رہا۔ مگر اب وقت آگیا ہے کہ اپنا شکار نہیں اپنا شکاری بنوں اور جس طرح انہیں مسٹر ض کی معیت میں اور ان کی ترغیب پر ایک دفعہ شملے میں میں دن بھر میں ستیس میل پیدل چلا تھا۔ اسی طرح ان کی معیت میں کسی نہ کسی طرح میں بھی جنگل میں گھس جاؤں کہ دلیروں کی دنیا خود بخود میری عزت کرنے لگے لیکن میری موجودگی نے کچھ ایسا

اثر پیدا کیا کہ کئی بار لال کنوئیں کی توجیوں میں کالاڈھونگی کی جنگلی سڑکوں پر پادل گڑھ کے گنجان جنگل میں ہاتھیوں پر یلغار کرتے ہوئے نکلے۔ مگر مرغیاں بھی شاید ہم پر ہنستی ہوئی دور ہی دور کہیں اُڑ گئیں ہم کیا گئے جنگل پرندوں درندوں سے خالی ہو گئے۔ یہ موقع بھی نہ ملا کہ بقول "مسٹر کونکی" (عمر ڈھائی سال) کے میں ڈل پلا ڈر پڑا میں طوطیا ڈرر رہا ہوں)، صرف یہی ہوا کہ چھوٹی کے جنگل میں ہاتھی پر بیٹھے ہی جنبیلی کے کچھ پھول توڑے اور وہیں کچھ بیر بھی توڑ لئے جن میں سے ایک بیر سے جو انہوں نے روک کر ہم سے حاصل کیا۔ یہ منتے خاں یوں مخاطب ہوئے:"بیل (بیر)! آ ہم تم کو کھائیں" اسی طرح گویا میں بھی زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ "شیر! آ ہم تم کو ماریں" مگر میری قسمت میں تو "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" بھی نہ لکھا تھا تاہم میں بالکل مایوس نہ ہوا اور میرے ضمیر نے مجھے بار بار آواز دینی شروع کی کہ سن پنجاب کو اپنے سپوت سے بڑی بڑی امیدیں ہیں اور سن کہ اگر آج تو نے یو۔پی والوں پر کچھ رعب نہ جمایا تو کل کو خود مختار ہندوستان میں تیرے صوبے کی کیا گت بنے گی۔ اس پر ایک دن صبح کو میں نے ارادہ کر لیا۔ کہ اپنے تئیں سخت خطرے میں ڈال دوں گا مگر خالی ہاتھ واپس نہ آؤں گا۔ سویرے ہی مسٹر ض۔ ا۔ اور میں نکلے ض زادہ نمبر ا نے بھی ہمراہ آنا چاہا میں نے سوچا خوردوں کے سامنے آبرو یہی رہے تو بہتر ہے مسٹر ض کے کان میں پھونک دیا کہ اسے روک دو۔ چھوئی کی ننھی سی ندی کے کنارے گئے۔ پہلے تو ایک جگہ اس کے خشک پاٹ میں گدھوں کا انبوہ دیکھا۔ سمجھے کسی گلئے یا گدھے کی لاش ہوگی۔ قریب آئے تو یہ دیکھ کر جسم میں سنسنی پھیل گئی کہ یہ تو ایک انسان کی لاش ہے۔ پاس چارپائی پڑی ہے۔ کوئی بے رحم ظالم اس غریب کو یہاں لائے۔ ذرا سا گڑھا کھودا تھوڑی سی مٹی اوپر ڈال دی اور چل دیئے۔ گدھوں نے مٹی کرید کر نوچا کھسوٹا اور گھسیٹ کر لاش کو باہر لا ڈالا کھوپری کو اس طرح صاف کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کا پڑا ہوا پنجر ہے لیکن نہیں الامان ابھی ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ تازہ گوشت کے لوتھڑے سے تھے۔ پاس ہی ایک گیدڑ بھی معائنہ کر رہے تھے ہمیں دیکھ کر دوڑے۔ ہم بندوق لئے پیچھے پیچھے ہوئے فیر کیا مگر خالی گیا۔ واپس آئے اور ایک گدھ پر ڈز کیا مگر نتیجہ ندارد مرے ہوئے بھائی کا خون بہا بھی نہ ملا۔ اس کے بعد آگے بڑھے ایک ذرا سی ندی بہہ رہی تھی۔ ایک کوّے کو نشانہ بنایا گیا۔ مگر وہ بھی اڑ گیا۔ پھر اک بیچارہ اُدر ذرا سا لوا بیٹھا دم ہلا رہا تھا میں مار خاں نے شست باندھ کر جو اس کی موت کا حکم دیا تو اس نے فوراً ہی، جان دے دی اور بلا توقف راہیٔ ملکِ عدم ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون اب اس پر ہم نے ازراہِ انکسار لوے مار خاں کا لقب اختیار کیا۔ اور چھوٹتے ہی ایک فاختہ پر کارتوس خالی کر دیا کہ اتنے میں ہاتف نے ذرا دور سے آواز دی کہ ؎

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک ؎ شیر افگن نے اک لوا مارا

(جنگلی ابجد کے حساب سے دیکھئے بلاشبہ ۲۷ فروری ۱۹۳۲ء تاریخ نکلے گی!) جب یہ سنا تو میں نے بھی مناسب جانا کہ فی الحال اپنی بہادری کو ذرا تہ کر کے رکھ لوں۔ بس سمجھ لیجئے کہ میرے لئے

شکار ادرکل کائنات اس کی یہ تھی

ترتیب موضوع میرے سامنے لکھی پڑی ہے۔ اب عنوان نمبر ۶ کی باری ہے "متفرقات اور خاتمہ" متفرق چیزوں میں ترتیب و تدریج کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر بھی یہ سوچتا ہوں کہ کونسی لے لوں کونسی چھوڑ دوں چند مثالیں پیش کرتا ہوں آپ بھی ٹھیک ٹھیک رائے دیجئے۔

مثال نمبر ۱۔ مجھے کالی فاش" اور اس کی بہن کالی موز کی مصاحبت میں زندگی بسر کرتے ہوئے تین چار روز ہو گئے تھے کہ ایک روز پچھلی رات کمرے کے اندھیرے گھپ میں میرے تن بدن میں گویا آگ سی لگ گئی۔ بدن کا رواں رواں العطش الامان پکارنے لگا۔ غالب کی نار بستر، خار بستر، زار بستر والی غزل یاد آ آ کر دماغ میں چکر کھانے لگی کبھی یہ خیال آئے کہ ان "کالیوں" نے غضب کی گرمی طبیعت میں پیدا کر دی ہے۔ اور فرار کی کوئی راہ نہیں چھوڑی کبھی یہ وہم کہ آج سے "جو جنگل کی زندگی پر" مضمون لکھنا شروع کیا تھا اس نے تھکے ماندے دماغ کو پھر بیدار کر دیا ہے اب دوائیں کھانی ترک کر دوں یا مضمون لکھنا بند کر دوں؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ رات بھر اسی طرح بے چینی میں گذری۔ صبح منہ اندھیرے جو مسٹر ض نے پاس کے پلنگ سے السلام علیکم کہہ کر مزاج پرسی کی تو میں نے اپنی رام کہانی کہنی شروع کر دی میں نے ابھی تھوڑا سا قصہ ہی بیان کیا تھا کہ انہوں نے بات کاٹ کر مرض کی صحیح صحیح پیشگی تشخیص کر دی اور مجھے بتایا کہ بھائی صاحب یہ تو میرے ملازمین کی عنایت سے آپ کو ایک "کھٹمل آبادی" چار پائی مل گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یوپی میں ذرا کھٹمل کے لفظ کو سوچ سمجھ کے استعمال کرنا یہ پنجاب کا سا سادہ لوح صاف گو ملک نہیں یہاں کھٹمل کے معنی شیعہ کے ہیں اور پسّو کے معنی سُنی کے (اگر میرا کھٹمل شیعہ نہ تھا بلکہ غالباً کوئی فلسفی دہریہ لینن کا پیرو)

آئندہ میری سوانح عمری لکھنے والے کو ہدایت ہو کہ وہ یہ واقعہ کھٹملان کسی طرح نظر انداز نہ کرے کہ میں جنہیں طبیعی اور دماغی اور شاید روحانی کیفیات سمجھے ہوئے تھا وہ فقط جسمانی واقعات نکلے۔ کہیں باقی ماندہ شعبہ ہائے زندگی کی بھی یہی حالت نہ ہو!

مثال نمبر ۲۔ پاڑل گڑھ کے رستے میں مسٹر ض مع اپنے معاونین کے ایک گاؤں دوہنیا میں ایک معاملہ کی تفتیش کے لئے اترے ہم موٹر میں بیٹھے رہے۔ ہمارے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیوں کا جمگھٹا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک کٹی پھٹی کتاب تھی۔ دیکھا تو ہندی کا قاعدہ ہے میں ہندی پڑھنی نہ جانتا تھا۔ اگرچہ کئی سال سے ہندی کے مختلف قاعدے جمع کرنے میں مصروف رہا تھا لیکن اس کی اب ت کو عبور کرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ چند منٹ سیکھا کتاب کو کتابوں کے پیچھے پھینک دیا۔ پھر سال بھر کے بعد نکالا دو چار حرف اور پڑھے پہلے جو کچھ بھول چکا تھا، اسے پھر دہرایا۔ اور پھر اسی طرح سال بھر کی چھٹی منالی۔ اس سے علم تو نہیں لیکن ایک قسم کا زعم دماغ میں ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ کہ میں ہندی کے حروف کی شناخت کا مادہ رکھتا ہوں۔ یہاں لڑکوں کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ ایک چھ سال کے لڑکے نے ایسے خوب خوب جواب دئے کہ میں نے فوراً اشتہار ڈال دئے اور اُسے اپنا استاد بنا لیا۔ اتنے میں ان کے ماسٹر جی بھی آ گئے ہم نے لڑکوں

لڑکیوں کو پیسہ پیسہ بانٹ کر بقدر ۱/۲ ۲ آنے کے اپنی جیب ہلکی کی۔ اور پھر ماسٹر جی سے پوچھا کہ ہندی قاعدہ کوئی فالتو ہو تو ہم مول لیں گے۔ غرض اُن سے ۱/۲ ۲ آنے میں قاعدہ خرید کر ان سے سارے حروف تہجی ہندی تصویروں کے سامنے لکھے ہوئے प سے لے کر ह تک پڑھ ڈالے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہی اپنا "پاٹھ" پڑھتے ہیں مصطفےٰ کمال کی نئی ٹرکی کی ملکی مشترک تعلیم کا نمونہ آنکھوں میں پھر گیا۔

مثال نمبر ۳۔ ہمارے ایک نوجوان عزیز آکسفورڈ کے تازہ بتازہ "گریجوایٹ" بن کر آئے ہوئے مسٹر ض کے پاس آنے والے تھے۔ ہم انتظار میں ان کی راہ تکتے تھے۔ ان کا پہلا تار آیا جس سے آنے کی امید بندھی۔ دوسرا آیا کہ نہیں آرہا۔ امید ٹوٹ گئی مگر وہ تمام پلاؤ اور وہ پڈنگ اور وہ اور سب کچھ جو ان کی آمد کی تقریب میں بڑی بڑی "شادیانہ" دیگوں میں بھک بھک پک رہا تھا ہمارے جسم و جان اور ہمارے قلب و روح کا جزو لاینفک بن گیا۔

مثال نمبر ۴۔ جھوئی کے بنگلے میں مسٹر ض موٹر سازی کے کام میں مصروف تھے۔ کہ بین جی اور ایک بھان متی آنازل ہوا۔ اس نے تقریریں کیں، کرتب دکھائے، سرٹیفیکیٹ دکھائے، جھوٹ سچ ملایا لیکن دو ایک کرتب واقعی ایسے حیرانی میں ڈال دینے والے تھے کہ اسے انعام دے کر ہمیں نے کہا کہ اگر ہمیں یہ کوڑی والا کرتب سکھا دو تو ہم تم کو بڑا عمدہ اس سے بھی بڑے کاغذ پر ایک "سارٹی فکٹ" دیں۔ آخر "سارٹی فکٹ" اور بسکٹ کے ایک خالی ٹین پر سودا ہو گیا کرتب یہ تھا کہ زمین میں ایک تنکا گاڑ کر اس پر ایک کوڑی رکھ دی جاتی تھی۔ پھر جب بھان متی صاحب اس پر تقریر کرتے اور پانی چھڑکتے تھے تو وہ کوڑی چاروں طرف گھومتی تھی اور "سلام کرتی تھی"۔ اب اس کرتب کا مکمل علم راقم کے قبضے میں ہے جو صاحب ایک "سارٹی فکٹ" اور بسکٹ کا ایک خالی ٹین ہمایوں کے دفتر میں روانہ فرمائیں گے انہیں راقم اپنا تلمیذ الرحمٰن بنانے کے متعلق ہمدردی کے ساتھ غور وخوض کرے گا یہ ہے جنگل کی زندگی اور یہ ہے جنگل کی زندگی پر میرا مضمون کہ

تمت بالخیر

۲۶ ر فروری ۱۹۳۲ء

بشیر احمد

ضمیمہ

شیر کا شکار

بس اے نا امیدی نہ اب دل بڑھا تو
مجھے شکل اے شیر اپنی دکھا تو

ترے دم سے زندوں کو غش آگیا ہے
بہت بھینسوں کٹروں کو تو کھا گیا ہے

مگر آگئی آج تیری بھی باری
شکاری کا ہو تو شکار اے شکاری

مضمون فروری کے ساتھ ختم ہوا یکم مارچ گویا چھٹی کا دن تھا۔ صرف صبح کو میں مضمون کو دہرا رہا تھا۔ اسی میں ساڑھے
بارہ ایک بج گیا۔ میں غسل میں تھا کہ باہر سے آواز آئی بھائی صاحب شیر نے "لاش کردی"۔ معلوم ہوا کہ چند روز ہوئے
جو مسٹر ض نے میرا شیر کا شوق دیکھا۔ تو حکم دے دیا کہ بہت سے کٹڑے باندھے جائیں اس کے متعلق ابھی خبر آئی ہے۔ کہ شیر نے
لاش کردی یعنی ایک کٹڑا مار دیا۔ شیر کے شکار کا خیال مؤید غسل اور محرکِ حیات ثابت ہوا۔ نہانے میں کپڑا پہننے میں ذرا سانس لینے
میں بھی ایک لطف تھا۔ شائد ناموری کا ایک آسان رستہ مل گیا۔ کیونکہ مسٹر ض نے ایک روز بڑی سنجیدگی سے بتایا تھا کہ جو
شیر مہمان کے ہوتے مارا جائے وہ مہمان کا "شیر" ہوتا ہے۔ رام نگر سے سات میل پر سانولدیہ کے گاؤں کے قریب جنگل میں شیر
نے لاش کردی تھی۔ موٹر میں دھکے کھاتے جنگل کے عین بیچ میں جا پہنچے۔ ایک ٹھاکر صاحب شکاری بھی ساتھ تھے۔ وہ پہلے
سے جا کر مچان بندھوا رہے تھے۔ موٹر سے اتر کر ہم ہاتھی پر گئے۔ اور موقع پر جا پہنچے۔ جنگل کے بیچوں بیچ ایک ندی کا خشک
پتھریلا پاٹ تھا۔ اس کے دونوں طرف گھنے درخت، درختوں کے آگے ندی کی طرف کو کچھ سرکنڈے۔ اس ندی کے کنارے
پر مچان بندھے۔ ٹھاکر صاحب ایک درخت پر مسٹر ض زادہ نمبر ۱ اور میں دوسرے درخت پر اپنے اپنے مچان پر اپنی اپنی بندوق
لئے بیٹھ گئے۔ ہاتھی رخصت کر دئے گئے۔ ہدایت ہوئی کہ چپ سادھ لو دم نہ مارو اس طرح جیو گویا مردہ ہو۔ شیر کا شکار یوں ہوتا ہے
بیل کے ایک درخت کے ساتھ کچنار کا ایک درخت لپٹا ہوا تھا۔ زمین سے پندرہ ندی سے سترہ فٹ کی بلندی پر ہمارے مچان
ان دو ملے جلے درختوں کے ایک دوشاخے میں بندھے ہوئے تھے میزبان میزبان زادہ اور مہمان بیک وقت یک جا اپنے "تخت سلیمان"
پر نشستہ جنگل کے بادشاہ پر یلغار کرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ چپ چاپ ہمتین، شیر سے کو لگائے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہم تینوں ٹس سے مس نہ ہوئے۔
شیر کے لئے تین چوتھائی گھنٹے بھی انتظار کرنا پڑتا تو کچھ بہت نہ تھا۔ مچان شاخوں میں چھپے چھپائے تین آدمی جھانک رہے ہیں کبھی دائیں کبھی بائیں کبھی آگے کبھی پیچھے
سامنے نیچے ندی کے پتھروں پر بیچارا مردہ کٹڑا پڑا ہوا۔ ندی کے سامنے کنارے پر اسے ایک بڑے درخت کے گرے ہوئے تنے سے
باندھا گیا تھا۔ شیر نے رات "لاش کردی"۔ شیر کا قاعدہ ہے کہ پہلے وہ اپنے شکار کی گردن دبوچتا ہے۔ گلا گھونٹ کر مار دیتا ہے کچھ
خون پیتا ہے اور پیچھے کا حصہ پھاڑ کر کچھ کھا لیتا ہے۔ اور پھر کھینچ کر اسے ذرا دور کسی محفوظ جگہ میں رکھ دیتا ہے اور دوسرے
روز اکثر شام کو کبھی رات کو آ کر باقی ماندہ کو اطمینان کے ساتھ ختم کرتا ہے یہی اس کٹڑے کا حال ہوا۔ شیر نے اسے مار کر کچھ کھا
کر اسے کھینچا۔ اور چونکہ وہ ایک موٹے رسے سے تنے کے ساتھ بندھا تھا تنے سمیت اسے کھینچ کر چاہا کہ کسی محفوظ مقام میں اسے رکھ
دے۔ مگر یہ نہ ہو سکا تو ندی کے عین درمیان اسے چھوڑ دیا۔ تنا بہت بھاری تھا بڑا طاقتور شیر ہوگا جو اتنے بوجھ کو یہاں تک
بھی کھینچ لایا یا ممکن ہے کہ پاس کی سڑک سے صبح ہوتے گاڑیبانوں کے شور سے ڈر کر وہ کنارہ کر گیا ہو۔ بہرحال اسے شام کے وقت
پھر اپنی "لاش" پر آنا تھا سو ہم اپنی کمین گاہ میں بیٹھے شکار کرنے لگے۔ بات چیت بند، کھانسنا بند، ہلنا جلنا بند، صرف دل کے
اندر کی گھبراہٹ اور اس کی بھی کھلی اجازت نہیں پانچ دس پندرہ بیس منٹ ـــــ اگر شیر ابھی آ جائے تو گویا گھر بیٹھے
شیر کا شکار ہو گیا۔ وہ دیکھئے ایک نیولا ندی کے اس کنارے سے آیا۔ ادھر دیکھا ادھر دیکھا اوپر دیکھا ہم سے آنکھیں چار ہوئیں

—— جنگل سنسان ہے پہلے ٹھہرا پھر آگے بڑھا پھر ٹھہرا، پھر بڑھا، لاش سے دور ہی دور رہا، پھر دیکھا کہ اس سے ذرا پرے وہاں جہاں خون کے نشان تھے۔ اک ذرا سا لوتھڑا ہے اسے لیا اور بھاگا سرکنڈوں کی طرف واپس —— آدھ گھنٹہ پینتیس منٹ چالیس پچاس پچپن —— ادھر داہنی طرف دور ندی میں ایک مور اور اُن کی مورنی اکٹھے چلائے پی کر گلگشت کو نکلے مٹک مٹک کر اک انداز سے آگے مورنی صاحبہ پیچھے مسٹر مور چلے۔ اور جنگل کی دوسری طرف غائب ہو گئے —— ایک گھنٹہ سوا گھنٹہ —— خاموشی —— کبھی کبھی کسی چڑیا کی آواز —— بارش کی چند بوندیں، بارش آ گئی تو کیا کریں گے خیر تھوڑی سی ہو گئی تو حرج نہیں —— ہوا خوب چل رہی تھی جنگل میں پتوں کی سرسراہٹ کا شور تھا، مسٹر ض نے مجھے کان میں کہا۔ یہ سارا موسم شیر کے شکار کے لئے خوب موافق ہے۔ زور کی ہوا کے باعث شیر کو آدمی کی بو نہیں آتی۔ نہ پتوں کی سرسراہٹ میں اسے ہماری جنبش کا احساس ہو سکتا ہے۔ . . . پھر خاموشی پھر ہلنا جلنا بند۔ . ایک ٹہنی کے ٹوٹنے کی آواز! —— ایں یہ کیا ہے؟ شیر؟ —— نہیں! پاس کے درخت پر بہت سے گدھ بیٹھے ہیں صبح سے مُردار کے پاس کے درختوں پر متفکرانہ بیٹھے تھے۔ ان کی جنبشیں ہیں۔ —— مجھے بتایا گیا کہ جنگل کے پرندے تک بھی جب شیر کہیں قریب ہو اس کی لاش کے پاس نہیں پھٹکتے "بادشاہ" کے مال پر رعایا دست درازی نہیں کر سکتی —— ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا۔ خاموشی! سورج غروب ہو رہا تھا، بس مسٹر ض نے کہا یہ ہے شیر کے آنے کا وقت۔ اب چپ بیٹھے رہئے —— میں پہلے سے چپ تھا۔ میں جو کبھی اپنے خیالوں سے رہائی نہ پا سکتا تھا۔ اس وقت شیر کے خیال سے رہائی نہ پا سکتا تھا کبھی کبھی ضرور اپنی آئندہ زندگی کے منصوبے دماغ میں گھوم جاتے تھے۔ یہ کروں گا یہ نہ کروں گا۔ یوں اپنے آپ کو "ٹھیک" کر دوں یوں "غلط" نہ ہونے دوں۔ بس واپس جاتے ہی اپنا رویہ اس طرح کا بنا لوں گا۔ نہیں نہیں استقلال کے ساتھ کروں گا جو کچھ بھی کر سکوں گا! —— یک لخت ایک مور کی آواز پھر ایک دوسرے مور کی، پھر بہت سے موروں کی آواز ڈری ہوئی آوازیں —— مسٹر ض نے مجھے چھوا۔ ذرا اشارہ کیا پھر کان میں کہا یہ ہے شیر کے آنے کی نشانی کہ جانور بولنے لگتے ہیں —— ایک کاکڑ (ہرن) کی آواز —— پھر موروں کی آوازیں —— پھر خاموشی، دس منٹ تک پوری خاموشی۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا جھاڑیوں میں درختوں کے نیچے ندی کے پار کہیں کچھ بھی نہ تھا۔ —— دور کہیں ایک آواز سی ہاں پھر ایک اسی طرح کی دبی ہوئی سی دھاڑ! دھاڑ! —— شیر شیر! بس اب تھوڑی دیر میں —— خاموشی، انتہا کی خاموشی —— کچھ نہیں پھر کچھ نہیں۔ دو سوا دو ڈھائی گھنٹے گذر گئے تھے ——

اندھیرا ہونے لگا، ہو گیا —— اب کچھ نظر بھی نہ آتا تھا —— بس ایسے وقت میں شیر آیا کرتا ہے۔ —— وہ کیا ہے؟ کالا کالا سا بڑا بڑا! شیر؟ نہیں سرکنڈے کے پاس کی جھاڑی ہے اور کچھ نہیں! —— شور ہوا، جھاڑیوں میں سرسراہٹ کھٹ کھٹ جھر جھر! —— چپکے بیٹھے رہو! —— سیٹی کی آواز! —— ایں یہ کیا؟ —— وہ جو ہاتھی والوں کو کہہ رکھا تھا کہ ۱/۲ ۷ بجے آ جانا یہ تو وہ لوگ ہیں! —— بس ڈراپ سین، شیر کا شکار ہو چکا، شیر کا کھانا شیر کے

لئے چھوڑ دیئے اور آپ اپنے گھر کی طرف منہ موڑ دیئے مسٹر ض بہت مایوس ہوئے میری خاطر میں نے کہا بھائی صاحب ملول نہ ہو جیئے۔ مجھ سے شکاری کے لئے یہی کیا کم ہے۔ یہ "ری ہرسل" تھا اگلی دفعہ اصلی کھیل ہوگا۔

سو قارئین بھی متنبہ ہوں کہ یہ "شیر کا شکار نمبر ۱" تھا۔ آیندہ مضمون ہوگا شیر کا شکار نمبر ۲۔ اس میں شیر آئے گا۔ مگر ہمیں سونگھ دیکھ کر دُم دبا کر بھاگ جائے گا۔ پھر مضمون ہوگا "شیر کا شکار نمبر ۳" اس میں شیر آئے گا اپنی لاش کے قریب آئے گا کہ ہم گولی چلا دیں گے۔ گولی شیر کی دم سے ½ انچ کے فاصلے پر زن سے نکل جائے گی۔ شیر کا دل دھڑکنے لگ جائے گا اور وہ نعوذ باللہ کہتا ہوا چل دے گا۔ اخیر میں "شیر کا شکار نمبر ۴ ہوگا" اس میں کٹرہ بندھے گا۔ "لاش ہوگی" مچان بندھے گا۔ ہم بیٹھیں گے شیر آئے گا، کٹرہ کھائے گا، ہم گولی چلائیں گے، اس کی گردن میں لگے گی۔ وہ غوغو کرتا گر جائے گا، ہم نیچے اتریں گے، فوٹوگرافر کا پہلے سے انتظام ہوگا، سو ہمارا اور ہمارے گولی مارنے والے دوست کا مع شیر نر کے فوٹو کھینچے گا۔ جس کا بلاک تیار کرکے ہمایوں میں تصویر دی جائے گی۔ تاکہ دنیا بھر میں ہماری دلیری اور ہماری دیانت داری کا بول بالا ہو جائے اور تاکس نہ گوید بعد ازیں ــــــــ کچھ بھی !!!

۲ر مارچ ۱۹۳۲ء

د۔ ب

چاند اور سمندر

مرے محبوب تو ہے ماہِ تاباں میں سمندر ہوں

بپا ہوتا ہے طوفانِ تمنا میرے سینے میں ⁂ شعاعیں قلزمِ دل میں تری جب مسکراتی ہیں

ترے جلووں سے ہم آغوش ہوتی ہیں مری موجیں ⁂ چٹانیں اضطرابِ زندگی میں ڈوب جاتی ہیں

تو جب روپوش ہوتا ہے مرا دل بیٹھ جاتا ہے ⁂ پرانی صحبتیں اُس وقت اکثر یاد آتی ہیں

اندھیری رات کے منظر سے میرا دل لرزتا ہے ⁂ مجھے کالی چٹانیں ہر طرف آنکھیں دکھاتی ہیں

مرے محبوب تو ہے ماہِ تاباں میں سمندر ہوں

ترجمہ

جاذب
(دہلوی)

بیزاری

اے کاش! نہ یہ گلشنِ اسرار بناتے
اے کاش! نہ یہ وادیٔ پُرخار بناتے

گر یونہی بن آتی تھی کہ ناچار بناتے
اے کاش! نہ میرا دلِ بیزار بناتے

"ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے
سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے"

کلیاں نہ چٹکتیں کبھی اور گُل نہ مہکتے
شاخیں نہ لہکتیں کبھی بلبل نہ چہکتے

سورج نہ چمکتا کبھی تارے نہ دمکتے
مجھ ایسے زمانے میں جو دو چار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے
سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے

کس واسطے اٹھا مرے ہونے کا یہ جھگڑا
پانے کا کہیں اور کہیں کھونے کا یہ جھگڑا

یہ پار لگانے کا ڈبونے کا یہ جھگڑا
اے کاش نہ یہ دامِ دل آزار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے
سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے

اقرار مرا کر کے وہ انکار ہوئے خود ۔۔۔ اک راز سا ناقابلِ اظہار ہوئے خود

اِس پار مجھے پھینک کے اُس پار ہوئے خود ۔۔۔ اے کاش مکاں میرا بھی اُس پار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے

سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے

کیوں مجھ کو لگایا ہے یہ آزارِ جہاں کا ۔۔۔ اے کاش نہ ہوتا میں گرفتارِ جہاں کا

بیمارِ ازل ہو گیا بیمارِ جہاں کا ۔۔۔ اے کاش وہ اپنا مجھے بیمار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے

سو بار مٹاتا میں جو سو بار مٹاتے

اس گلشنِ فانی میں کہاں بوئے حقیقت ۔۔۔ یہ رستہ کہاں جائے بھلا سوئے حقیقت

ظاہر میں ہوا جب سے چھپا روئے حقیقت ۔۔۔ اِس کذب کو ناقابلِ اظہار بناتے

ہستی کا جو اپنی مجھے مختار بناتے

سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے

ح ۔ ب

جبر کی شادی

مولیئر نے شاہِ فرانس لوئی چہاردہم کے دربار کی تفریح کے لئے بہت سے فرحیہ ڈرامے لکھے ہیں۔ یہ ڈراما اُس کے ایک ایکٹ کے تمام ڈراموں میں بہترین تسلیم کیا گیا ہے۔ مولیئر کے کردار زندہ کردار ہُوا کرتے تھے۔ چنانچہ اس ڈرامے میں اِن اُس نے اپنے بعض ہمعصر درباریوں کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ جب یہ ڈراما ایکٹ کیا گیا تو خود بادشاہ نے اس میں ایک جپسی کا پارٹ ادا کیا۔

سینیرل (منظر کے پیچھے سے یہ کہتا ہُوا داخل ہوتا ہے) میں ابھی واپس آیا۔ گھر کا اچھی طرح سے خیال رکھنا۔ اور دیکھو، کسی بات میں بے قاعدگی واقع نہ ہو۔ اگر کوئی روپیہ لے کر آئے۔ تو مسٹر جرمینو کے ہاں سے مجھے بلا لینا۔ اور اگر کوئی تقاضا کرنے آئے تو اس سے کہہ دینا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اور آج واپس نہیں آئیں گے۔

جرمینو۔ (سینیرل کے آخری الفاظ سن کر) نہایت دانشمندانہ فرمان ہے۔

سینیرل۔ آہ! جرمینو! خوب ملے۔ میں تمہارے ہی ہاں جا رہا تھا۔

جرمینو۔ کیا ارشاد ہے؟

سینیرل۔ میں تمہیں اپنے دل کی ایک بات بتانا چاہتا تھا اور اُس کے متعلق تمہاری رائے حاصل کرنا چاہتا تھا

جرمینو۔ بڑی خوشی ہے۔ اچھا ہُوا کہ ملاقات ہو گئی۔ اب یہیں اطمینان سے گفتگو کر لیتے ہیں۔

سینیرل۔ نہیں نہیں، تنہائی میں چلو۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ اور دوستوں سے مشورہ کر لینا اچھا ہوتا ہے۔

جرمینو۔ اس عنایت کا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مشورے کے لئے مجھے انتخاب کیا۔ اچھا، اب بتاؤ، بات کیا ہے؟

سینیرل۔ مگر سب سے پہلے میں تم سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس معاملے میں محض میری دلداری کو ملحوظ نہ رکھنا بلکہ اپنی صحیح صحیح رائے سے مجھے آگاہ کر دینا۔

جرمینو۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے کیا تامل ہو سکتا ہے۔ میں صاف صاف اپنی رائے ظاہر کر دوں گا۔

سینیرل۔ وعدہ کرو۔

جرمینو۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ مگر بتاؤ معاملہ کیا ہے۔

سینیرل۔ میں تم سے اس معاملے میں رائے لینا چاہتا

ہوں کہ اگر میں شادی کروں تو ہرج ہی کیا ہے؟

جرمینو۔ کون؟ تم؟

سینیرل۔ ہاں میں خود۔ تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو؟

جرمینو۔ سب سے پہلے میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں

سینیرل۔ وہ کیا؟

جرمینو۔ تمہارے خیال میں اب تمہاری عمر کیا ہوگی۔

سینیرل۔ میری؟

جرمینو۔ ہاں تمہاری۔

سینیرل۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنی عمر کچھ معلوم نہیں۔

جرمینو۔ سینیرل، تمہاری عمر باون ترپن سال کے قریب ہوگی۔

سینیرل کس کی؟ میری؟ نہیں، یہ ہو نہیں سکتا۔

جرمینو۔ اور اس لئے جیسا کہ تم نے مجھ سے درخواست کی تھی میرا صاف صاف دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ شادی کرنا تمہارے لئے مفید نہ ہوگا۔ تفصیل سے بچنے کے لئے میں صرف چند الفاظ میں اپنا خیال تم پر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ شادی کا خیال بھول کر بھی دل میں نہ لانا۔ اگر اس وقت تک آزاد رہنے کے بعد اب تم دنیا کی ان تمام زنجیروں سے زیادہ بوجھل زنجیروں کو اپنے پاؤں میں ڈال لوگے تو میں سمجھوں گا کہ تم سے بڑھ کر نادان بھی کوئی نہیں

سینیرل۔ اور میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اور وہ لڑکی ایسی ہے کہ اُس سے شادی کر لینا غیر دانشمندی ہرگز نہیں

جرمینو۔ اوہ، تو یہ اَور بات ہے۔ یہ تم نے مجھ سے کب کہا تھا؟

سینیرل۔ مجھے لڑکی بے حد پسند ہے، اور میں اُسے دل و جان سے چاہتا ہوں۔

جرمینو۔ تم اُسے دل و جان سے چاہتے ہو؟

سینیرل۔ بے شک۔ اور میں نے اُس کے باپ کو بھی رضامند کر لیا ہے۔

جرمینو۔ اُس کے باپ کو بھی رضامند کر لیا ہے؟

سینیرل۔ ہاں۔ شادی آج شام کو ہونے والی ہے، اور میں قول دے چکا ہوں۔

جرمینو۔ تو پھر شادی کرلو۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

سینیرل۔ ذرا سوچو تو سہی، میں اپنے ارادے کو کیونکر بدل سکتا ہوں۔ جرمینو کیا تمہارا خیال ہے کہ میں اب شادی کے قابل نہیں رہا؟ اس کو جانے دو کہ میری عمر کیا ہے۔ یہ دیکھو کہ حالات کیا ہیں۔ کیا تمہیں کوئی تیس سال کا جوان بھی مجھ سے زیادہ تر و تازہ اور مجھ سے زیادہ سرگرم کار نظر آتا ہے؟ کیا میں اپنے اعضا سے پہلے کی بہ نسبت اب کچھ کم محنت لیتا ہوں؟ کیا میری شکل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے اب جانے آنے کے لئے گاڑی یا آرام کرنے کے لئے کرسی کی ضرورت ہے

جرمینو۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ ضرور شادی کرو یہ تمہارے لئے نہایت مناسب ہے۔

سینیرل۔ پہلے مجھے اس بات میں شرم دامنگیر ہوتی تھی۔ لیکن اب میرے پاس اس کے حق میں زبردست

وجوہ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے کتنی خوشی ہوگی
جب میں تھکا ہوا ہوں گا، اور ایک بیوی میری
خدمت گزاری اور نازبرداری کے لئے میرے
پاس ہوگی۔ اور اس خوشی کو چھوڑ کر بھی میں سمجھتا
ہوں کہ میرے اسی حالت میں رہنے سے ایک
اچھے خاندان کی نسل منقطع ہوجائے گی۔

جرمینو۔ واقعی اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہوسکتی اور
میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں۔ کہ جس قدر جلد بھی
ممکن ہوسکے۔ شادی کرلو۔

سینیرل۔ سچ کہتے ہو؟ تمہارا یہی مشورہ ہے؟

جرمینو۔ یقیناً اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں۔

سینیرل۔ میں خوش ہوں کہ تم نے ایک سچے دوست کی طرح
مجھے یہ مشورہ دیا۔

جرمینو۔ بھلا یہ تو بتاؤ، وہ خاتون ہے کون جس سے تم شادی
کررہے ہو؟

سینیرل۔ ڈوری مین۔

جرمینو۔ وہ نوجوان، خوش پوش، خوش گفتار لڑکی؟

سینیرل۔ ہاں۔

جرمینو۔ الکینڈر کی بیٹی؟

سینیرل۔ وہی وہی۔

جرمینو۔ السیڈاس کی بہن، جو بڑا شمشیرباز بنتا ہے؟

سینیرل۔ بس وہی۔

جرمینو۔ واہ!

سینیرل۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

جرمینو۔ بڑی اچھی بات ہے۔ جلدی کرو اور شادی کرلو

سینیرل۔ کیا میں نے بہترین انتخاب نہیں کیا؟

جرمینو۔ اس میں کیا شک ہے۔ بہت اچھا جوڑ ہے اب
وقت نہ گنواؤ۔

سینیرل۔ جو کچھ تم نے کہا اس سے مجھے بے پایاں مسرت
حاصل ہوئی۔ میں تمہارے مشورے کا شکریہ
ادا کرتا ہوں اور میں تمہیں آج رات اپنی شادی
پر مدعو کرتا ہوں۔

جرمینو۔ میں ضرور آؤں گا۔

سینیرل۔ خدا حافظ!

جرمینو۔ (الگ) نوجوان ڈوری مین، الکینڈر کی بیٹی سینیرل
سے بیاہی جائے گی۔ جس کی عمر ترپن سال کی ہے
آہ کیسی عجیب شادی ہے کیسی عجیب شادی ہے! (وہ
جاتے ہوئے اس فقرے کو بار بار دہراتا ہے)

سینیرل (تنہا) یہ شادی ضرور خوشگوار ثابت ہوگی۔ کیونکہ
ہر کوئی اس کے متعلق سن کر خوشی کا اظہار کرتا ہے
جس کسی سے میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ وہ ہنس
پڑتا ہے۔ میں کیسا خوش قسمت انسان ہوں!

* * * * *

ڈوری مین۔ (اپنے ملازم چھوکرے سے) دیکھو، لڑکے،
انسانیت سے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ، اور
شرارت مت کرو۔

سینیرل۔ (الگ۔ ڈوری مین کو دیکھ کر) وہ آرہی ہے میری
بانو آرہی ہے۔ آہ اس کی صورت کتنی خوش آئند
ہے! اس کی ادا میں کتنا حسن ہے! اس کے
قامت میں کیسی رعنائی ہے! اسے دیکھ کر کون

اس سے شادی کرنا چاہے گا۔ (اس کے قریب جا کر)
کہاں جا رہی ہو میری حسینہ، میری پیاری، میری
بیوی؟

ڈوری مین۔ میں کچھ چیزیں خریدنا چاہتی تھی۔

سینیرل۔ بہت اچھا، میری پیاری، اب ہم دونوں کو خوشی
نصیب ہونے والی ہے۔ اب جلد ہی مجھے وہ اختیار
حاصل ہونے والا ہے کہ میں تمہیں پیار کر سکوں گا، تمہیں
سینے سے لگا سکوں گا اور تمہیں کسی چیز سے مجھے محروم
رکھنے کا حق نہیں ہوگا۔ کیا تم اس شادی سے خوش
نہیں ہو۔ میری پیاری؟

ڈوری مین۔ یقین مانو، بے اندازہ خوش۔ کیونکہ میرے باپ
نے اب تک مجھ پر بدترین پابندیاں عائد کر رکھی تھیں
میں نہیں جانتی کہ کب سے میں اپنی آزادی کا غم کھا
رہی ہوں، کب سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ میری
شادی ہو جائے تاکہ میں اس عذاب سے نجات پاؤں
اور اپنے اختیار سے جو چاہوں کروں۔ خدا کا شکر ہے
کہ اُس نے تمہیں بھیجا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی
آئندہ زندگی کامل آزادی اور مسرت میں گزاروں
تاکہ گذشتہ کی کچھ تلافی ہو سکے۔ چونکہ تم ایک متمدن
اور شائستہ انسان ہو اور تم نے دنیا کو اچھی طرح
دیکھا ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ ہم دونوں
کی خوب نبھے گی۔ اور تم ان شوہروں کی طرح نہ ہوگے
جو جان کا آزار بن جاتے ہیں۔ اور اپنی بیویوں کو خوشی
کا ایک سانس تک نصیب نہیں ہونے دیتے۔ مجھے
اقرار ہے کہ میں ایسی زندگی بسر نہیں کر سکتی تنہائی
مجھے دیوانہ بنا دیتی ہے مجھے شرطیں بدنے میلوں تماشوں
میں جانے، سیر کرنے غرض کہ ہر قسم کی تفریح سے دلچسپی
ہے۔ مجھ سی بیوی پا کر تم بے انتہا خوش ہوگے ہمارے
درمیان کبھی اختلاف پیدا نہ ہوگا۔ میں تمہارے
معاملات میں کبھی دخل نہیں دوں گی۔ اور مجھے
امید ہے کہ اسی طرح تم بھی مجھے کسی بات میں مجبور
نہیں کروگے۔ مجھ سے پوچھو تو میں تو یہ چاہتی ہوں
کہ ہم مروت کو اپنا شعار بنائیں اور شادی کر کے
ایک دوسرے کے لئے سوہانِ رُوح نہ بن جائیں۔
مختصر یہ کہ جب ہم شادی کریں تو ہم دو ایسے
شخصوں کی طرح رہیں سہیں جنہوں نے دنیا کو
دیکھا ہو۔ رشک و حسد ہمارے دماغوں کو پریشان
نہ کریں بلکہ تمہیں میری وفا پر اعتماد ہو اور یوں مجھے
تمہاری وفا پر اعتماد کرنے کا موقع ملے۔ مگر یہ کیا بات
ہے؟ تمہارا چہرہ تبدیل کیوں ہو رہا ہے؟

سینیرل۔ میرے سر میں یکایک درد شروع ہو گیا ہے۔

ڈوری مین۔ ہاں ان دنوں یہ روگ بہت سے لوگوں کو ہو
رہا ہے۔ لیکن ہماری شادی سے یہ سب تکلیفیں
دور ہو جائیں گی۔ خدا حافظ۔ مجھے ایک موزوں سے
لباس کی ضرورت ہے۔ تاکہ میں ان چیتھڑوں کو
اُتار کر پھینک سکوں جن جن چیزوں کی مجھے ضرورت
ہے وہ میں آج خرید لوں گی اور بل تمہاری طرف
بھجوا دوں گی۔

* * * * * * * * *

جرمینو اور سینیرل

جرمنیو۔ آہ! سینیرل، میں خوش ہوں کہ تم سے یہاں ملاقات ہوگئی۔ میں ایک جوہری سے ملا ہوں جس نے یہ سن کر کہ تم اپنی بیوی کو تحفے کے طور پر دینے کے لئے ایک انگوٹھی کی تلاش میں ہو مجھ سے اپنی دوکان کی سفارش کرنے کو کہا ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ دنیا بھر میں ایسی نفیس انگوٹھی نہیں مل سکے گی۔

سینیرل۔ خدا کا نام لو! مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔

جرمنیو۔ کیوں؟ اس کے کیا معنی؟ وہ گرمجوشی کیا ہوئی جو تم ابھی ابھی دکھار ہے تھے؟

سینیرل۔ گذشتہ چند لمحوں میں مَیں شادی کے متعلق کسی قدر متامل ہوگیا ہوں۔ اب کوئی مزید کارروائی کرنے سے پیشتر میں اس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں میں اُس خواب کی تعبیر معلوم کرنا چاہتا ہوں جو میں نے گذشتہ رات دیکھا تھا اور جو مجھے ابھی ابھی یاد آیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے خواب بمنزلہ آئینوں کے ہیں، جو بعض اوقات مستقبل کی تصویر من و عن کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ سمندر میں طوفان آرہا ہے۔ اور میں ایک جہاز میں سوار ہوں اور . . .

جرمنیو۔ سینیرل، مجھے ایک سخت ضروری کام ہے اس لئے میں تمہارا خواب سننے کے لئے ٹھہر نہیں سکتا میں خوابوں کو سمجھتا بھی نہیں۔ شادی کے مسئلے کے حل کی میں تمہیں ایک تدبیر بتاتا ہوں۔ تمہارے گھر کے ساتھ ہی دو بڑے فاضل فلسفی رہتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں تمہیں مشورہ دینے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں چونکہ دونوں کا مسلک ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس لئے تم اُن کی مختلف آرا کا آپس میں مقابلہ کر سکتے ہو۔ رہی میری رائے تو میں کہہ چکا ہوں کہ اس وقت مجھے فرصت نہیں۔ یوں میں تمہارا خادم ہوں۔

سینیرل۔ (تنہا) وہ سچ کہتا ہے۔ اس بیم و رجا کی حالت میں مجھے ان لوگوں سے ضرور مشورہ لینا چاہئے۔

* * * * * * *

پنکریس۔ ایک فلسفی (اندر کسی شخص سے بول رہا ہے اور سینیرل کو اُس نے نہیں دیکھا) جاؤ میرے دوست جاؤ۔ تم ایک گستاخ آدمی ہو۔ تم کلمات کی ترکیب و ترتیب سے قطعاً نابلد ہو۔ تم جمہوریہ ادبیات سے خارج کر دینے کے قابل ہو۔

سینیرل۔ شکر ہے، ایک تو وقت پر ملا۔

پنکریس۔ (پہلے کی طرح، اور سینیرل کو نہ دیکھتے ہوئے) ہاں میں اپنے قول پر نہایت مضبوطی سے قائم ہوں میں فلسفیوں کے فلسفی ارسطو کی حکمت کے رو ثابت کروں گا کہ تم جاہل ہو، مجہول ہو، اجہل ہو، بلکہ جہل کے مادہ سے جتنی صفات بھی وضع ہو سکتی ہیں۔ وہ سب تم پر صادق آتی ہیں۔

سینیرل۔ کسی سے اس کا جھگڑا ہوگیا ہے (پنکریس سے) جناب عالی!

پنکریس۔ (بدستور، اور سینیرل کو نہ دیکھتے ہوئے) تم بزعم خود بحث کر رہے ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم بحث کے اوّلیں اصول سے بھی ناواقف ہو۔

سینیرل۔ غصہ اسے میری طرف دیکھنے میں مانع ہے (پنکریس

سے) جناب عالی!

پنکریس۔ (بدستور، اور سینیرل کی طرف نہ دیکھتے ہوئے) یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ فلسفے کے جملہ مسالک نے اسے معیوب قرار دیا ہے۔

سینیرل۔ (الگ) معلوم ہوتا ہے کہ اسے سخت دق کیا گیا ہے (پنکریس سے) میں کہتا ہوں . . . .

پنکریس (بدستور، اور سینیرل کی طرف نہ دیکھتے ہوئے) اختلافِ عظیم، اختلافِ زمین و آسمان۔

سینیرل۔ علامۂ زماں، میں آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوں!

پنکریس۔ میں آپ کا خادم ہوں۔

سینیرل۔ کیا میں . . . . .

پنکریس۔ (دوبارہ مڑکر) تمہیں معلوم ہے۔ تم کس چیز کے مرتکب ہوئے ہو؟ تم نے ایک قضیۂ منطقیہ پیدا کر دیا ہے۔

سینیرل۔ میں . . . . . .

پنکریس۔ (پہلے کی طرح) کبریٰ مہمل ہے، صغریٰ لغو ہے اور نتیجہ مضحکہ خیز ہے۔

سینیرل۔ میں . . . . .

پنکریس۔ (بدستور) میں مر جاؤں گا لیکن تسلیم نہیں کروں گا؛ اور جب تک میرا قلم ٹوٹ نہ جائے میں اس کے خلاف تبلیغ کرتا رہوں گا۔

سینیرل۔ کیا میں . . . . .

پنکریس۔ (بدستور) میں اپنے دعوے کی حمایت میں جان تک لڑا دوں گا۔

سینیرل۔ ارسطوئے زماں، کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کی اس برہمی کا باعث کون سی بات ہوئی ہے؟

پنکریس۔ اس کے لئے معقول ترین وجوہ موجود ہیں۔

سینیرل۔ لیکن کیا؟

پنکریس۔ ایک جاہل نے اپنے غلط دعوے پر قائم رہنے کی جرأت کی تھی، خوفناک، خطرناک، مکروہ دعوے پر۔

سینیرل۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ دعویٰ کیا تھا؟

پنکریس۔ آہ سینیرل، ہر چیز آج کل تہ و بالا ہو رہی ہے ساری دنیا بد اعمالی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہر جگہ ہیبت ناک بغاوت کی حکومت ہے۔ مجسٹریٹوں کو جو ملک میں قیامِ امن کے لئے متعین ہیں شرم سے مر جانا چاہیے کہ وہ ایسی ناقابلِ برداشت بد دیانتیوں کے متحمل ہو رہے جس کا بیان میں ابھی کروں گا۔

سینیرل۔ تو وہ کیا ہے؟

پنکریس۔ کیا یہ خوفناک بات نہیں، کیا خدائے قہار کا انتقام اس بات کے لئے بے قرار نہیں کہ کسی شخص کو "ٹوپی کی شکل" کہنے کے آزاد چھوڑ دیا جائے؟

سینیرل۔ کیسے؟

پنکریس۔ میرا دعوےٰ ہے کہ ہمیں "ٹوپی کی صورت" کہنا چاہئے "ٹوپی کی شکل" نہیں کہنا چاہئے۔ کیونکہ شکل اور صورت میں یہ فرق ہے کہ شکل ذی رُوح اشیا کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور صورت غیر ذی رُوح اشیا کے لئے، اور چونکہ ٹوپی ایک غیر ذی رُوح شے ہے اس لئے ہمیں "ٹوپی کی صورت" کہنا چاہئے نہ کہ "ٹوپی کی شکل"۔ (پھر اُسی طرف مڑ کر جس طرف سے وہ داخل ہوا تھا) ہاں، اے جاہل! گفتگو کا طریقہ یہ ہے۔ اور یہ ارسطو کی اپنی

اصطلاحات ہیں، جن کو اُس نے کتاب "صفات"
میں بیان کیا ہے۔
سینیرل۔ (الگ) میں تو یہ سمجھا تھا کہ ہم تباہ ہو گئے (پنکریس
سے) علامہ صاحب، اب اس کا خیال چھوڑ دیجے
میں۔۔۔۔
پنکریس۔ مجھے اس قدر غصہ آرہا ہے کہ مجھے معلوم نہیں
ہوتا میں کیا کر رہا ہوں۔
سینیرل۔ ٹوپی اور اُس کی شکل چھوڑیئے۔ میں آپ سے کچھ کہنا
چاہتا ہوں۔ میں۔۔۔۔۔
پنکریس۔ گستاخ!
سینیرل خدا کے لئے اب ختم کیجئے۔ میں۔۔۔۔
پنکریس۔ جاہل!
سینیرل۔ لاحول ولاقوۃ! میں۔۔۔۔
پنکریس۔ ایسے مسئلے پر اصرار کی جرأت!
سینیرل۔ وہ یقیناً غلطی پر ہے۔ میں۔۔۔۔۔
پنکریس۔ اس مسئلے کو ارسطو نے رد کیا ہے۔
سینیرل۔ بجا فرمایا۔ میں۔۔۔۔
پنکریس۔ نہایت شدت سے۔
سینیرل۔ بالکل درست (اُس طرف جا کر جس طرف سے پنکریس
داخل ہوا تھا) ہاں، ہاں، تم احمق ہو بیوقوف ہو
ایک ایسے علامہ سے بحث کرتے ہو جو خوب پڑھا لکھا
ہے۔ (پنکریس سے) لیجئے اس کا جھگڑا تو ختم ہوا
مہربانی فرما کر اب میری بات سنئے۔ میں آپ سے
ایک ایسے معاملے میں مشورہ لینا چاہتا ہوں
جس نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے۔ میں گھر
کی تنہائی کو دُور کرنے کے لئے شادی کرنا چاہتا
ہوں۔ لڑکی خوبصورت اور خوش وضع ہے۔ مجھے
وہ نہایت پسند ہے اور مجھ سے شادی کرنے پر
خوش ہے۔ اُس کا باپ بھی رضامند ہے لیکن
آپ کو معلوم ہو میں کس بات سے ڈرتا ہوں؛ میں بدنامی سے
ڈرتا ہوں کیونکہ بدنامی کی حالت میں انسان پر کوئی
رحم نہیں کرتا۔ مجھے آپ ایک فلسفی کے نقطۂ نظر سے
بتائیے کہ آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے؟
آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟
پنکریس۔ میں یہ تسلیم کر لوں گا کہ فضا اجسام سے خالی
ہو گئی ہے اور میں محض ایک احمق ہوں لیکن
یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ "ٹوپی کی شکل" کہنا درست
ہے۔
سینیرل۔ (الگ ہو کر) خدا اس شخص کو غارت کرے (پنکریس
سے) حضرت علامہ ایک لمحے کے لئے میری بات
بھی سن لیجئے۔ میں گھنٹے بھر سے بک بک کر رہا ہوں
لیکن آپ نے کچھ جواب نہیں دیا۔
پنکریس۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھ پر سخت غصہ
طاری ہو رہا تھا۔
سینیرل۔ اچھا اب اسے رخصت کیجئے اور میری بات سننے
کی زحمت گوارا فرمائیے۔
پنکریس۔ کہئے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔
سینیرل۔ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔
پنکریس۔ تو تم کون سی زبان استعمال کرو گے؟
سینیرل۔ کون سی زبان؟

پنکریس۔ ہاں۔
سینیرل۔ آہی خیر! وہی زبان جو میرے مُنہ میں ہے ورنہ ہمسائے کی زبان مستعار لینے کا تو مجھے خیال تک نہیں۔
پنکریس۔ میرا مطلب ہے کون سی بھاشا، کون سی بولی؟
سینیرل۔ اوہ! آپ تو اور ہی بات پوچھ رہے ہیں۔
پنکریس۔ کیا تم مجھ سے اطالوی زبان بولنا چاہتے ہو؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ سپینی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ جرمن؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ انگریزی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ لاطینی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ یونانی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس عبرانی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ شامی؟
سینیرل نہیں۔
پنکریس۔ ترکی؟
سینیرل۔ نہیں۔
پنکریس۔ عربی؟
سینیرل۔ نہیں، نہیں؛ فرانسیسی، فرانسیسی، فرانسیسی!
پنکریس۔ آہ، فرانسیسی!
سینیرل۔ بالکل۔
پنکریس۔ تو پھر اس طرف آجاؤ، کیونکہ یہ کان عالمانہ اور غیر زبانوں کے لئے ہے اور یہ کان عامیانہ اور روز مرہ زبان کے لئے۔
سینیرل۔ جس معاملے کا میں آپ سے ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرا ارادہ ایک لڑکی سے شادی کرنے کا ہے۔ جو خوبصورت اور نوجوان ہے۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے، اور میں نے اس کے باپ سے شادی کی اجازت بھی لے لی ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں۔ . .
پنکریس۔ (سینیرل کی بات نہ سنتے ہوئے) گویائی انسان کو خیالات کے اظہار کے لئے عطا ہوئی ہے، اور جیسے کہ خیالات حالات کے مظہر ہیں اسی طرح الفاظ خیالات کے مظہر ہیں۔ (سینیرل بیتاب ہو کر اپنے ہاتھ سے فلسفی کا منہ بند کر دیتا ہے لیکن جونہی کہ وہ ہاتھ اُٹھاتا ہے فلسفی پھر اپنی گفتگو شروع کر دیتا ہے) کئی مرتبہ ایسا ہی ہوتا ہے) لیکن یہ مظاہر بعض دوسرے مظاہر سے اختلاف رکھتے ہیں، کیونکہ یہ دوسری قسم کے مظاہر ہمیشہ اپنی اصل سے مختلف ہوتے ہیں، درآنحالیکہ کلام حامل ہوتا ہے اپنی اصل کا، کیونکہ وہ خیالات کی تشریح ہے خارجی اشارات کے ذریعہ سے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو اچھی طرح سوچ سکتے ہیں وہی بہترین طریق

پر بول بھی سکتے ہیں۔ اب تم اپنے خیالات میرے
سامنے ایسے الفاظ میں پیش کرو جن میں اشارات
بدرجۂ اتم موجود ہوں۔

سینیرل۔ (فلسفی کو گھر میں اندر کی طرف دھکیلتے ہوئے اور
باہر سے دروازہ بند کرتے ہوئے تاکہ وہ پھر باہر نکل
آئے) اس شخص کو طاعون ہوجائے!

پنکریس۔ (اندر سے) ہاں، ہاں، کلام خیالات کا مظہر ہے،
دل کا ترجمان ہے، روح کا پیکر ہے۔ (ایک کھڑکی سے
سر نکال کر کہتا ہے) یہ ایک آئینہ ہے جو ہماری انفرادیت
کے پوشیدہ ترین اسرار کا عکس ہمیں صاف صاف
دکھا دیتا ہے۔ اب چونکہ تم میں بحث و گفتگو کی قابلیت
موجود ہے، میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم اپنے خیالات
مجھ تک پہنچانے کے لئے کیوں اس قابلیت کا استعمال
نہیں کرتے؟

سینیرل۔ میں بھی یہی چاہتا تھا مگر تم نہیں سنوگے۔

پنکریس۔ میں سنتا ہوں، بولو۔

سینیرل۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ....

پنکریس۔ مگر سب سے زیادہ اختصار کا خیال رکھو۔

سینیرل میں خیال رکھوں گا۔

پنکریس۔ طوالت سے احتراز کرو۔

سینیرل۔ بہت خوب۔ تو جناب ....

پنکریس۔ قلّ و دلّ۔

سینیرل۔ میں ....

پنکریس۔ انتشار و اعوجاج قطعاً نہ ہو۔ (سینیرل اس زبان
بندی سے تنگ آکر زمین سے پتھر اٹھاتا ہے تاکہ
فلسفی کے سر کی تواضع کرے) ہیں ہیں؟ توضیح
مطلب کی بجائے تم تنک مزاجی پر اتر آئے ہو۔ چلے
جاؤ، تم اُس شخص سے بھی زیادہ گستاخ ہو جو کہتا تھا
کہ "ٹوپی کی شکل" کہنا چاہئے۔ میں تمہیں منطقی دلائل
اور قاطع براہین سے ثابت کرکے دکھا دوں گا کہ
تم اب بھی ایک حیوان ہو اور آئندہ بھی کبھی انسان
نہیں بن سکوگے، اور میں اب بھی اور آئندہ بھی
ایک فاضل فلسفی رہوں گا۔

سینیرل۔ بے نظیر بکواسی ہے!

پنکریس۔ (نیچے اتر کر) صاحب تصنیف، صاحب علم و
فضل!

سینیرل۔ اور؟

پنکریس۔ دانش و حکمت کا پیکر، (جاتے ہوئے) تمام
علوم طبعی، اخلاقی و سیاسی کا ماہر۔ (واپس آ
کر) ایک فاضل و افضل انسان (جاتے ہوئے)
ایک انسان جسے تفصیل کُل کے صیغے میں حکایات
صنمیات اور تواریخ کا علم حاصل ہے۔ (واپس آ
کر) قواعد، شاعری، عروض، لسانیات اور
سوفسطائیت کا (جاتے ہوئے) ریاضی، حساب،
مناظرہ، طبیعات اور مابعد الطبیعات کا (واپس
آکر) آفاقیات، اقلیدس، تعمیر اور تمام غیر معین
علوم کا (جاتے ہوئے) ادبیات، ہیئت، نجوم،
حیاتیات، قیافہ اور پیشین گوئی وغیرہ کا۔

سینیرل تنہائی میں

ایسے علما کو شیطان لے جائے جو کسی کی بات نہیں

سنتے ! مجھ سے کسی نے سچ کہا تھا کہ اس کا استاد
ارسطو بھی باتیں بنانے کے علاوہ اور کچھ نہ جانتا تھا
اب مجھے اُس دوسرے کے پاس جانا چاہئے، شاید
وہ کچھ زیادہ ہوشمند اور معقول ہو۔ تو چلے چلو!

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

دوسرا فلسفی مارفریوس

مارفریوس۔ مسٹر سینیرل کیسے آئے؟

سینیرل۔ جناب عالی مجھے ایک چھوٹے سے معاملے میں آپ کا مشورہ درکار ہے۔ اور اسی لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ (الگ) آہ! یہ خوب آدمی ہے، یہ لوگوں کو بولنے بھی دیتا ہے۔

مارفریوس۔ مسٹر سینیرل، مہربانی کر کے یہ طرزِ گفتگو بدل دیجئے ہمارا فلسفہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم کسی مسئلے کو بالاستحکام بیان نہ کریں، بلکہ ہر چیز کو اشتباہ کی نظر سے دیکھیں اور اس کے متعلق اپنے فیصلے کو ہمیشہ محفوظ رکھیں

سینیرل "یہ معلوم ہوتا ہے"؟

مارفریوس۔ ہاں۔

سینیرل۔ آپ اعتبار کیجئے، اس میں کچھ شک نہیں کیونکہ یہ حقیقت ہے۔

مارفریوس۔ یہ ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہو مگر حقیقت نہ ہو۔

سینیرل۔ کیسے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ میں آپ کے پاس موجود ہوں؟

مارفریوس۔ یہ مشکوک ہے اور ہمیں ہر چیز کو مشکوک سمجھنا چاہئے۔

سینیرل۔ کیا میں یہاں نہیں ہوں؟ اور آپ مجھ سے بول نہیں رہے؟

مارفریوس۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم یہیں ہو اور میں تم سے بول رہا ہوں لیکن یقینی نہیں کہ یہ بات صحیح ہو۔

سینیرل۔ لاحول ولاقوۃ! آپ مذاق کر رہے ہیں! صاف نظر آرہا ہے کہ یہ میں ہوں اور وہ آپ ہیں اور ہمارے مابین "معلوم ہوتا" کہیں بھی نہیں، پھر کیوں ہم فلسفہ کے ہیر پھیر کو ترک کر کے اصل موضوع پر گفتگو نہ کریں۔ میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔

مارفریوس۔ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔

سینیرل۔ میں جو آپ کو بتا رہا ہوں۔

مارفریوس۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔

سینیرل۔ جس لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں، بالکل نوجوان اور نہایت خوبصورت ہے۔

مارفریوس۔ یہ ناممکن نہیں۔

سینیرل۔ میں اس سے شادی کر دوں تو یہ اچھا ہوگا یا بُرا؟

مارفریوس۔ اچھا ہوگا یا بُرا۔

سینیرل۔ (الگ) اوہو! اس کو ایک دوسرا خبط ہے۔ (مخاطب ہو کر) میں پوچھتا ہوں کہ جس لڑکی کا میں نے ذکر کیا ہے آیا اُس سے میرا شادی کر لینا اچھا ہے؟

مارفریوس۔ دیکھیں۔

سینیرل۔ کیا بُرا ہے؟

مارفریوس۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

سینیرل۔ خدا کے لئے ٹھیک ٹھیک جواب دیجئے۔

مارفریوس۔ میرا ارادہ تو یہی ہے۔
سینیرل۔ مجھے لڑکی بہت پسند ہے
مارفریوس۔ ہوگی۔
سینیرل۔ باپ نے اپنی رضامندی دے دی ہے۔
مارفریوس۔ دے دی ہوگی۔
سینیرل۔ لیکن اگر میں شادی کرلوں تو مجھے دھوکے سے ڈر لگتا ہے۔
مارفریوس۔ یہ بات بھی ممکن الوقوع ہے۔
سینیرل۔ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟
مارفریوس۔ یہ ناممکنات سے نہیں۔
سینیرل۔ لیکن اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟
مارفریوس۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔
سینیرل۔ آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟
مارفریوس۔ جو آپ چاہیں۔
سینیرل۔ آہ! میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔
مارفریوس۔ میں اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتا ہوں۔
سینیرل۔ جھوٹ کہنے والا شیطان ہوتا ہے۔
مارفریوس ہو سکتا ہے۔
سینیرل۔ (الگ) اس نابکار کو خدا غارت کرے! فلسفی کتنے میں تیرا سارا نشہ ہرن کردوں گا! (اسے مارتا ہے)
مارفریوس۔ اوہ، اوہ، اوہ!
سینیرل۔ یہ تمہاری بے معنی باتوں کا جواب ہے، اور اب میں مطمئن ہوں!

مارفریوس۔ ہیں ہیں! یہ کیا حماقت ہے۔ یہ کیا طرزِ گفتگو ہے! اور تم مجھ جیسے بلند پایہ فلسفی کو مارتے ہو!
سینیرل۔ مہربانی فرما کر اپنے اندازِ کلام کی اصلاح کیجئے۔ دنیا کی ہر شے مشکوک ہے، اس لئے آپ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ میں نے آپ کو مارا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کو مارا ہے۔
مارفریوس۔ اوہ! میں ابھی مجسٹریٹ کے پاس جا کر اس زدو کوب کی اطلاع دوں گا۔
سینیرل۔ میں اس سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتا ہوں۔
مارفریوس۔ میرے جسم پر نشان موجود ہیں۔
سینیرل۔ ہو سکتے ہیں۔
مارفریوس۔ اور یہ تم نے لگائے ہیں۔
سینیرل۔ یہ ناممکن نہیں۔
مارفریوس۔ میں عدالت سے تمہارے نام کا سمن نکلواؤں گا۔
سینیرل۔ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔
مارفریوس۔ اور تم گرفتار کر لئے جاؤ گے۔
سینیرل۔ جو ہو سو ہو۔
مارفریوس۔ مجھے اب اس کارروائی کے لئے تنہا چھوڑ دو۔

سینیرل تنہائی میں

اب کیا کروں؟ اس وحشی انسان سے ایک لفظ تک اگلوانا مشکل ہوگیا، اور میں اب بھی ویسا ہی کورے کا کورا ہوں جیسا کہ ابتدا میں تھا۔ شادی

کے نتائج وعواقب کے متعلق اس بے اطمینانی کی
حالت میں کیا کروں، مجھ سے زیادہ پریشانی بھی
کبھی کسی کو لاحق نہ ہوئی ہوگی۔ آہا! جپسی آرہے ہیں
وہ میری قسمت کے متعلق کچھ بتائیں گے۔

* * * * * * * * *

(دو جپسی عورتیں گاتی، طبلے بجاتی اور ناچتی ہوئی آ
رہی ہیں)

سینیرل۔ وہ کتنی خوش ہیں! میں کہتا ہوں جپسیو، تم میری
قسمت کے متعلق کچھ بتا سکتی ہو؟

پہلی عورت۔ ہاں، سرکار، ہم دونوں غیب جانتی ہیں۔

دوسری عورت۔ اپنا ہاتھ ادھر لائیے اور ہمارے ہاتھ پر
چاندی کا ایک ٹکڑا رکھ دیجئے۔ ہم آپ کو ایسی باتیں
بتائیں گے جو آپ کے بہت کام آئیں گی۔

سینیرل۔ یہ لو میرے دونوں ہاتھ۔ ایک میں قسمت ہے اور
ایک میں چاندی۔

پہلی عورت۔ آپ کی قسمت بہت اچھی ہے میاں، آپ
کی قسمت بہت اچھی ہے۔

دوسری عورت۔ ہاں بہت اچھی سرکار، آپ کو انہیں دنوں
میں کچھ ملے گا۔

پہلی عورت۔ آپ کی بہت جلد شادی ہوگی، حضور آپ کی
بہت جلد شادی ہوگی۔

دوسری عورت۔ آپ کو ایک خوبصورت بیوی ملے گی، ایک
خوبصورت بیوی۔

پہلی عورت۔ جس سے ہر کوئی محبت کرے گا حضور، جسے ہر
کوئی پسند کرے گا۔

دوسری عورت۔ جس کے لئے بہت سے لوگ آپ کے دوست
بن جائیں گے، دوست!

پہلی عورت۔ جو آپ کے گھر میں ریل پیل کر دے گی۔

دوسری عورت۔ جو بڑی شہرت کی مالک ہوگی۔

پہلی عورت۔ جس کی خاطر لوگ آپ کی عزت کریں گے، بڑی
عزت۔

سینیرل۔ یہ تو ہوا۔ تم مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ مجھے دھوکا تو نہیں دے
گی؟

دوسری عورت۔ دھوکا؟

سینیرل۔ ہاں!

پہلی عورت۔ دھوکا؟

سینیرل۔ ہاں، وہ مجھے دھوکا تو نہ دے گی۔ (عورتیں گانے
اور ناچنے لگتی ہیں) کیا لغویت ہے۔ یہ کوئی جواب
ہے؟ یہاں آؤ۔ میں پوچھتا ہوں کیا مجھے ایک
بے وفا بیوی دھوکا تو نہ دے گی؟

دوسری عورت۔ آپ کو؟

سینیرل۔ ہاں۔

پہلی عورت۔ آپ کو!

سینیرل۔ ہاں، مجھے دھوکا تو نہ دے گی؟

(جپسی عورتیں ناچتی گاتی چلی جاتی ہیں)

سینیرل تنہائی میں

خدا ان فقیرنیوں کو غارت کرے، یہ بھی مجھے اُسی
مذبذب حالت میں چھوڑ گئیں۔ مجھے اپنی شادی کا
انجام ضرور معلوم کرنا ہے۔ اُس ساحر کے پاس چلوں
جس کا آج کل بڑا چرچا ہے، اور جو اپنے حیرت انگیز

علم کے ذریعے سے جو کچھ کوئی چاہے دکھا دیتا ہے، وہ
ضرور مجھے جو کچھ میں چاہوں گا دکھا دے گا۔

* * * * * *

ڈوری مین، لائی کاسٹ، سینیرل (نظروں سے اوجھل
پردے کے پیچھے)
لائی کاسٹ۔ پیاری ڈوری مین، کیا تم سچ کہتی ہو؟
ڈوری مین۔ بالکل سچ۔
لائی کاسٹ۔ تم حقیقت میں شادی کر لوگی؟
ڈوری مین۔ حقیقت میں۔
لائی کاسٹ۔ اور تمہاری شادی کی تقریب آج شام کو ہے؟
ڈوری مین۔ آج شام کو۔
لائی کاسٹ۔ اور تم میری محبت کو بھلا دو گی ظالم حسینہ،
اور اپنی محبت کو؟
ڈوری مین۔ میں؟ کبھی نہیں۔ میں ہمیشہ کے لئے تمہاری ہوں
اور تمہیں اس شادی سے پریشان نہ ہونا چاہئے۔
میں اُس سے محبت کے لئے شادی نہیں کر رہی
بلکہ اُس کی دولت نے مجھے اس پر آمادہ کیا ہے۔ دولت
نہ میرے پاس ہے نہ تمہارے پاس، اور دولت کے
بغیر تم جانتے ہو کہ کیسی گذر رہی ہے۔ سو خواہ اب
کسی قیمت پر بھی ملے ہمیں دولت حاصل کر لینی چاہئے
میں موقع دیکھ کر کود پڑی ہوں اور مجھے امید ہے کہ
بہت جلد اس بڈھے کھوسٹ سے نجات مل جائے گی
وہ عنقریب مر جائے گا، چھ مہینے سے زیادہ وہ زندہ نہیں
رہے گا۔ اگر وہ اسے عرصے میں مر نہ جائے تو میرا ذمہ
تم اطمینان رکھو ہوگی مسرت انگیز زندگی کے لئے مجھے
خدا سے زیادہ دیر تک التجا نہیں کرنی پڑے گی (سینیرل
کو دیکھ کر) آہا ہم تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔
اور بہت کچھ تمہاری تعریف و توصیف میں کہہ
رہے تھے۔
لائی کاسٹ۔ اچھا، یہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟
ڈوری مین۔ ہاں، میری شادی انہیں سے ہو رہی ہے نا
لائی کاسٹ۔ جناب عالی، مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ
کو آپ کی شادی پر ہدیۂ تہنیت پیش کروں اور
ساتھ ہی اپنی ادنیٰ ترین خدمات بھی پیش کر دوں
جس خاتون سے آپ شادی کر رہے ہیں۔ وہ
نہایت اعلیٰ صفات سے متصف ہیں۔ اور میں مس
ڈوری مین کو بھی مبارک باد دوں گا کہ انہوں نے
شوہر کا انتخاب نہایت مناسب کیا ہے۔

* * * * *

سینیرل تنہائی میں

لیجئے، اب تو اس شادی سے دل برداشتہ ہونے
میں مجھ پر کوئی الزام نہ آنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ
جا کر معاہدہ فسخ کر دوں تو بہتر ہے۔ میرے کچھ روپے
تو خرچ ہو گئے ہیں لیکن اتنے سے نقصان پر
ہی خلاصی ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ بھلے بچے۔
میں کوشش کرتا ہوں کہ اس جھنجھٹ سے نجات
مل جائے (الکنزل کے مکان پر جا کر دروازہ کھٹکھٹاتا
ہے)
الکنزل۔ آہ! بیٹے، خوش آمدید!
سینیرل۔ جناب، میرا فرض ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

الکنزڑ۔ تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟

سینیرل۔ ہاں۔

الکنزڑ۔ کیا؟

سینیرل۔ مسٹر الکنزڑ یہ سچ ہے کہ میں نے آپ کی بیٹی کے لئے پیغام بھیجا اور آپ نے میری اس درخواست کو منظور فرمالیا لیکن اب میں نے سوچا ہے کہ میری عمر کچھ زیادہ ہے اور آپ کی بیٹی بالکل نوجوان ہے۔

الکنزڑ۔ معاف فرمائیے گا۔ میری لڑکی آپ کو اس کے باوجود پسند کرتی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے گھر میں نہایت خوش رہے گی۔

سینیرل۔ نہیں، بعض اوقات میں عجیب وغریب اوہام میں گھر جاتا ہوں، اور اس لئے اُسے اکثر میری بدمزاجی کا متحمل ہونا پڑے گا۔

الکنزڑ۔ میری لڑکی بڑی نیک خصلت اور فرمانبردار ہے آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے گی۔

سینیرل۔ مجھے کچھ جسمانی کمزوریاں بھی لاحق ہیں جن کے باعث ممکن ہے وہ بیزار ہو جائے۔

الکنزڑ۔ اس کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ ایک پاکباز عورت کبھی اپنے خاوند سے بیزار نہیں ہوتی۔

سینیرل۔ تو پھر میں صاف صاف کہہ دوں؟ میں آپ کو رائے نہیں دیتا کہ آپ اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کریں۔

الکنزڑ۔ آپ یقیناً مذاق کر رہے ہیں؛ جان بھی چلی جائے تو میں اپنے الفاظ سے نہیں پھر سکتا۔

سینیرل۔ مگر مجھے آپ سے کوئی گلہ نہ ہوگا، اور میں . . .

الکنزڑ۔ نہیں، نہیں، میں آپ سے وعدہ کرچکا ہوں، اور باوجود اس کے کہ میرے پاس کثرت سے پیغام آ رہے ہیں۔ میں اپنی لڑکی کی شادی آپ ہی سے کروں گا۔

سینیرل۔ (الگ) تیرا ستیاناس!

الکنزڑ۔ سنو۔ تمہاری دوستی کی میرے دل میں خاص عزت ہے۔ اور میں تمہارے مقابلے میں کسی شہزادے کو بھی اپنی لڑکی دینا پسند نہیں کرتا۔

سینیرل۔ جناب عالی! میں آپ کی اس عزت افزائی کا ممنون ہوں، لیکن میں صاف صاف کہتا ہوں کہ میں آپ کی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔

الکنزڑ۔ تم شادی نہیں کروگے؟

سینیرل۔ ہاں نہیں کروں گا۔

الکنزڑ۔ کیوں؟

سینیرل۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔ اور اس لئے کہ میں اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے کبھی شادی نہیں کی۔

الکنزڑ۔ سنو جی۔ ہر آدمی اپنی پسند ناپسند میں آزاد ہے اور میں ایسا شخص نہیں ہوں کہ کسی کو خواہ مخواہ مجبور کروں۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ میری لڑکی سے شادی کریں گے، لیکن اب چونکہ آپ اس سے دست کش ہونا چاہتے ہیں اس لئے میں جا رہا ہوں، تاکہ دیکھوں کہ اس معاملے میں کیا کیا جاسکتا ہے۔ میں ابھی آکر آپ کو بتاتا ہوں

سینیرل تنہائی میں

سینیرل۔ اب تو یہ میری توقع سے بھی زیادہ معقول ہوگیا۔ میں
تو یہ سمجھتا تھا کہ مجھے معاملہ کرنے میں بہت زیادہ تکلیف
اٹھانی پڑے گی۔ خدا کی قسم جب مجھے اس معاملے کا
خیال آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے دستکش
ہوکر بڑی دانشمندی کی ہے۔ میں ایک ایسا قدم
اٹھا رہا تھا کہ شاید بعد میں مجھے اس کی وجہ سے بہت
پشیمان ہونا پڑتا۔ وہ الکنڈر کا لڑکا آگیا، شاید کوئی
جواب لایا ہے۔

السیڈاس۔ (نہایت نرمی اور اخلاق سے) جناب، آپ کا
غلام حاضر ہے۔

سینیرل۔ مجھے بھی اپنا خادم تصور فرمایئے۔

السیڈاس۔ صاحب، مجھے والد نے بتایا ہے۔ کہ آپ میری ہمشیرہ
کی شادی کا معاملہ فسخ کرنے آئے ہیں۔

سینیرل۔ ہاں جناب، مجھے افسوس ہے، لیکن . . . .

السیڈاس۔ اوہ، جناب یہ بھی کوئی بات ہے۔

سینیرل۔ مجھے سخت افسوس ہے۔ یقین مانئے میرا دل چاہتا
ہے کہ . . . . .

السیڈاس۔ جانے بھی دیجئے، اس میں ہرج ہی کونسا ہے۔
(سینیرل کے سامنے دو تلواریں پیش کرتا ہے) عالی
جناب، ان میں سے ایک انتخاب فرما لیجئے۔

سینیرل۔ ان میں سے ایک تلوار؟

السیڈاس۔ ہاں، از راہِ نوازش۔

سینیرل۔ کس لئے؟

السیڈاس۔ جناب محترم، چونکہ آپ نے میری بہن کے ساتھ
شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے میں خیال کرتا ہوں
کہ آپ میری اس پیش کش کو بیجا خیال نہ فرمائیں گے

سینیرل۔ کیسے؟

السیڈاس۔ دوسرے لوگ تو شور و غل مچاتے اور آپ کے
خلاف غیظ و غضب کا اظہار کرتے، لیکن ہم
اس قسم کے لوگ ہیں کہ ہر بات کو چپ چاپ قبول کر
لیتے ہیں۔ اور میں نہایت عاجزانہ طور پر عرض
کرنے آیا ہوں کہ اگر آپ نوازش فرمائیں تو ہم
دونوں کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے تیار
ہوجانا چاہیئے۔

سینیرل۔ یہ تو بڑا رنجیدہ پیشکش ہے۔

السیڈاس۔ آیئے ناحضرت، از راہِ عنایت انتخاب فرما
لیجئے۔

سینیرل۔ میں آپ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ لیکن میرا یہ
گلا کٹوانے کے لئے نہیں ہے۔ (الگ) کتنا ذلیل
طریق گفتگو ہے!

السیڈاس۔ آپ کی اجازت ہو تو یہ امر نہایت ضروری ہے۔

سینیرل۔ میرے عزیز دوست، میں چاہتا ہوں کہ آپ
اس پیشکش کے سلسلے میں ذرا توقف فرمائیں

السیڈاس۔ آپ جلدی کیجئے، کیونکہ مجھے کچھ اور بھی کام ہے

سینیرل۔ میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ میں اس کے لئے
تیار نہیں۔

السیڈاس آپ لڑنے کے لئے تیار نہیں؟

سینیرل۔ یقیناً نہیں۔

السیڈاس آپ سچ کہتے ہیں؟

سینیرل۔ سچ۔

السیڈاس۔ (اُسے دو تین بید رسید کر دیتا ہے) جناب کم از کم آپ شکایت نہیں کر سکتے، آپ دیکھتے ہیں کہ میں ہر بات قاعدے کے مطابق کر رہا ہوں آپ نے اپنے الفاظ کا پاس نہ کیا میں نے آپ کو لڑنے کی دعوت دی، آپ نے لڑنے سے انکار کیا میں نے آپ کو بید لگائے۔ ہر بات قاعدے کے مطابق ہے، اور آپ بڑے شریف آدمی ہیں کہ مجھے مطعون کرتے ہیں۔

سینیرل۔ (الگ) کیسا شیطان ہے!

السیڈاس۔ (پھر تلوار پیش کر کے) آیئے صاحب، شرافت سے کام لیجئے ورنہ کہیں مجھے آپ کے کان نہ کھینچنے پڑیں

سینیرل۔ کیا تم فیصلہ کر چکے ہو؟

السیڈاس جناب والا، میں کسی کو مجبور نہیں کیا کرتا، لیکن آپ یا تو لڑیں یا میری بہن سے شادی کریں۔

سینیرل۔ جناب عالی، میں دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں کر سکتا۔

السیڈاس۔ حقیقۃً؟

سینیرل۔ حقیقۃً۔

السیڈاس۔ تو پھر مجھے اجازت دیجئے ..... (اُسے مارتا ہے)

سینیرل۔ اوہ، اوہ، اوہ!

السیڈاس۔ مکرم و محترم، مجھے سخت افسوس ہے کہ میں آپ سے ایسا سلوک کرنے پر مجبور ہوا ہوں لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں اُس وقت تک آپ کو مارتا رہوں جب تک آپ میری بہن سے شادی کرنے کا وعدہ نہ فرمالیں۔ (بید اٹھاتا ہے)

سینیرل۔ ٹھہرو، ٹھہرو، میں شادی کرلوں گا، میں شادی کرلوں گا

السیڈاس۔ میرے محترم دوست، مجھے خوشی ہے کہ آپ کے حواس درست ہو گئے اور معاملات بخیر و خوبی طے ہو جائیں گے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے دل میں اتنی عزت اور کسی کی بھی نہیں جتنی آپ کی ہے، اور مجھے نہایت رنج ہوتا اگر آپ مجھے اپنی ذات سے بدسلوکی کرنے پر مجبور کر دیتے، میں والد کو بلاتا ہوں، اور آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ سب باتیں طے ہو گئی ہیں۔ (جا کر الکنٹر کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے)

السیڈاس۔ ابا، یہ صاحب اب معقولیت پر آمادہ ہو گئے ہیں انہوں نے از راہ مہربانی معاملات کو سلجھانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب آپ بہن کو ان کے حوالے کر سکتے ہیں۔

الکنٹر۔ جناب یہ ہے میری لڑکی کا ہاتھ، آپ صرف اپنا ہاتھ بڑھا دیجئے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوا، آیندہ اس کے چال چلن کے آپ ذمہ دار ہیں آیئے، اب اس مسرت انگیز شادی کا جشن منائیں۔

منصور احمد

اتمامِ عشق

کیا خوب تمہیں اب مجھے بدنام کروگے   یہ کام کروگے تو بڑا کام کروگے

ہر چند برائی سے کروگے مری باتیں   ق   ہر چند مجھے یاد بہ دشنام کروگے

میرا یہ ستارہ، کہ مرا ذکر لبوں سے   دن رات کروگے سحر و شام کروگے

میں دشمنِ دل، دشمنِ جاں، دشمنِ ایماں   مجرم ہو کوئی، تم تو مرا نام کروگے

جتنی بھی زیادہ مری چاہو گے تباہی   ق   جتنا بھی زیادہ مجھے ناکام کروگے

اُتنا ہی بڑھاؤگے مرے ذوقِ وفا کو   اُتنا ہی مرے عشق کا اتمام کروگے

پروانے کو جلنا ہے بہرحال جلے گا

حیران ہوں کیا شمع کا انجام کروگے

حامد علی خاں

ارتقا

سنہ ۱۹۱۲ء

عشا کی نماز سے فارغ ہو کر میں بستر پر لیٹی ہی تھی۔ کہ امی جان میرے کمرے میں آئیں اور میرے پاس بیٹھ کر نہایت پیار کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ دوران گفتگو میں انہوں نے دبی آواز میں مجھے بتایا کہ دوپہر کے وقت ابا جان کے دیرینہ دوست ڈپٹی . . . صاحب ان سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے میرے رشتے کی خواہش ظاہر کی ہے ——— رشتے کا نام سنتے ہی مجھے چکر آ گیا میرا دم گھٹنے لگا اور مجھ پر غشی کی حالت طاری ہو گئی۔

اس کے بعد ایک دو ماہ کے عرصے میں ادھر ادھر سے تین چار پیغام اور آئے لیکن ابا جان نے امی جان کے مشورے کے ساتھ ہر ایک رشتے کے نیک و بد کو سوچ سمجھ لینے کے بعد ڈپٹی صاحب ہی کے بیٹے کے ساتھ میرا دامن وابستہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ شادی کے خیال سے میرا دم بدستور گھٹتا رہا۔ لیکن میں نے والدین کی خوشی کو اپنی خوشی تصور کیا اور ان کی رضامندی کو اپنی رضامندی۔

اب میں اکثر سوچا کرتی ہوں۔ کہ ابا اور امی کی نظر انتخاب کس قدر نیک ہیں نکلی ہیں تو کسی طرح بھی "ان" کے لائق نہ تھی۔

سنہ ۱۹۲۲ء

بھائی جان کے خط کے جواب میں انہوں نے لکھ بھیجا:-

"آج صبح آپ کا نوازش نامہ مع سعیدہ کی عکسی تصویر کے ملا شکریہ تصویر کو صبح سے اس وقت تک بیسیوں بار دیکھ چکا ہوں لیکن طبیعت سیر نہیں ہوتی اور جی چاہتا ہے کہ اسے دیکھتا ہی رہوں اس خط کے ساتھ اپنی تازہ تصویر بھیج رہا ہوں سعیدہ کو دکھا دیجئے۔ اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے بڑی بے صبری کے ساتھ جواب کا انتظار کروں گا جس قدر جلد ممکن ہو سکے اطلاع دے کر ممنون فرمائیں . . . . . "

تصویر میں کچھ اس قسم کی نظر فریب جاذبیت تھی کہ اسے دیکھتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا۔ اور میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے اپنے تکیے کے نیچے چھپا لیا۔

انہیں اپنی اور ساتھ ہی میری قسمت کا فیصلہ اگلے روز کی ڈاک سے مل گیا ہوگا

۱۹۳۲ء

ہم دونوں —— رشید اور میں —— تماشے کے دردناک پلاٹ سے بے حد متاثر ہو رہے تھے۔ اور جب فلم کے اختتام کے قریب ہیروئن نے دنیا و مافیہا سے منہ موڑ کر گھر بار، دولت، شہرت یہاں تک کہ ماں باپ کی محبت کو بھی صرف اس شخص کو حاصل کرنے کے لئے قربان کر دیا جسے وہ دل سے چاہتی تھی تو میں نے اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل کے ساتھ روکا اور باوجود اس بات کے کہ آخر کار وہ دونوں آپس میں مل گئے اور خوشی اور کامیابی کی زندگی بسر کرنے لگے میرے دل پر ہیروئن کی آخری قربانی کا کچھ اس قدر گہرا اثر ہوا کہ تماشے کے ختم ہو جانے کے بعد دیر تک میں اپنی جگہ پر بیٹھی آہیں بھرتی رہی جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سارا ہال خالی ہو چکا تھا اور رشید کسی گہرے خیال میں کھویا ہوا سا میرے قریب چپ چاپ کھڑا تھا۔ دفعتہً ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کی نگاہوں میں ایک پُر سحر ادا سی تھی ۔ ایک لمحے کے بعد اس نے مجھے اپنے مضبوط بازوؤں میں لے لیا اور نہایت آہستگی سے پوچھا "شمیم کیا ہم دونوں اس فلم کے ہیرو اور ہیروئن کی طرح ہمیشہ کے لئے ایک نہیں ہو سکتے؟"

میں نے اپنی آہ کو روکتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "ہاں"

۱۹۴۲ء

[سین: سطح زمین سے کئی ہزار فٹ کی بلندی پر ابر آلودہ فضا میں اڑتا ہوا طیارہ جسے مس یاسمین چلا رہی ہے۔ وہ مردانہ لباس میں ایک حسین لڑکا معلوم ہوتی ہے اسکی پیٹھ پر جدید ترین ساخت کا پیراشوٹ بندھا ہوا ہے۔ دوسری نشست پر اس کا نوجوان دوست جمیل بیٹھا ہوا ہے]

جمیل۔ یاسمین میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔

یاسمین۔ کہو۔

جمیل۔ کئی روز سے میرے دل میں ایک زبردست امنگ پیدا ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اس کے متعلق گفتگو کروں۔

یاسمین۔ (طیارے کو بلندی کی طرف لے جاتے ہوئے) میں ہمہ تن گوش ہوں۔

جمیل۔ میں کئی بار اظہار کی کوشش کر چکا ہوں لیکن میری زبان آج تک میرے دل کی ترجمانی کرنے سے قاصر رہی ہے۔

یاسمین۔ آخر کچھ کہو گے بھی؟

جمیل۔ (رک رک کر) یاسمین ... مجھے تم ... سے محبت ہے ... میں ... میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے ....

(یاسمین طیارے کو تیزی کے ساتھ گھما کر اس کے رخ کو نیچے کی طرف کرتی ہے)

جمیل (دیوانہ وار) ہماری باہمی زندگی نہایت خوشگوار اور کامیاب ثابت ہوگی ... کیا تم میری محبت کو شرف قبولیت ——

(یاسمین طیارے کو اسکی انتہائی رفتار تک تیز کر دیتی ہے ... دفعتہً انجن میں سے ایک زبردست دھماکے کی آواز آتی ہے اور طیارہ الٹ جاتا ہے)

یاسمین۔ (اپنی نشست پر سے ہوا میں چھلانگ مارتی ہوئی) افسوس مجھے تم سے محبت نہیں۔

[طیارہ ایک بہت بڑے شعلے کی صورت میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بستی کی طرف لپکتا ہے۔ یاسمین اپنے کھلے ہوئے پیراشوٹ کے ساتھ لٹکی ہوئی آہستہ آہستہ زمین کی طرف آتی ہے]

لطیف الرحمٰن

لاہور سے جالندھر تک

ریل گاڑی لاہور کے عظیم الشان اسٹیشن میں داخل ہوئی: ناصر نے ناول کے چوتھے باب کی آخری سطروں پر عجلت سے نگاہ ڈالی اور کچھ دیر کے لئے اسے بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ وہ گھبرا گھبرا کر پلیٹ فارم پر نگاہیں دوڑا رہا تھا کہ مبادا کوئی مسافر اپنی بے ہنگام آمد سے اس کی تنہائی کے لطف کو برباد کر دے۔ وہ طبعاً عزلت پسند تو تھا ہی، لیکن گاڑی کی صحبتِ ناجنس سے اسے خاص طور پر کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی خصوصاً اگر اس کے ہم سفروں میں کوئی "معزز خاتون" یا ننھا بچہ بھی آ شامل ہوتا۔ تو پھر سفر کے یہ گھنٹے اس کے لئے قیامت کی ساعتوں میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ ابھی گذشتہ ہی مہینے کا ذکر ہے۔ جب ایک خانہ داری کی ماہر "سلیقہ شعار" خاتون کے گھی کا برتن اُن کے شوہر کی غلطی سے اوندھا ہو کر رہ گیا، گھی کا طوفان تو خیر طوفانِ نوح کی یاد دلاتا ہی تھا۔ لیکن خاتونِ موصوفہ راستہ بھر اپنے شوہرِ نامدار کی شان میں جو مدح سرائی کرتی چلی آئیں۔ وہ اس طوفان سے کہیں زیادہ ناقابلِ برداشت تھی۔ اور اُس ہمارے بچے کو ابھی تک وہ نہیں بھولا تھا۔ جو اپنی ماں کی گود سے لپک لپک کر اسے "پیغامِ محبت" دے رہا تھا۔ اور جس نے اُس کے کوٹ پر متعدد قسم کے داغ لگائے تھے۔ اور ابھی تک وہ داغ اگر کوٹ پر نہیں تو اس کے دل پر ضرور اُسی طرح موجود تھے۔

اس دفعہ وہ گاڑی کے آخری ڈبوں میں سے ایک میں بیٹھا نہیں بلکہ یوں کہئے کہ پناہ گزین ہوا تھا۔ اور ہر سٹیشن پر خلوصِ دل سے دعا مانگتا تھا۔ کہ "الٰہی کوئی نہ آئے" پندرہ منٹ گذر گئے اور اب وہ خوش ہو رہا تھا۔ کہ آزمائش گذر گئی اور صاف بچ نکلے لیکن اتنے میں ایک ہندوستانی عیسائی خاتون گلابی ململ کی ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی "تقریباً" کود کر اندر داخل ہوئیں ناصر کا دل دھک سے رہ گیا۔ دوبارہ نظر جو اٹھائی۔ تو ایک ادھیڑ عمر کی سیاہ فام آیا۔ تقریباً ایک پانچ سال کے بچے کا ہاتھ پکڑے بھاگتی ہوئی داخل ہوئی بے اختیار ناصر کے منہ سے نکلا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ لیکن ابھی کہاں بس ہوتی تھی۔ ایک قلی آیا اور اس نے عین اسی نشست کے نیچے جہاں وہ بیٹھا تھا۔ ایک ٹوکرا جس میں مرغ یا پیرو کی قسم کا کوئی جانور بند تھا گھسیڑ دیا۔ دوسرے قلی نے ایک بدنما سا کتا اندر پھینکا۔ بس روح ہی تو فنا ہو گئی سیٹی ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی دو سوٹ کیس جن پر سے رنگ و روغن مدتیں گذریں رخصت ہو چکا تھا داخل ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے ایک نعمت خانہ آیا۔ پھر ایک پرانا ٹفن باسکٹ اور ایک بچے کا کموڈ، اس کے بعد دو بستر نمودار ہوئے۔ جو بمشکل دروازے میں سے اندر داخل ہو سکے یہ اس قدر پھول رہے تھے۔ گویا موٹر کا ہوا بھرنے کا پمپ ان میں ہوا بھر دی گئی ہے۔ اب گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ ادھر ٹوکرے میں

وہ جانور پھڑپھڑا رہا تھا۔ اُدھر کتے نے گھبرا کر بھونکنا شروع کیا۔ خاتون کھڑکی میں سے سر نکالے برابر جلدی، جلدی، کی رٹ لگا رہی تھیں۔ ناصر کا دل اس قدر سامان کو دیکھ کر ڈوبا جا رہا تھا۔ اس نے ناول پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈال کر اسے بیگ میں بند کر دیا اور دل میں کہا "اگر خود ہی یہاں سے زندہ نکل گئے تو بڑی بات ہوگی"۔ اتنے میں قلی نے سب سے آخری اور سب سے بڑا صندوق اندر دھکیل دیا۔ گاڑی کی رفتار اب تیز ہو چلی تھی۔ اس لئے قلی پلیٹ فارم پر کود پڑا۔ اور مزدوری طلب کی۔ خاتون نے توقف کیا۔ یہاں تک کہ گاڑی کی رفتار ذرا اور تیز ہو گئی۔ اس کے بعد نہایت فیاضی کے ساتھ چار آنے نکالے اور پلیٹ فارم پر چار قلیوں کے سامنے پھینک دئے۔ قلی چلّائے "میم صاحب انصاف سے کیجئے"۔ خاتون نے کچھ زیادہ توجہ نہ دی۔ صرف اتنا کہا "جاؤ گاڑی جاتی ہے یہ خوب انصاف کا وقت نکالا" پھر سر اندر کی طرف پھیرتے ہوئے بولیں "اب تو کبھی یہ ٹرین نہ پکڑوں گی"۔ آیا سے مخاطب ہو کر کچھ چائے دانی کا ذکر کیا۔ کتے کو چمکار کر اس کا منہ چوما اور اسے خاموش کیا۔ ناصر کی آنکھیں نفرت کے شدید احساس سے خود بخود بند ہو گئیں، اب تک وہ کتے کو دنیا کی بدترین مخلوق سمجھتا رہا تھا۔ اس کے بعد خاتون نے آیا سے کہا ادھر آؤ۔ ذرا یہ صندوق گھسیٹ کر برتھ کے نیچے کر دو قلی دروازے ہی میں چھوڑ گیا ہے۔ آیا شاید نئی نئی کسی گاؤں سے آئی تھی۔ اپنی بھدی اور کرخت آواز میں بولی "میم صاحب اتنے بڑے مرد سے تو صندوق ہل نہ سکا۔ میں بڑھیا کہیں نیچے آ کر دب مروں۔ تو کسی کا کیا جائے"۔ خاتون نے کہا "بڈھی ہمیشہ بہانہ کرتی ہے"۔ پھر مڑ کر نہایت ملتجی نگاہوں سے ناصر کی طرف دیکھا ذرا اپنی آستین کو اوپر کی طرف سرکایا۔ اور یوں مخاطب ہوئیں۔ "آپ کو تکلیف تو نہ ہوگی"؟ ناصر گھبراہٹ میں اس فقرے کا وہی مطلب سمجھا جس کی متقاضی اس کی دلی کیفیت تھی شرمندگی کے لہجے میں رکتے ہوئے بولا "جی بالکل نہیں۔ تشریف رکھئے" خاتون نے ایک لمحہ ٹھہر کر کہا "میرا مطلب یہ تھا کہ اس صندوق کو ذرا ٹھیک کر لیا جاتا تو آرام سے بیٹھئے۔ دوسرے سٹیشن پر چڑھنے والوں کو دقت ہوگی"۔ ناصر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن دل میں خیال کیا "کیا ابھی اور چڑھنے والوں کی بھی گنجائش باقی ہے"؟ خاتون کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صندوق کو ہٹانے میں خود بھی شامل ہوں گی۔ لیکن وہ ذرا حیران ہوا جب اس نے دیکھا کہ خاتون نے جلدی سے بچے کا ہاتھ پکڑا اور یہ کہتے ہوئے پیچھے ہٹ گئیں۔ "ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ مائی ڈارلنگ صندوق آتا ہے"۔

اب ناصر صندوق کو ہلاتا ہے۔ تو اس میں گویا لوہا اور سیسہ بھر دیا گیا ہے۔ ہلائے سے نہیں ہلتا۔ بدقتِ تمام اسے گھسیٹ کر دروازے سے ہٹایا۔ لیکن اتنے ہی میں چہرہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اور صندوق کا کنڈا تو تقریباً ہاتھ میں گڑ کر رہ گیا۔ زخمی ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر درد کی تکلیف چہرے سے چھپاتے ہوئے مسکرا کر بولا "بس یہاں ٹھیک رہے گا"۔ خاتون نے کہا "تھینک یو" "ویری گڈ" پھر فوراً ہی بولیں "دیکھئے وہ قلی اگر اوپر کی برتھ پر رکھ جاتا۔ تو کیسی حفاظت کے ساتھ پڑا رہتا میرا سفر بھی تو بارہ گھنٹے کا ہے"۔ اپنی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے ناصر کے چہرے پر شرم سے ہلکی سی سرخی آ گئی۔ گویا صندوق کو اٹھا کر اوپر رکھنا خود اسی کا فرض تھا۔ جھجکتے ہوئے بولا۔ اگلے سٹیشن پر دوسرے قلی

کو ملوا کر ٹھیک رکھوا دیا جائے گا۔

خاتون۔ نہیں نہیں آپ کو بہت تکلیف ہوگی" (ذرا ٹھہر کر) اسٹیشن قلی بھی بغیر مزدوری لیئے ہاتھ نہیں ہلاتے"

اب ناصر پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

خاتون۔ آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ . . . . ناصر کو خیال تو آیا کہ اگلے اسٹیشن کا نام لے دوں اور یہاں سے اتر کر کسی اور درجے میں جا بیٹھوں لیکن بدقسمتی سے اگلے اسٹیشن کا نام ایسا حافظے سے گم ہوا کہ باوجود تھوڑا دفعہ سوچنے کے بھی یاد نہ آسکا۔ آخر منہ سے سچ ہی نکل گیا "جی میں جالندھر جا رہا ہوں"۔

خاتون۔ (تقریباً چیخ کر) "جالندھر؟ خوب وہیں تو میری آنٹی رہتی ہیں۔ آپ تو شاید جانتے ہوں گے مسز مایاداس مشہور ہیں لیڈی ڈاکٹر"

ناصر۔ (بلا سوچے سمجھے)" ہاں کچھ کچھ یاد تو پڑتا ہے"۔

خاتون۔ (خوش ہو کر ذرا وضاحت سے) سنیئے وہ عام طور پر وہاں ذرا نرس مشہور ہیں یہی تو وجہ ہے کہ ان کی ذات سے ہر خاص و عام کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ شہر کا کوئی شریف گھر ایسا نہیں جہاں وہ نہ جاتی ہوں میں تو کہتی ہوں بغیر ان کے شاید جالندھر کا شہر اجڑ جائے (پھر خود ہی ایک قہقہہ لگاتی ہیں)

ناصر۔ جی ہاں۔ پھر تو ضرور ہمارے ہاں بھی آتی ہونگی"۔

خاتون۔ (ہنس کر)" وہ اچھی خاصی موٹی ہیں۔ وزن میں مجھ سے دگنی ہوں گی۔ قد بھی مجھ سے کچھ نکلتا ہوا ہے عینک لگاتی ہیں۔ چہرے پر کہیں کہیں داغ ہیں۔ لباس ہمیشہ سفید پہنتی ہیں۔ اب تو آپ کو خوب یاد آ جائے گا؟"

ناصر۔ (دماغ پر خواہ مخواہ زور دے کر) ایک دن اس حلیہ کی ایک لیڈی کو غالباً میں نے زنانے میں سے نکلتے تو ضرور دیکھا تھا۔ شاید وہی ہوں"

خاتون۔ (زور سے) شاید کیا یقیناً وہی ہوں گی۔ اور کوئی نہیں ہو سکتی جب کہ آپ کو یاد بھی پڑتا ہے۔ اچھا یہ تو بتایئے چلنے میں ان کے دائیں پاؤں میں تھوڑا سا، بالکل خفیف (جوش میں) بلکہ بالکل بے معلوم سا کچھ لنگڑا . . . . سا . . . . . پن تو نہیں رہتا۔

ناصر۔" مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس وقت اس پر غور نہیں کیا۔ لیکن ہو سکتا ہے"۔

خاتون۔ آپ نے غور نہیں کیا؟ ٹھیک! اگر غور کرتے تو آپ بالکل یقین کے ساتھ کہہ سکتے تھے۔ آنٹی کی ناک اور آنکھوں کے اوپر کا حصہ میری سسٹر سے بہت ملتا جلتا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہی ہوتیں لیکن ایک وجہ سے نہ آسکیں اگر وہ ساتھ ہوتیں تو آپ فوراً پہچان جاتے"۔

ناصر:۔ جی ہاں پھر تو بہت آسانی ہوتی"

خاتون۔ تو پھر آپ ایک کام کیجیے گا تکلیف تو نہ ہوگی؟"

ناصر:۔ جی نہیں تکلیف کا کیا ذکر (دل میں) الہی خیر!

خاتون:۔ تو صاحب یہ کتا لیجیے میری آنٹی کا ہے۔ ابھی بالکل پلّہ ہی تھا کہ اس کی ماں مرگئی آنٹی کو بہت صدمہ ہوا۔ انہیں نوں میری نوسی (کتیا) نے بھی چار بچے دئے تھے۔ آنٹی نے اسے بھی میرے پاس بھیج دیا۔ کہ ایک تو اسے ہر وقت دیکھ دیکھ کر مجھے رنج نہ ہوگا۔ دوسرے انہیں بچوں کے ساتھ پلتا رہے گا۔ (کتے کو پیار کرکے اب دیکھئے کیسا شریر ہوگیا ہے ان دنوں تو اس کے بچنے کی بھی امید نہ رہی تھی۔ ہاں تو اب آنٹی نے مجھے خط لکھا تھا کہ دلی جاتے ہوئے پیارے جیکی کو ساتھ لانا میں سٹیشن پر آکر لے لوں گی اب مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس خط کے جواب میں انہیں گاڑی کے وقت سے اطلاع دی تھی یا نہیں لیکن اب تو کچھ مشکل نہیں آپ کتا ساتھ لے جائیے! اول تو آپ کے گھر میں سب جانتے ہونگے ورنہ کسی نوکر کے ہاتھ بڑے ہسپتال میں مسز ہایاد اس کے پاس بھجوا دیجئے"

ناصر (حواس باختہ ہوکر) لیکن میں۔ ۔ ۔ کتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا خیر۔

خاتون۔ (نہایت جوش وخروش سے) اول تو ناممکن ہے آنٹی نہ ملیں جبکہ آپ کے گھر میں ان کی آمدورفت بھی ہے لیکن خیر اگر آٹھ دن جیکی آپ کے ہاں بھی گذارے تو حرج نہیں آٹھ دن بعد میرے شوہر جالندھر سے گذریں گے وہ کتا آپ سے لے کر آنٹی کو دے دیں گے۔ اب خوب بات بنی"

ناصر۔ درست ہے (دل میں) خدا کرے گاڑی الٹ جائے۔ اور سب فیصلہ یہیں ہو جائے"

خاتون:۔ اگر میرے شوہر ساتھ ہوتے تو آپ ان سے مل کر اس سے بھی زیادہ خوش ہوتے"

ناصر۔ (بوکھلا کر) افسوس میں ان سے نہ مل سکا"

خاتون:۔ میں آپ کا ذکر کردوں گی اور کہوں گی جالندھر میں ضرور آپ سے ملئے"

ناصر۔ زہے قسمت۔ آپ کی مہربانی (دل میں) لیکن اس وقت تک شاید میرا انتقال ہوچکا ہوگا۔

اب خاتون نے بچے کی طرف توجہ کی اور ناصر نے دوسری طرف منہ پھیر کر آسانی سے سانس لیا۔

بچہ:۔ ماما! یہ صاحب کون ہیں"

خاتون نے ایک قہقہہ لگایا اور ناصر کو مخاطب کرکے یوں گویا ہوئیں۔ لیجئے صاحب آپ کو تو ایک اچھے خاصے دوست مل گئے۔ ابھی ابھی آپ کی نسبت پوچھا ہے۔ اب تھوڑی دیر بعد دیکھئے گویا آپ اور یہ کبھی الگ ہوئے ہی نہیں آپ کا سفر اچھا لطف سے گذرے گا عام طور پر اپنے ہمراہیوں کو یہ خاموش نہیں بیٹھنے دیا کرتے"

ناصر (آہستہ سے) "بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا" لیکن فوراً ہی ہوش میں آگیا (زہرخند

ہنسی ہنس کر) "یہ بھی بہت اچھا ہُوا۔ کیا نام . . . . . ."

خاتون (بات کاٹ کر) نام وغیرہ سب یہ ابھی خود بتائے دیتے ہیں۔ ذرا دیر ٹھہریے (بچے سے) جاؤ بیٹا وہ صاحب بلا رہے ہیں"

یہ سننا تھا کہ بچہ برق کی سی تیزی سے ناصر کی طرف لپکا اور غلیظ بُوٹ اس کی پتلون پر رکھ کر اوپر چڑھ آیا۔ اب ناصر کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ادھر بچے کے ساتھ خلق کرنا ضروری۔ ادھر نئی پتلون کا حشر آنکھوں کے سامنے تھا اگر مٹی جھاڑتے ہیں تو ڈر ہے کہ کہیں خاتون کج خلقی نہ سمجھیں۔ غرض پتلون کو تو اس کے حال پر چھوڑا اور بچے سے یوں مخاطب ہوئے

"آؤ میاں اچھے تو ہو؟ کدھر سے آنا ہُوا"

لڑکا۔ آپ پاپا کے دوست ہیں نا؟

ناصر۔ (جھک کر) ہاں۔

لڑکا۔ آپ اونچے تو اتنے زیادہ ہیں۔ اور مونچھیں آپ کی پاپا سے کتنی چھوٹی ہیں؟"

ناصر (جھینپ کر) "کچھ پڑھتے بھی ہیں آپ" (اسے خود تو کسی بچے سے گفتگو کرنے کا ابھی تک کم ہی اتفاق ہوا تھا لیکن اتنا وہ ضرور جانتا تھا کہ اس عمر کے بچوں سے لوگ عموماً یہی سوال کرتے ہیں)

لڑکا: "میں پڑھتا تو نہیں لکھتا ہوں"

ناصر: "کیا لکھتے ہیں"؟

لڑکا: "یہی ——— go دو"

ناصر۔ (یہ بھول کر کہ مخاطب محض بچہ ہے) "بہت خوب! آپ کی لغت میں go (گو) ہی سب سے اہم اور جاذبِ توجہ لفظ ہے"

لڑکا۔ (کچھ نہ سمجھ کر) دیکھئے دیکھئے ذرا اپنی پتلون کو کیسا ستیاناس کر دیا آپ نے (تالی بجا کر) اب آپ خوب پٹیں گے"

ناصر نے کچھ کہنے کے لئے لبوں کو جنبش دی یعنی آپ ہی کی نوازش ہے۔ کہ اتنے میں خاتون نے ایک قہقہہ لگایا لیجئے اب یہ آپ کو تہذیب کا پورا سبق سکھا کر چھوڑیں گے"۔

ناصر (پتلون جھاڑتے ہوئے) واقعی خوب باتیں کرتے ہیں"

لڑکا۔ جناب یہ عینک آپ کی ہے؟ (ناصر نے دیکھا بدقسمتی سے عینک بیگ سے باہر ہی رہ گئی تھی۔ تھوڑی دیر تک بچے نے اسے اِدھر اُدھر سے کھینچا۔ اور اس کے بعد عینک اس کی آنکھوں پر تھی)

خاتون (بے ساختہ ہنستے ہوئے) بس رہی پرانی عادت۔ ذرا سنئے تو اپنے پاپا کی تین عینکیں اب تک فریم سے

جدا کر دیں ادھر عینک رکھی ادھر انہوں نے اٹھالی "

ناصر۔ (زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ) بچہ ہے نا!

خاتون: "سبھی بچے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ ہی کچھ عجیب قسم کا ہے۔ دیکھئے دیکھئے ذرا اس کی آنکھیں کس قدر شرارت ہے "

ناصر۔ (اخلاقاً) بہت پیارا بچہ ہے "

خاتون (خوش ہو کر) میں کہتی ہوں۔ اس کی شکل بالکل اپنے پاپا کی طرح ہے اور میری ماما کہتی ہیں۔ کہ نہیں یہ بالکل تمہارے بچپن کی تصویر ہے "

ناصر مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے۔

خاتون: "لیکن میں بچپن میں ایسی شریر کہاں تھی؟ البتہ میرے شوہر اپنے بچپن کی شرارتوں کے بہت قصے سنایا کرتے ہیں

ناصر۔ (کافی صبر کے بعد بچے کو مخاطب کر کے) لاؤ میاں عینک تمہارے کام کی نہیں بڑی ہے "

لڑکا: "میں اگلے سٹیشن پر دوں گا "

خاتون: "ہاں ہاں ضرور دے دینا ورنہ یہ تم سے خفا ہو جائیں گے۔ (پھر ناصر کو مخاطب کر کے) اس کے پاپا تو بس اس کی ہر بات مان لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ بچہ ہی کیا جس میں اتنی سی شرارت بھی نہ ہو "

ناصر: "جی ہاں وہ بچہ ہی کیا؟ "

خاتون۔ "سنئے اس شریر کی بات ہمارے پڑوس میں کہیں خودکشی کی واردات ہوگئی۔ ان کے پاپا نے دفتر جاتے ہوئے خاص طور پر ممانعت کی کہ تم اُدھر نہ جانا پولیس اظہار وغیرہ لے رہی تھی لوگوں کا خاصا مجمع تھا۔ ان کی حفاظت بھی بہت کی گئی۔ لیکن جب نعش کی تصویر اتری تو اس کے پاپا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ لوگوں کے ہجوم میں سب سے آگے انہیں کی تصویر تھی "

ناصر (ہنس کر) کیوں بھئی تم وہاں کہاں پہنچ گئے؟ (لڑکے نے سر اٹھا کر ادھر دیکھا تو عینک غائب تھی)

ناصر۔ (گھبرا کر) عینک کہاں گئی؟ "

لڑکا۔ خاموش

خاتون: "ننھے۔ عینک کہاں رکھی ہے؟ "

لڑکا۔ (بے پروائی سے) بکری کے پاس "

ناصر: بکری کے پاس؟ بکری یہاں کہاں آگئی! "

لڑکا (کھڑکی سے جنگل کی طرف اشارہ کر کے) "وہاں تھی"

اب ناصر کو معلوم ہوا کہ وہ خاتون کی بات سننے میں نہایت اخلاق سے ہمہ تن مشغول رہا۔ اور ادھر لڑکے نے کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کیا کہیں جنگل میں بکریاں چر رہی ہوں گی۔ وہیں عینک گر گئی۔ یا ان حضرت نے دیدہ دانستہ بکری کو متوجہ کرنے کے لئے پھینک دی۔

خاتون۔ (ذرا تیزی سے) اسی لئے میں آپ سے کہنے کو تھی۔ کہ عینک لے لیجئے۔ معلوم نہیں کتنی قیمت کی تھی آپ کو چاہئے تھا نہ دیتے یا کہیں پوشیدہ رکھتے۔ بچہ ہی تو ہے یہ کیا جانے کام کی چیز ہے یا نکمی۔ کیا قیمت تھی عینک کی؟ یہ بھی ایک نقصان ہو گیا۔ بیٹھے بٹھائے۔

ناصر (اس بلا وجہ بوچھاڑ سے گھبرا کر اور بدقت تمام چہرے پہ مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے) جانے دیجئے کچھ ایسی قیمتی نہ تھی۔

خاتون۔ (مطمئن لہجے میں گویا نہایت ہی برحق فیصلہ ہو گیا) یہ بھی اچھا ہوا میں تو گھبرا گئی تھی کہ کہ نہ جانے کتنا نقصان ہو گیا۔ آپ کی فریم شاید معمولی سی تھی؟

ناصر۔ (جلدی سے) جی ہاں لیکن بعد میں اسے خیال آیا کہ دراصل فریم سونے کی تھی۔

خاتون۔ میرے شوہر کی عادت ہے کہ ہمیشہ اس قسم کی چیزیں خالص سونے کی بنواتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بس ایک دفعہ چیز پائدار اور خوبصورت خرید لی جائے۔

(جواب نہ پا کر) ایک طرح یہ عادت اچھی بھی ہے اور ایک طرح نہیں بھی۔

ناصر۔ (بلا سوچے سمجھے کہ زبان سے کیا نکل رہا ہے) "ہاں اچھے ہیں" اب دراصل اُس میں بات کرنے کا یارا باقی نہ تھا۔ ایک عینک گئی دوسرے کتے کا رُدح فرسا خیال تھا کہ اب اسے بھی ساتھ لئے ہوئے خدا جانے کہاں کہاں پھرنا ہوگا

ادھر آیا نے عادتاً اپنی چندھی آنکھیں نہایت بے ہنگم طریقے سے ناصر کے چہرے پر گاڑ دیں آیا کا تو معمول ہی یہی تھا بلکہ اسے محسوس بھی نہ ہوتا ہوگا۔ کہ وہ کدھر دیکھ رہی ہے۔ لیکن ناصر نے ان نگاہوں کو بھی اپنی پریشانیوں کا ایک اہم جزو قرار دے لیا بار بار چہرے کو ادھر ادھر پھرا کر اس کی نظروں سے بچنے کی بے حاصل کوشش کرتا خوش قسمتی سے عین اس وقت گاڑی ایک اسٹیشن پر آ کر رک گئی۔ وہ جلدی سے نیچے اترنے لگا۔

خاتون۔ "کہاں جائیے گا؟ ذرا جلد واپس لوٹئے۔ گاڑی یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی" ناصر نے کہا۔ ہاں غالباً زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرتی اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ کسی طرح یہاں سے نجات حاصل کر کے کسی اور درجے میں جا بیٹھے، چنانچہ کچھ دور جا کر وہ چپکے سے ایک ڈبہ میں جا داخل ہوا۔ دو ایک دفعہ مجرمانہ طور پر پیچھے مڑ کر بھی دیکھا اتنے میں ایک صاحب ہاتھ میں بیگ لئے ہوئے اندر داخل ہوئے بیگ پر نظر پڑتے ہی معاً ناصر کو اپنے بیگ کا خیال آ گیا اور پھر جلدی

سے وہ نیچے اتر پڑا طوعاً و کرہاً اسے واپس لوٹنا پڑا۔ ادھر خاتون متفکرانہ انداز میں کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھیں۔ ناصر کے دل میں چونکہ اپنے "جرم" کا احساس تھا اس لئے اب اُسے مجبوراً ایک نل پر بھی جانا پڑا۔ ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ ایک آدھ کُلی کی۔ اس کے خیال میں یہ ثابت کر دینا ضروری تھا کہ گاڑی سے کسی کام ہی کے لئے باہر نکلا تھا ورنہ خاتون تاڑ جائیں گی کہ یہ یہاں سے فرار ہونے کی فکر میں تھا۔ لیکن خاتون کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یہ اس خوشگوار صحبت سے اس قدر تنگ آچکا ہے۔ ناصر گاڑی میں داخل ہوا۔ چہرے پر زبردستی کچھ مسکراہٹ کے آثار پیدا کئے لیکن آنکھوں سے ایسی دہشت برس رہی تھی کہ گویا شدتِ تکلیف سے ابھی پاگل ہوا چاہتا ہے۔ خاتون نے اسے دیکھتے ہی ایک قہقہہ لگایا پھر بچے کو مخاطب کرکے بولیں "وہ آگئے تمہارے پرانے دوست" "بس اب چپ ہو جاؤ"۔ لڑکا کچھ بسور رہا تھا۔ اور یہاں سے اٹھ کر اپنی ماں کے پاس چلا گیا تھا۔ ناصر اپنی جگہ کو خالی پاکر کچھ خوش ہوا اور اطمینان سے بیٹھتے ہوئے پوچھا "یہ کیوں رونے لگے"

خاتون۔ "بس ادھر آپ گئے ادھر انہوں نے رونا شروع کر دیا کہ مجھے ساتھ لے کر کیوں نہیں گئے۔ میں بھی سٹیشن پر گھومنے جاؤں گا۔ دراصل اس کے پاپا کی یہی عادت ہے۔ کہ ساتھ ہوں۔ تو بس اسے ایک جگہ بیٹھنے نہیں دیتے۔ ہر سٹیشن پر ساتھ لیا اور گھوم آئے وہ کہتے ہیں کہ اس طرح بچہ ایک جگہ بیٹھا گھبرا جاتا ہے۔ اب انہیں ایک جگہ بیٹھے دیر ہو گئی۔ تو لگے گھبرانے کہ ہمیں یہیں چھوڑ گئے اور خود اسٹیشن کی سیر کرنے چلے گئے"

ناصر (دل میں) "گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے" اب اسٹیشن پر اتر کر بھی چند اطمینان کے سانس لینے سے رہا۔ خیر اسی میں ہے کہ اب یہاں سے حرکت نہ کروں لیکن پھر ناول نکالا پڑھا تو خیر اس حالت میں کیا جاتا، فقط اس خیال سے ناول پر نگاہیں جما دیں کہ بچے کی معمولی سے معمولی حرکت پر جس میں کوئی دلچسپی یا دلکشی نظر نہ آتی تھی اسے خاتون کے ساتھ ان قہقہوں میں شریک ہونے سے نجات حاصل ہو جائے جو اس ذلت اس کے دیکھتے ہوئے دل پر نمک پاشی کا کام کر رہے تھے لیکن اس حالت میں ابھی کچھ ہی عرصہ گذرنے پایا تھا کہ دھڑام سے کوئی چیز آکر اس کی گود میں گری اور ساتھ ہی آواز آئی "لو یہاں بیٹھو" نظر جو اٹھا کر دیکھا تو وہی کتا اس کی گود میں تھا اور لڑکا پاس کھڑا ہنس رہا تھا۔ بے ساختہ ناصر کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس نے جلدی سے کتے کو نشست پر پٹخ دیا۔ لڑکے نے تالیاں بجانی شروع کیں ادھر اتنے بڑے آدمی ہو کر ڈر گئے "خاتون بھی ہنس رہی تھیں۔ جلد ہی ناصر کے چہرے سے تنفر کا اظہار کم اور ندامت کے آثار زیادہ ظاہر ہونے لگے۔ خاتون نے کہا آپ پڑھنے میں لگے ہوئے تھے لیکن ان کو آپ کی خاموشی ناگوار گذری۔ ناصر نے ناول پھر بند کیا اور لڑکے سے یوں مخاطب ہوا "اچھا یہ آپ کا کتا ہے"

لڑکا۔ ہاں۔ لیکن دیکھئے صاحب! یہ ایسا گندا کیوں ہے۔ بار بار منہ سے تھوک نکال دیتا ہے۔ ساتھ ہی تیزی سے ناصر کی جیب سے اس کا ریشمی رومال کھینچ لیا۔ اور اس سے کتے کا منہ اچھی طرح صاف کر کے پھر اُسی تیزی کے ساتھ دوبارہ اُسے ناصر کی جیب میں ڈال دیا۔ ناصر اب بالکل خاموش تھا وہ خیال کر رہا تھا کہ چلتی گاڑی سے نیچے کود کر جان پر کھیل جانا زیادہ آسان ہے۔ یا کچھ دیر اور اس لڑکے کے کھیلوں کا تختۂ مشق بنا رہنا کچھ دیر کے لئے بچے نے اپنی تمام توجہ

کتے کی طرف مبذول کرلی اُدھر خاتون آیا سے دِلّی پہنچنے کے متعلق گفتگو کرنے لگیں۔ ناصر نے غنیمت سمجھا اس نے جلدی سے سر کھڑکی سے باہر نکال لیا بھوڑی ہی دیر کے لئے اس دلخراش منظر سے نظر ہٹا لینا اس کے لئے بے حد غنیمت تھا وہ چاہتا تھا کہ کہیں جلد جالندھر کا اسٹیشن آجائے لیکن ساتھ ہی جب کتے کا خیال آتا تو پھر دل بیٹھ جاتا حقیقت میں وہ دُعا مانگ رہا تھا کہ "آلہی کتے والی کو ضرور راسٹیشن پر موجود رکھیو"

کچھ دیر بعد پھر لڑکے نے اس کا شانہ ہلایا۔ اور کہا آپ ذرا ادھر تو دیکھئے۔ اس حبکی شریر کی طرف یہ پھر تھوکنے لگا" ناصر نے ذرا مڑ کر دیکھا اور پھر بدستور سر کھڑکی سے باہر رکھا۔

لڑکا۔ (دوبارہ شانہ ہلا کر) ذرا رومال تو دیجئے ؟

ناصر۔ (بغیر ادھر دیکھے) خود ہی لے لو۔

لڑکے نے پھر رومال جیب سے کھینچ لیا۔ لیکن اس دفعہ ساتھ ایک چھوٹا سا بٹوا بھی نکل آیا۔

لڑکا۔"صاحب یہ میں لے لوں" ؟

ناصر۔ (بغیر دیکھے) "لے لو" اس نے دل میں کہا۔ اچھا ہے کہ اس ناپاک رومال سے یہیں چھٹکارا ہو جائے بٹوے کا خیال تک اس وقت اس کے دل میں نہ تھا لڑکے نے بٹوے کو اِدھر اُدھر سے دیکھ کر جیب میں رکھ لیا۔ اور اپنی جیب خالی کرنے کے لئے ڈبل روٹی کا ایک توس نکال کر رومال کے ساتھ ہی ناصر کی جیب میں ڈال دیا۔ ناصر نے پھر بھی مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ کی۔ کچھ عرصہ کے بعد لڑکا کتے سے بھی تنگ آگیا۔ اور اس نے کھیلنے کے لئے جیب سے چاک کا ایک ٹکڑا نکالا۔ پھر دفعتہً کچھ سوچ کر مسکرایا۔ اور چاک سے ناصر کے کوٹ کی پشت پر کچھ لکھا۔ اس کے بعد پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔ ناصر نے یہ سمجھ کر کچھ جنبش نہ کی کہ غالباً انگلیوں سے چھیڑ رہا ہے۔

آخر خاتون نے پھر ادھر توجہ منعطف کی۔ اور پکار کر کہا "کیا دیکھتے ہیں آپ ؟ اب تو آپ کا جالندھر قریب آ رہا ہے"

ناصر۔ فوراً اندر کی طرف سر پھیر کر سیدھا ہو بیٹھا جی ہاں۔ آپ کو تو ابھی کافی دیر ٹھہرنا ہوگا۔

خاتون۔ "کیا اچھا ہوتا اگر ہمارا اور آپ کا ساتھ دِلی تک رہتا"

ناصر۔ جی ہاں پھر تو خوب ہوتا"

لڑکا۔ "کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے"؟

ناصر نے سر کی جنبش سے "نہیں" کہا۔

لڑکا (کتے سے) "جبکی! انسپکٹر صاحب جانتے ہیں"۔ کتے نے فوراً اپنا دایاں پنجہ اوپر اٹھایا۔

رشید نے کچھ جنبش نہ کی۔

لڑکا۔ آپ ہاتھ بڑھایئے تو یہ کاٹتا نہیں آپ سے شیک ہینڈ کرے گا۔ ناصر مسکرا کر خاموش رہا۔
لڑکا۔ "آپ ڈرتے ہیں؟
خاتون: نہیں نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے آپ ذرا تماشا دیکھئے۔"
اب مجبوراً ناصر کو ہاتھ ذرا آگے بڑھانا پڑا لیکن جونہی کتے نے پنجہ اوپر اٹھایا بے اختیار اس نے ہاتھ پھر پیچھے کھینچ لیا۔ اس پر خاتون ہنس دیں لڑکے نے تالیاں بجانی شروع کیں اور ہنستے ہوئے بولا "آپ بہت ڈرپوک ہیں"
خاتون۔ (نہایت ہی مسرت کے لہجے میں) آپ بھی تو یاد ہی کریں گے۔

جالندھر کا اسٹیشن آگیا۔ خاتون جو کھڑکی سے سر نکالے باہر جھانک رہی تھیں ایکدم تالی بجا کر ہنسنے لگیں پھر زور زور سے رومال ہلاتے ہوئے مسرت خیز لہجے میں بول اٹھیں "وہ آگئیں آنٹی" ان الفاظ کو سنتے ہی گویا ناصر کی جان میں جان آگئی۔ فرطِ تشکر سے آنکھیں جھک گئیں۔ اتنی خوشی اسے شاید عمر بھر کسی شخص کے آنے سے نہ ہوئی ہو گی۔
ایک تقریباً ۴۵ برس کی سانولی سی خاتون جو ضرورت سے کچھ زیادہ قد آور اور اسی تناسب سے فربہ اندام تھیں سامنے دکھائی دیں ان کی دو نوجوان لڑکیاں اور دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ ان سب نے گاڑی کے رکتے ہی آکر اس درجے کو گھیر لیا۔ خاتون اور بچے کی توجہ اب زیادہ تر اپنے عزیزوں کی طرف تھی۔ ناصر نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی چھڑی اور بیگ سنبھالا اور خاتون کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔
لیکن ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ پیچھے سے پھر خاتون کی آواز سنائی دی "ذرا ٹھہریئے تو آپ کو آنٹی سے انٹروڈیوس تو کرایا ہی نہیں۔ مگر اب وہ آزاد تھا کسی نئی قید میں پھنسا اس وقت اسے کہاں گوارا ہوتا۔ وہ آگے بڑھتا گیا گویا کچھ سنا ہی نہیں کچھ دور تک اسٹیشن کی بھیڑ بھاڑ کے درمیان خاتون کے ننھے بچوں کے چہچہوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور جب یہ آوازیں بھی ختم ہوگئیں تو اس نے پوری طرح اطمینان کا سانس لیا اتنے میں پیچھے سے آواز آئی "تسلیم! حضرت! کہئے یہ عجیب و غریب خطاب آپ نے کس کارِ نمایاں کے عوض حاصل کیا" ناصر اس وقت شاید کل ہی نوعِ انسان سے اس قدر خوف زدہ ہو رہا تھا کہ باوجود آواز شناسا معلوم ہونے کے بھی اس نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ کہ مبادا کسی اور آفت کا سامنا ہو جائے اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔
ابھی تک اس کا سر چکرا رہا تھا گویا برسوں کی قید بامشقت سے رہائی پا کر چلا آرہا ہے۔ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی ٹکٹ کلکٹر کی صورت دیکھ کر ٹکٹ یاد آیا۔ اور اس نے بٹوا نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن بٹوا یہاں کہاں تھا؟ ڈبل روٹی کے توس کو اس نے بٹوا سمجھ کر نکالا۔ اور بغیر دیکھے چابی گھمانے کے لئے ہاتھ کو عجیب طرح جنبش دی۔ اس پر ٹکٹ کلکٹر کے علاوہ دو ایک اور بھلے آدمی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ معاً ناصر کی نظر توس پر پڑی۔ اور وہ سخت خفیف ہوا۔ دل میں حیران

تھا کہ خدایا یہ کیا ماجرا ہے۔ پھر ایک ایک کر کے تینوں جیبوں کی خوب تلاشی لی لیکن بٹوا یہاں تھا ہی نہیں۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ اُس آفتِ جان لڑکے کی نوازشیں ابھی تک اس کے ساتھ ہیں۔ ٹکٹ کلکٹر اسے شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ناصر نے کہا میرا بٹوا ٹکٹ سمیت گاڑی میں رہ گیا ہے۔ اور پھر واپس جانے کے لئے پلٹا۔ ٹکٹ کلکٹر نے تیز نظر سے دیکھ کر کہا ذرا اچھی طرح تلاش کیجئے گا۔ اس فقرے سے اسے اور بھی اذیت ہوئی۔ آخر پھر اسی پلیٹ فارم پر آیا دل میں سوچ رہا تھا "اب پھر اسی آفت کا سامنا ہوگا جس سے خدا خدا کر کے نجات ہوئی تھی"۔ کبھی سوچتا کہ وہ لوگ یہ نہ کہیں کہ چوری کا الزام لگانے آیا ہے"۔ کبھی خیال آتا خدا جانے بٹوا ملے یا نہ ملے۔ اور خواہ مخواہ کوئی نیا عذاب مول لے آؤں۔ ایک دفعہ یہ بھی خیال آیا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اسٹیشن پر بھیک مانگ کر کرایہ ادا کروں لیکن وہاں نہ جاؤں۔ اسی ادھیڑ بن میں کبھی قدم آگے رکھتا تھا اور کبھی پیچھے۔ اتنے میں پہلی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ آخر اس نے قدم بڑھایا اور جلد ہی پھر گاڑی کے اس ڈبے کے سامنے جا پہنچا۔

خاتون۔ (خوش ہو کر) "آخر آپ پھر آ گئے۔ آنٹی کو آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس تھا"۔

ناصر۔ "جی میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ میرا بٹوا یہیں کہیں گاڑی میں رہ گیا۔ ٹکٹ کے علاوہ نقدی بھی اسی میں تھی۔ دیکھئے میں ٹکٹ کی قیمت بھی ادا نہیں کر سکا"۔

خاتون۔ "یہاں گاڑی میں رہ گیا؟"

ناصر۔ "جی ہاں ذرا جلدی دیکھئے گاڑی جا رہی ہے"۔

خاتون۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر) "یہاں تو بالکل نہیں"۔

ناصر۔ "بچے سے پوچھئے"۔

لڑکا۔ "وہ تو میں نے پھینک بھی دیا"۔

ناصر۔ (گھبرا کر) کہاں؟ کہاں؟

لڑکا۔ "بہت دور ابھی گاڑی کھڑی کہاں ہوئی تھی؟"

ناصر۔ (بیتابی کے لہجے میں) "تم نے کیوں پھینکا"؟

لڑکا۔ "میری جیب میں جگہ تنگ ہو گئی تھی"۔

خاتون۔ (ہنسی کو بدقت روک کر) "دیکھئے اس کی شرارت بھلا آپ کا بٹوا اُس کی جیب میں کیسے آ گیا۔ اس کی تو عادت ہی شرارت کی ہے۔ آپ سچ مان گئے۔ آپ کو چاہئے تھا۔ ایسی چیز حفاظت سے رکھتے"۔

ناصر (منہ ہی منہ میں) حفاظت میں کیا خاک کرتا۔ اتنے میں گاڑی کو حرکت ہوئی۔ (خاتون اپنی خالہ اور اُس کی لڑکیوں سے رخصت ہونے کے بعد ناصر سے متفکر لہجے میں "اب آپ کا کیا انتظام ہوگا؟ پھر فوراً ہی نہایت تدبر کے ساتھ "اچھا آنٹی! آپ فی الحال ان کے ٹکٹ کی قیمت اور جرمانہ ادا کر دیجئے یہ بیچارے اپنا ٹکٹ کھو بیٹھے"۔

گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ خاتون نہایت اخلاق کے ساتھ برابر رومال ہلا رہی تھیں۔ لیکن ناصر کاظمی چاہتا تھا کہ اُس کا بس چلے تو اس وقت تمام دنیا کی عورتوں اور بچوں کو یک قلم دُنیا کے تختے سے نیست و نابود کر دے۔

بالآخر وہ گھر پہنچ ہی گیا۔ اس قدر شدید نقصان اٹھانے کے باوجود اسے اس وقت ایک سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا لیکن جونہی کوٹ کی پشت پر نظر پڑی کیا دیکھتا ہے کہ سیاہ کوٹ کی پشت پر سفید چاک سے نہایت نمایاں طور پر Dog لکھا ہُوا ہے۔

اس نے کوٹ اٹھا کر زور سے فرش پر پٹک دیا اور کہا جبھی میں بھی کہوں۔ ہر سامنے سے آنے والے کی بہ نسبت ہر پیچھے سے آنے والا کیوں ایک دفعہ زیادہ غور سے میرے چہرے کو تکتا ہے۔

"راہرو"

اقوال

انسان کا پہلا اور آخری تنزل یہ تھا کہ بتوں کو پوجنے کے قابل نہ رہا۔ منہ پھٹ پیغمبر اقبال کیا پتے کی بات کہہ گیا ع

تراشیدم، پرستیدم، شکستم

مگر بتوں کو توڑنے والا خود کب ٹوٹے گا؟ عمارتوں کے کھنڈر کچھ بھی نہیں، وہ کھنڈر جنہیں دیکھنے سے اصلی عبرت ہو گی انسان کے کھنڈر ہونگے۔ انہیں کون دیکھے گا۔ .... خدا

یہ جو ٹکے سیر کفر سر راہ آج کل بکتا ہے محض دیسی گلاسٹرا ایمان ہے۔ اصل ولائتی کفر یہاں آتا ہی نہیں یہاں کے ایک کافر نے یہ لکھ ڈالا کہ محض پرانے پیر کی وجہ سے خدا شیطان کی مدد نہیں کرتا ورنہ یہ دنیا کہیں سے کہیں ترقی کر جاتی کس قدر کچا کافر تھا کہ اس کے نزدیک گویا اب تک یورپ اور امریکا خدا کی مدد کے محتاج ہیں۔ پکا کافر ہونا کس قدر مشکل ہے۔

تہذیب کا تازیانہ انسان سے کیا کیا نہ قبولوا دیگا! یہ تو مدت ہوئی کہ انسان انگوٹھا لگا کر تحریر دے چکا کہ مذاہب اور مذاہب کے اوہام سب باطل تہذیب کی مار پیٹ سی مجبور انسان نے پہلے تو خدا کو بتخانوں سے نکال کر آسمان پر بٹھایا پھر آسمان سے اتار کر خود اپنے ذہن کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ہستی مطلق کہکر اسے مقید کیا اب انسان خود اس تنگ و تیرہ ذہنی زندان سے بھی شکر ہے کائنات نے انسان کے پیچھے کس غرض سی یہ پولیس لگا رکھی ہے؟ کس جرم کے بدلے؟ بس یہی کہ عقل ہے نہ عقل ہے! کبھی جو یونہی گردن موڑ کر ان سال و ماہ کو دیکھ لیتا ہوں جو پس پشت ہیں تو جلدی سے منہ پھیر لیتا ہوں اُس تمام دُھند لکے میں اگر کچھ اجالا ہے تو دو چار ابلہانہ امنگوں کا کیا اب بھی وہی غلطیاں کرتا جاؤں؟ کیا انسان غلطیاں کرتے کرتے صراط المستقیم کی طرف کھٹک نکلتا ہے؟ یا کیا یہ بات ہے کہ جنہیں ہم نادانیاں سمجھتے ہیں وہی اصل زندگی ہیں۔ کون بتائے اور کون سمجھے؟

فلک پیما

غزل

آج دل میں اثرِ الفت کامل دیکھا
آج دل کو ترے ارمان کے قابل دیکھا

دونوں عالم کی خوشی نذرِ نظر کر بیٹھا
آپ نے بندۂ درگاہ کا بھی دل دیکھا

ہم نے پایا بھی تو اک دردبھرا دل پایا
ہم نے دیکھا بھی تو یہ زیست کا حاصل دیکھا

طلبِ دوست کے صدقے کہ زباں کو دن رات
دوست کے نام کی تسبیح میں شاغل دیکھا

طالبِ دوست کو اللہ کا طالب سمجھو
واصلِ دوست کو اللہ سے واصل دیکھا

ہم تو محتاج ہیں، شاہوں کو گدا بن بن کر
تیری سرکار گدا دوست میں سائل دیکھا

ساقیِ بزم اترا جام بہ کف آنا تھا
بزم کی بزم کا ایمان متزلزل دیکھا

بحرِ الفت متلاطم ہے تو ہو ---- کیا پروا
اب خدا چاہے تو نظارۂ ساحل دیکھا

شکر صد شکر صعوباتِ سفر ختم ہوئیں
اور آنکھوں سے جمالِ رخِ منزل دیکھا

عشقِ اصنام بھی ہے، دعویٰ اسلام بھی ہے
تم کو آزاد! عجب مرشدِ کامل دیکھا

حکیم آزاد انصاری

وُہ

میں نے اُس دن جارج مُور کا ناول "ایستھر واٹرز" ختم کیا تھا۔ کچھ عرصہ میں آرام کرسی پر نیم دراز، ناول کے مجموعی اثر پر جو مجھ پر ہؤا تھا غور کرتا رہا۔ سب سے نمایاں یہ احساس تھا کہ مصنف نے گھوڑ دوڑ اور متعلقہ شرط بازی، اور اس کے الم ناک نتائج پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اسی وجہ سے افرادِ قصہ زیادہ ابھرے نہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اگر ان سے ان کی زندگی کا انہماک جُدا کر دیا جائے تو بجائے خود وہ کوئی نمایاں یا نادر شخصیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ ہیروئن کی سیرت مصنف کے غائر مطالعۂ زندگی کا نتیجہ تھی۔ پھر بھی پڑھتے پڑھتے یہ نہیں ہؤا تھا۔ کہ اس کی سیرت کی عظمت کا رعب مجھ پر چھا جائے۔ بلند سیرتوں اور ان کی زندگی کے عظیم واقعات کے بیان میں جہاں کسی موقع پر کسی کشمکش کی بدولت ان کی ہستیاں بہت بلندی حاصل کر لیتی ہیں، پڑھنے والے پر عموماً ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس کے دل میں ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے۔ بس یہ کیفیت اس ناول سے مجھے محسوس نہ ہوئی۔ کتاب متعدد جگہوں پر موثر تھی، مگر وہ بات نہ تھی۔

یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شبہ ہوا کہ کمرہ تاریک سا ہو رہا ہے۔ اور تھا بھی یونہی۔ باہر نکلنے سے معلوم ہوا کہ آفتاب غروب ہونے کو ہے۔ مشرق کا شہسوار اپنے سنہرے جلال میں رخصت ہو رہا تھا۔ میں کچھ دیر گیلری میں کھڑا رہا مگر شام کی بڑھتی ہوئی خاموش افسردگی نے کوئی تازگی نہ بخشی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس سے ماتھے کو ایک خوشگوار ٹھنڈک محسوس ہوئی مگر دل تھکا ہؤا سا تھا۔ اس لئے کمرے میں لوٹ آیا اور چراغ جلا کر کتابوں کی الماری کے پاس آ کھڑا ہؤا۔ میرے لئے مطالعہ یا کسی حسین شے کے تصور کے بعد اگر کوئی دلچسپی ہے۔ تو اپنی کتابوں پر نظر ڈالنا ہے گھنٹوں پہروں تو نہیں مگر منٹوں فقط نظر ڈالتا رہتا اور لطف اٹھاتا رہتا ہوں چنانچہ اس موقع پر بھی یہ شغل عرصہ تک رہا سوچتا تھا کہ کونسا ناول پڑھوں۔ پھر خیال آیا کہ متواتر کئی دنوں سے ناول پڑھ رہا ہوں۔ کوئی مفید علمی کتاب نہیں پڑھتا۔ یہ بہت بری بات ہے چنانچہ فیصلہ کیا کہ یک لخت تاریخ، یا سیاست یا سائنس کی کتب کا مطالعہ شروع کر دینا چاہیے اوپر کے تختے پر نظر دوڑائی۔ وہاں فقط "ٹھوس" کتابیں تھیں۔

رات کا وقت تھا میں نے سوچا کہ ایسے مضامین دن کے لئے ہوتے ہیں۔ رات کو تو کوئی "ملائم" سا اور رنگین سا مضمون ہو تو پڑھا جائے۔ آخر دماغی اذیت سے بھی تو کوئی فائدہ نہیں اس لئے ایک پل کے لئے خیال ہوا کہ نظم پڑھوں، ایک دہکتے ہوئے لمحے کے لئے ایک سرور سا محسوس ہؤا۔ مگر پھر اس کے لئے بھی صبح کا وقت ہی موزوں سمجھا۔ ایک پل کے لئے خیال ہوا کہ شا کا طویل ڈراما "بیک ٹو متوسلح" ہی پڑھ لیا جائے۔ مگر پھر سوچا کہ شا تو ناول سے بھی دلچسپ ہوگا اور پھر وہ کافی "ٹھوس" نہ ہوگا کہ پچھلے ناولوں کا کفارہ

ادا کر سکے۔ اس لئے قطعی فیصلہ کر لیا کہ تنقید کی کوئی کتاب پڑھی جائے۔ چنانچہ ایبرکرامبے کی "ایک" نکال لی اور الماری کو بند کر دیا
کتاب لئے اِدھر ہٹا اور اس کی ورق گردانی شروع کی۔ مگر جہاں تک مجھے خیال ہے میں ساتھ ہی یہ سوچ رہا تھا کہ مصنف نے اگر اپنے نظریہ کی توضیح اور تشریح کے لئے نظموں کے اقتباسات دیئے ہوں تو خوب لطف ہو مگر مجھے ایک خفیف سا صدمہ ہوا جب یہ دیکھا کہ اگر حوالے دئیے ہیں تو انگریزی شعرا کے نہیں، یونانی یا لاطینی شعرا کے ہیں مگر ساتھ ہی کتاب کے کم حصّہ "محظوظ" ہونے کا یقین ہو گیا۔ اب خیال ہوا کہ پنسل ضرور ہاتھ میں ہونی چاہئیے۔ تاکہ بوقتِ ضرورت نشان لگانے میں تکلیف نہ ہو اس لئے پنسل کے لئے میز کی دراز کھولی پہلے تھوڑی سی کیونکہ خیال تھا کہ پنسل پاس ہی پڑی ہو گی مگر معلوم ہوتا تھا کہ ہلنے ہلانے سے کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی ہے۔ اس لئے دراز کو اور باہر کھینچا اور کاغذات اٹھائے پلٹائے مگر نہ ملی۔ دراز میں بہت سے کاغذات تھے، دوستوں بھائیوں کے خطوط اور اخباروں کی کاٹیں ڈائری، نوٹ بک اور دیگر اشیا۔ سوچا کہ یہ بے ترتیبی کسی حالت میں جائز نہیں چلو اسے درست کر دو۔ پہلے کاٹوں کو علیحدہ کیا۔ ایک طرف دو ایک جاذب نظر پرچے جو اشتہار کی غرض سے مغربی فرمیں مفت بھیج دیتی ہیں۔ انہیں ایک طرف کیا۔ خطوں کو چھانٹا۔ چند ایک کو غیر ضروری سمجھ کر پھاڑ دیا۔ باقیوں کو ایک کونے میں رکھ دیا ایک ان میں ایسا بھی تھا جسے دوبارہ پڑھنے کو جی چاہا۔ اس لئے اور کام چھوڑ اسے اٹھا کر شروع سے آخر تک پڑھا۔

لفافے اور پیڈ ترتیب سے ایک جگہ رکھے کہیں سے اپنے کتب فروش کا بل نکل آیا اسے رکھنے میں بہت الجھن ہوئی جی تو چاہتا تھا پھاڑ دوں مگر پھر ایک کونے میں رکھ ہی دیا۔ مجھے اکثر اس کی یاد دہانیوں کی وجہ سے بہت غصہ آیا کرتا ہے اور اب بھی بہت آیا مگر میں کام میں مشغول رہا۔ اس دیکھا بھالی میں ایک فوٹو فریم ہاتھ آ گیا، یہ فریم سلولائڈ کا بنا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف انگور کی بیل ابھری ہوئی تھی۔ انگور کاسنی رنگ کے تھے۔ البتہ بیل سنہری تھی یاد آیا کہ یہ فریم ایک دوست نے چھ سال ہوئے دیا تھا کئی دفعہ گم ہوا، پھر مل گیا اسے کھڑا کرنے کے لئے پشت پر جو سہارا لگا ہوا تھا وہ تو کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔ اس لئے جتنی تصاویر میرے پاس ہوتی تھیں۔ اسی میں رکھ دیتا تھا۔

سب سے اوپر جو تصویر تھی وہ خاص طور پر اچھی نہیں تھی)۔ ایک دوست نے مدت ہوئی کھینچی تھی۔ اس میں چار ہم عمر لڑکے ایک توپ پر بیٹھے تھے۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ مگر بہت ننّھا سا۔ اپنی تصویر دیکھ کر حیران سا ہوا کہ کچھ سال پہلے کتنا ننھا سا تھا۔ اس لئے تصویر پسند نہ آئی۔ اسے نکال دوسری تصویر دیکھنے لگا۔ یہ ایک جوان لڑکی کی تصویر تھی، جو ایک پھولدار ساڑھی پہنے بید کی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ بالوں پر ایک فیتہ بندھا ہوا تھا چہرہ سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ اس لئے اس میں کوئی خاص دلکشی معلوم نہ ہوتی تھی۔ کچھ عرصہ اسے دیکھتا رہا مگر تصویر روکھی روکھی سی تھی۔

اس کے بعد ایک اور تصویر نکلی جس میں وہی لڑکی اپنی بہن کے ساتھ کھڑی تھی۔ اور مُسکرا رہی تھی تصویر سے اس کا تبسم چھن چھن کر دل میں اترا جاتا تھا کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا کہ آنکھوں میں جذب ہوا جاتا تھا کئی منٹ اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ مگر کوئی یاد تازہ نہ ہوئی۔ دل کی حرکت بھی نہایت پر امن رہی اس کے بعد فریم سے ایک لپٹا ہوا پرزہ برآمد ہوا

ایک پرانے کاغذ کاتہ شدہ پرزہ! اتنا پرانا بھی نہیں مگر پھر بھی یوں معلوم ہوتا جیسے صدیاں ہی گذر گئی ہیں۔ کاغذ کا مضمون مجھے یاد تھا۔ یاد ہی نہیں تھا بلکہ کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔ الفاظ تو انگریزی میں تھے مگر ان کا ترجمہ یہ ہو سکتا ہے "اس کے ساتھ ایک بدقسمت لڑکی کا سرد دل لپٹا آتا ہے، خدا جانتا ہے میں تمہارے لئے کتنی افسردہ ہوں تمہیں پیار کرنے والی بہن"۔

یہ کب میرے پاس آیا۔ اور کیسے، اور "یہ اس" کے کیا معنی ہیں یہ ایک داستان ہے میں نے وہ پرزہ کھولا۔ اس میں ایک ننھی سی تصویر نکلی۔ ایک انچ لمبی اور کوئی نصف انچ چوڑی ہوگی۔ اس میں ایک لڑکی کا ہنستا ہوا چہرہ نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کسی گروپ میں سے یہ تصویر کاٹ لی گئی ہے۔ میں نے اسے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ یہ اسی پھولدار ساڑھی والی لڑکی کی تصویر تھی۔ مگر کیا تصویر تھی! جس طرح ایک نہایت میٹھے راگ کو سن کر دل میں ایک شیریں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے، یا جیسے کسی باغ میں ایک آراستہ اور رنگین پھولوں کے تختے کو دیکھ کر۔ ایک وجد سا آجاتا ہے۔ ویسے ہی اس چھوٹی سی تصویر کو دیکھ کر میرے دل نے ایک ملائم سی گرمی محسوس کی۔ شاعر فطرت کے نظارے، پرندوں کے گیت، شفق کی پر سرور خوبصورتی، عورت کا سراپا بیان کرتے ہیں، مگر جو نشہ، جو لطف، جو لذت اُن کی ہنسی میں تھی میرا دل جانتا ہے۔

بہت سے سال گذر چکے ہیں۔ ہندوستان بڑا ملک ہے۔ وہ کہیں کی کہیں ہیں۔ مگر وہ ہنسی مجھے نہیں بھولتی۔ میں اپنی زندگی کے اس واقعہ کو بھول چکا ہوں۔ مگر میرے دل کے تاریک گوشوں میں ان کی وہ ہنسی ابھی تک روشن ہے۔ مجھے اب بھی یاد پڑتا ہے۔ کہ جب وہ ہنسا کرتی تھیں۔ تو میں سوچا کرتا تھا۔ کہ دنیا میں اس سے زیادہ بھی کوئی حسین شے ہوگی! میں کئی جگہ پھرا ہوں۔ کئی حسین چہرے دیکھے ہیں! کئی ایک کو ہنستے بھی دیکھا ہے۔ مگر میں نے وہ آب و تاب وہ چمک کہیں نہیں دیکھی۔ ان کا حسن صبیح تھا۔ اور ہونٹ گلابی تھے ہلکے گلابی اور نرم اتنے نرم کہ دیکھتے ہی سے نرمی کا احساس ہو جاتا تھا۔ مگر جب وہ ہنستی تھیں۔ تو سوائے اُن کے دانتوں کی چمک اور ہنسی کے خمار آگیں اثر کے کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔ سنا تھا کہ لوگ ہنسی کو سردیوں میں سورج کے یکدم بادلوں سے نکلنے یا رات کو پھلجھڑی کے چلنے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مگر جب تک انہیں نہ دیکھا تھا۔ یہ تشبیہات بالکل بے مزہ اور پھیکی معلوم ہوتی تھیں۔

اور یہ تصویر کسقدر دلکش تھی کتنی پیاری تھی۔ انکے سر پر دوپٹا ذرا ڈھلکا ہوا تھا۔ اور بال کچھ بکھرے ہوئے، اور اب جو میں سوچتا ہوں۔ تو کب ان کے بال بکھرے ہوئے نہیں ہوئے تھے، اور چہرہ ہنستا ہوا۔ ایسا کہ ان کا سارا مکھڑا پھول کی طرح کھلا ہوا ہوتا تھا۔ آنکھیں کیا اور رخسار کیا سارا چہرہ شگفتہ تھا۔ اور یہ تصویر کتنی منتوں کے بعد اور کب ملی۔ جب میں مانگتا تو وہ کہتیں۔ یہ میری سہیلیوں کا گروپ ہے خراب ہو جائے گا۔ میں کیسے کاٹ دوں۔ اور پھر کس طرح بن مانگے مل گئی!۔

وہ دن بھی اور دنوں کی طرح ایک دن تھا۔ دھوپ تھی، ہوا تھی، کمرہ تھا اور میں تھا۔ ان کی بہن نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں ایک خوشخبری سناؤں"۔ میں کتاب پڑھ رہا تھا میں نے کہا "کیا ہے آپا جان"؟ کہنے لگیں "اچھا تم بوجھو" میں

نے کہا۔"تو یہ خوشخبری ہے کہ بھارت"؟ اور ساتھ ہی اس موقع پر جب کتاب دلچسپ ہو رہی تھی۔ ان کے آنے سے کرمعا۔ مگر یہ بہن ان سے عمر میں بڑی تھیں میں کیا کہتا خوشخبری سننے کے انتظار میں کتاب کو بند کر دیا۔ مگر وہ مجھ سے ہٹ کھڑکی کے پردے درست کرنے لگ گئیں۔

یہ ان کے مکان کا واقعہ ہے میں دو دن کے لئے ان کے ہاں مہمان تھا۔ ان کی والدہ میری پھوپھی تھیں۔ صبح چار کے بعد کتاب دیکھ رہا تھا۔ کتاب بھی وہ اپنے کالج کی لائبریری سے لائی تھیں۔ آسکر وائلڈ کی "امپارٹنس آف بی انگ ارنسٹ" تھی۔ میں زبان کی گفتگو کی چاشنی سے لطف اٹھا رہا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ اگرچہ کسی خوشخبری کے لئے کتاب سے جدا ہونا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر ان کی بات سننے کے لئے ایک مشتاق اور چاک چوبند سامع چاہیے تھا۔ اور ادھر میں ایک دلچسپ کتاب سے زبردستی علیحدہ کیا گیا تھا۔ اسلئے انہیں میرا استغنا پسند نہ آیا۔ پردوں سے ہٹ کر وہ میز کی چیزیں درست کرنے لگ گئیں۔ اب انہیں انتظار تھا کہ میں پوچھوں، مجھے لگن تھی۔ کہ وہ جائیں تو کتاب پڑھوں۔ میز کی آراستگی کرتے وقت تو وہ گویا بھول ہی گئیں۔ کہ کیا بات کہنی تھی۔ میں نے کتاب کھول لی۔ اس پر انہوں نے کہا۔ "تم بھی ایک ہی ہو" اب مجھے کچھ کہنا ہی پڑا۔ "تو آخر بتا یئے نا وہ بات کیا تھی"؟

"سکینہ کی منگنی ہو گئی ہے"

"اچھا!!!" میں نے یہ اتنا کہا۔ اور بس۔

تعجب یہ تھا۔ کہ میں نے ابھی تک سنجیدگی سے اپنے جذبات کا مطالعہ نہ کیا تھا۔ اور نہ مجھے ان کی گہرائی کا کچھ اندازہ تھا۔ بلکہ یہ بھی صحیح علم نہ تھا۔ کہ ان میں صداقت کتنی ہے شروع شروع میں تو موقع ہی نہ تھا۔ مگر بعد میں بھی میں نے صورتِ حالات تسلیم کر لی تھی۔ اپنی سریع الحسی کا مجھے پتہ تھا۔ اور چونکہ ایسے تاثرات سراب صفت تھوڑی مدت میں ناپید ہو جایا کرتے تھے۔ اس لئے میں نے احتساب نفس کی طرف توجہ نہ دی تھی چنانچہ اس خبر کا ظاہراً مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ ہاں یہ بات مجھے یاد ہے۔ کہ "اس خوشخبری" کی تمہید اور آپا سے مکالمہ اور کتاب کی دلچسپی نے جو بشاشت چہرے کو دے رکھی تھی۔ وہ یک لخت موقوف ہو گئی حیرت ہے۔ کہ اس امر کا احساس کیوں مجھے فوراً ہو گیا۔ مگر یہ سچ ہے کہ آپا سے باتیں کرتے وقت جو شکن گالوں پر پڑ گئے تھے ۔۔۔ شاید میں مسکرا رہا تھا یا کیا۔ ان کا مجھے فوراً احساس ہوا۔ کہ وہ بے محل ہیں۔

میں نے کتاب اٹھا لی۔ مگر اب آپا شروع ہو گئی تھیں۔ اس لئے میں سنتا گیا۔ "وہ ڈپٹی ہے۔ اس کی زمین بھی ہے۔ ٹھیکے پر دے رکھی ہے۔ لاہور میں کوٹھی بنوا رہا ہے۔ حال ہی میں موٹر لی ہے۔ باپ نہیں ہے۔ ایک بہن ہے۔ اور وہ بھی بیاہی ہوئی۔ بہت ہی اچھا رشتہ ہے چچا جان نے رشتہ ڈھونڈا ہے۔ وغیرہ اور وغیرہ۔

اتنے میں آپا چپ ہو گئیں۔ مجھے یونہی سا احساس ہوا۔ کہ وہ ابھی کمرے میں موجود ہیں۔ میں نے پلٹ کر

دیکھا تو اس دروازے میں جو ساتھ کے کمرے میں کھلتا تھا۔ وہ کھڑی تھیں۔ اور ان کا چہرہ خشمگیں سا تھا۔ میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ میرے جذبات کی عکاسی کر رہا ہوگا۔ کیونکہ وہ یکدم مسکرا پڑیں۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ اس مسکراہٹ سے مجھے تکلیف ہوئی یا خوشی مگر جواباً مجھے مسکرانا ضرور پڑا۔ پھر ہم سب بیٹھ گئے۔ کچھ دیر چپ رہے۔ اب بات کون شروع کرے۔ میرا بولنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ یونہی بدن سست سا پڑ گیا تھا۔ مگر وہ موجود تھیں میں نے ناچار ان سے پوچھا۔ "آپ نے یہ ڈراما پڑھا ہے؟" مگر اس کا جواب انہوں نے اس بے التفاتی سے دیا کہ میں پھر نہ بولا۔ آپا نے دو ایک باتیں کیں۔ مگر میں گم سم تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا۔ میری طبیعت کی گرانی بڑھتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ آپا اکتا گئیں۔ اور انہیں ساتھ لے کے کسی کپڑے کی بیونت کی فکر میں چلی گئیں۔

ایک گھنٹہ گذر چکا ہوگا۔ مگر میں نے کتاب کے مطالعہ میں دو صفحوں سے زیادہ ترقی نہ کی تھی۔ دماغ کے کسی پردے میں الفاظ کی برجستگی اور ظرافت کا احساس تھا۔ مگر کتاب پڑھی نہ جاتی تھی۔ اس لئے یونہی پڑا سوچ رہا تھا۔ پریشان خیالات کھلے پھر رہے تھے۔ ان میں کوئی ربط نہ تھا۔ مجھے یہ باتیں یاد ہیں۔ کیونکہ ایک مدت کے بعد اس دن میں نے اپنا مطالعہ کیا تھا۔ اگرچہ کچھ غنودگی سی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ مگر یہ سب باتیں کچھ عجیب طرح سے دماغ پر نقش ہیں میں نہیں کہہ سکتا کب تک ایسے ہی پڑا رہتا۔ مگر یک لخت میں چونک پڑا۔ درمیانی دروازے کا پردہ ہلا اور وہ اندر آگئیں۔ اب کی انکا چہرہ افسردہ تھا اور ان کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا پرزہ تھا۔

فیاض محمود

ترا ناز بھول بیٹھا مری سب نیازمندی	بغرورِ دل ربائی بہ یقینِ دلپسندی
تری بزمِ ناز ظالم ہے عجب طلسمِ حیرت	کہ جہاں ہے میرے دل کو سرِ خدمت سپندی
غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں	مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں	کوئی اُس سا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے	جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

اے غائب از نظر بہ خدامی سپارمت	جانم بسوختی و بہ دل دوست دارمت
تا پایدم شدن سوئے ہاروتِ بابلی	صد گونہ ساحری بکنم تا بیارمت

محفلِ ادب

ایک نظم

میں نظم لکھ چکا۔ اس کے الفاظ کیسے آسان کیسے خوبصورت ہیں۔ اس کی زبان کیسی پیاری ہے۔ اس کے جذبات کیسے بلند اور پاکیزہ ہیں اسے میری بیوی نے بھی پسند کیا ہے۔ اور مجھے تو خواب بھی اسی کے آتے ہیں۔ یہ نظم نہیں نظموں کی روح ہے لیکن اب یہ کسی بلند مرتبہ رسالہ میں شائع ہو جائے۔ تو لوگوں پر بھی میری عظمت آشکار ہو۔ سمجھتے ہیں معمولی آدمی ہے چونک اٹھیں گے۔ سارے شہر میں شور مچ جائے گا ـــ اب میں شاعر ہوں۔ پہلے صفحہ پر شائع ہو گی۔ آئندہ ماہ ایڈیٹر صاحبان تصویریں مانگیں گے۔

مگر افسوس ایڈیٹر بیوقوف نکلا۔ اس نے میری نظم لوٹا دی۔ بالکل احمق ہے شعر و شاعری کی قدر کیا جانے۔ امیر باپ کا بیٹا ہو گا۔ ایڈیٹر بن بیٹھا۔ مگر اس سے ادب شناسی کی قابلیت تو پیدا نہیں ہو جاتی۔

چلو خود شائع کر دیں۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی شاعر سے پالا پڑا ہے کا ایک نیو ز پیچ دیں گے اور کیا۔

میرا خیال غلط نکلا ساری دنیا ہی اندھی ہے نظم شائع ہو گئی لیکن بازاروں میں لوگ اُسی طرح خرید و فروخت کر رہے ہیں بھنگیٹیر اسی طرح بھرے پڑے ہیں۔ دکاندار اسی طرح دوکانوں میں بیٹھے ہیں کسی کو پروا نہیں۔ کہ میری نظم شائع ہو گئی اور اسے پڑھے۔ ساری دنیا بیوقوف ہے۔ اگر کالیداس زندہ ہوتا۔ تو آج اُسے نیند نہ آتی۔ اگر تلسی داس زندہ ہوتا تو آج اسے پرماتما کی یاد کرنا بھول جاتی۔

چندن بجوائے زنا کر پونا (مرہٹی)

میر مہدی مجروح دہلوی کا ایک خط

از دہلی ۵ر فروری ۱۸۸۰ء

شاہ عالی کو میر مہدی مجروح کی طرف سے سلام و دعا دونوں پہنچیں۔ سلام اس لئے کہ مخدوم زادے ہو دعا اس لئے کہ بھائی کرامت حسین ہمدانی مرحوم کے بیٹے ہو۔ استاد غالب مرحوم کے زمانہ میں شعر و شاعری کا جو چرچا یہاں تھا اس کا حال کیا لکھوں اگلی صحبتیں جو یاد آتی ہیں تو آنکھ سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑتا ہے۔ اس زمانے میں قلعہ معلی میں شاہی اہتمام سے مشاعرے ہوا کرتے تھے مخصوص اشخاص کو شرکت کی اجازت ملتی تھی۔ بادشاہ اور ولیعہد دونوں شعر گوئی کے دلدادہ تھے۔ بادشاہ خود تشریف لاتے تھے اساتذۂ وقت کے علاوہ دوسرے مشہور شعرا کو بھی باریابی کا موقع ملتا تھا جب کسی امیر و رئیس کے صاحبزادے بہ حیثیت شاعر اس جلسے

میں آتے تھے۔ تو سب سے پہلے بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اور پھر وہ اپنا کلام سناتے تھے۔

اُستاد غالب مرحوم اپنی زندگی میں دو بار کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں انہوں نے اپنی غریب الوطنی کی حالت اور اہل کلکتہ کی ناقدری کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

اے رئیسانِ ایں سوادِ عظیم ❊ اے فراہم شدہ ز ہفت اقلیم
بہ تظلم رسیدہ استم ایں جا ❊ بہ امید آرمیدہ ستم ایں جا

اسد اللہ بخت برگشتہ ❊ در خمِ پیچ معجز سرگشتہ
آں کہ در رسم کارسازی کو ❊ شیوۂ میہمان نوازی کو

گرچہ ناخواندہ میہمانِ شماست ❊ بے سخن ریزہ چینِ خوانِ شماست
با من ایں خشم و کیں دریغ دریغ ❊ من چناں تا چنیں دریغ دریغ

اُستادِ مرحوم کی اصلاح بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ ایک بار خواجہ الطاف حسین حالی نے یہ شعر لکھا تھا۔ حالی ؎

یارب اِس اختلاط کا انجام ہو گا کیا ❊ تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

میرا خیال تھا کہ شاید اس پر اصلاح نہ ہو گی۔ مگر حضرت نے پہلے مصرعہ میں صرف ایک لفظ ایسا رکھ دیا جس سے شعر کا عالم ہی کچھ اور ہو گیا۔ دیکھو کیا اچھی اصلاح دی ہے ؎

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر ❊ تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

"انجام ہو بخیر" اس ٹکڑے کا کیا کہنا ہے۔ ہائے اُستادِ مرحوم اب کہاں۔ اللہ بس باقی ہوس۔ (س۔ ق)

مالی سے

اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!!

میں نے ابھی آنکھ کھول کر دنیا کو نہیں دیکھا۔ ابھی تک میری خوبصورتی دنیا کے سامنے نہیں آئی۔ ابھی تک میرا چہرہ طفلی کی موہنی سے محروم ہے —— اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!

مجھے تیز و تند ہوا سے بھی ڈر لگتا ہے، پانی کی بوچھاڑ سے بھی ڈر لگتا ہے۔ مجھے دُھوپ سے بھی ڈر لگتا ہے مجھے چھاؤں سے بھی ڈر لگتا ہے —— اے مالی ابھی مجھے نہ توڑ۔

میں چاہتی ہوں سکھیوں سے ملوں۔ آہستہ آہستہ ہوا میں رقص کروں اور دنیا کے سرسبز و شاداب مناظر دیکھوں اے مالی!! ابھی مجھے نہ توڑ!

طفلی کا زمانہ پھر نہ آئے گا۔ یہ بڑی جلدی بیت جاتا ہے اور بڑی دیر میں بھولتا ہے —— اے مالی!! ابھی مجھے نہ توڑ!

وہ دیکھ میرا شباب اٹکھیلیاں کرتا ہوا آ رہا ہے۔ وہ میری قدر و قیمت لوگوں کی نگاہوں میں پیدا ہو رہی ہے۔ وہ چاند کی کرنیں میرا منہ چومنے کو آسمان سے زمین پر اتر رہی ہیں —— اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ!

ابھی بلبل نے میری شان میں گیت نہیں گائے۔ ابھی دیوتاؤں کے جسم نے میری خوشبوؤں میں غسل نہیں کیا۔ ابھی سورج کی شعاعوں نے میرے منہ کا گھونگھٹ نہیں اٹھا —— اے مالی! ابھی مجھے نہ توڑ! (چندن بحوالہ بنگ پر بھات بنگالی)

فہرست مضامین ہمایوں

بابت ماہ مئی ۱۹۳۲ء

تصویر :۔ محبت

ہمایوں کے سالگرہ نمبر کے متعلق رائیں

(۱)

(کپتان سردار سکندر حیات خاں صاحب ریونیو ممبر)

جنوری نمبر حسب سابق غیر معمولی طور پر خوبصورت ہے اور اس کے مضامین بحیثیتِ مجموعی اس کے بلند معیار کے مطابق ہیں جس کی مثال اردو رسائل میں بہ مشکل مل سکتی ہے۔

(۲)

اس وقت میرے سامنے صرف ہمایوں کا سالگرہ نمبر نہیں بلکہ کئی دوسرے سالنامے اور خاص نمبر بھی ہیں ۱۹۳۲ء کا annual ٹائمز آف انڈیا کا اور نیرنگ خیال کا دیگر متعدد رسائل کے مختلف سالوں کے خاص نمبر ہیں۔ اس لئے میری رائے مقابلتہً ہوگی۔ کسی خاص جذبہ یا رعایت کو دخل نہ ہوگا۔ ع یہاں دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔ میں تو جب بھی پرچہ اٹھاتا ہوں۔ ٹائیٹل کو دیکھتا ہوں۔ طباعت عمدہ مضامین کے لحاظ سے کسی خاص نمبر سے کم نہیں بلکہ اپنی ندرت کی وجہ سے خاص شان رکھتا ہے۔ یوں تو تمام مضامین اور نظمیں بہتر ہیں اور عام دیگر اردو رسائل کے مقابلہ کی ہیں لیکن اس بلند بانگ دعاوی کرنے والے رسائل کی فہرست میں نہ آنے والے ہمایوں میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو اپنی ندرت اور وحدت کے لحاظ سے کسی مغربی جریدہ سے کم نہیں اب بھی انگریزی داں اصحاب اردو جرائد کے مطالعہ کو تضیع اوقات سمجھیں تو یہ ان کی مغرب زدگی کی علامت ہے۔ دگرنہ کلام ہمایوں" کام سندیس"۔ تہذیب اور فلسفۂ زندگی نہایت اعلیٰ چیزیں ہیں۔ کاش "دام ہم رنگِ زمیں اور زلف و خال" کے شیدا ان نظموں سے سبق حاصل کریں اور قوم کے نوجوانوں کے اخلاق کی تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں یہ نظمیں انمول موتی ہیں۔ درنا سفتہ ہیں۔ بالخصوص فلسفۂ زندگی اور تہذیب تو مجھے بار بار متاثر کرتی ہیں۔ آپ میری رائے کی قیمت تب جانیں جب ان نظموں کا انگریزی میں ترجمہ ہو۔ اور یورپ والے بھی ان کا مطالعہ کریں۔ حضرت جوش بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ان کا خطاب "شاعرِ انقلاب" صحیح ہے۔ اور آپ نے بھی فلسفہ زندگی بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ کام سندیس بھی اچھی چیز ہے پر کلام ہمایوں تو نوادرات سے ہے ہمایوں ہمیشہ قوم کو عمل کا پیغام سناتا رہا اور مجھے بالعموم ان کی ایسی نظمیں مطالعہ کرنے کا موقع نصیب ہوا حق یہ ہے کہ انہوں نے پیغام پہنچانے میں کبھی غفلت نہیں کی لیکن ؎

اے رہنما مجھے مری قسمت پہ چھوڑ دے ۔۔۔ تنہا اٹھاؤں میں بھی ذرا لطفِ گمرہی

بار بار پڑھتا ہوں اور سر دھنتا ہوں اور متحیر رہ جاتا ہوں کس قدر عمدہ تخیل ہے۔ نثر میں بھی عمدہ مضامین

موجود ہیں۔ تراجم کو چھوڑ کر "اجتماعی زندگی پر ایک نظر" اچھا مضمون ہے۔ ہمایوں کا ہر سالگرہ نمبر ایک ایسے قیمتی مضمون سے مزین ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر تو آپ کو شاباش نہیں دے سکتا۔ کیا گذشتہ سال کا تعلیم و تربیت کے نئے طریقے کچھ کم قیمتی مضمون تھا۔

ملک پیلا صاحب کی فلک پیمائی ایک اچھی چیز لائی ناپاسی ہوگی اگر نپولین اور اس کا خواب تو خیر "تاریخ عالم پر ایک نظر" کے مرتب "مورخ ہمایوں" کو (جو شاید منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ کے مصداق . . .) اس محنت دکاوش کی داد نہ دی جائے۔ بارہ صفحات میں تاریخ عالم کو لے آنا حیرت انگیز اور قابل تعریف کام ہے۔ یہ اپنی قسم کی واحد چیز ہے اور نہ صرف مبتدیوں بلکہ علما بزعم خود فضلا کے لئے بھی مفید ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی مضامین اچھے نہیں وہ تو میں نے پہلے کہہ دیا ہے۔

دامانِ نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ آئندہ دسمبر کے پرچے میں مضمون نگاروں میں کسی ایسے صاحب کا نام نہ لکھ دیا کریں جو وعدہ پورا نہ کریں یا جس سے آپ مضمون (خواہ کسی وجہ سے) حاصل نہ کر سکیں۔ کیونکہ ہمایوں ان چیزوں سے بالا ہے میری مراد رشدہ رشن اور ان کے افسانہ سے ہے۔ یہ دعاوی بلند بانگ رسائل کی قسمت ہیں ہیں مکمل رسالہ ابھی پڑھ نہیں چکا ورنہ دیگر خصوصیات یا اگر نقائص نظر آتے تو بھی ظاہر کرتا۔ اس کامیاب سالگرہ منانے پر آپ کو اور عملۂ ادارت کو مبارکباد عرض کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں۔ کہ خدا ہمایوں کو ایسی ہیسیوں سالگرہیں نصیب کرے

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

حامد اور منصور اچھا کام کرتے ہیں۔ ہمایوں کے لئے ایسے ہی مدیروں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ حامد کا غم نصیب (افسانہ) اور "خاطر میں حامد آج تک شاہوں کو بھی لایا نہیں۔ بے برگ و بے ساماں گدا اور اس پہ خود داری اس قدر" (غزل) اور منصور کا "کیڈر کا مصور" مجھے کبھی نہ بھولیں گے۔ میرزمان خان فائق کیانی جہلم

(۳)

کل سالگرہ نمبر امید کے موافق مل گیا سبحان اللہ اس کے مضامین اور وجد آفریں نظموں کی کیا تعریف کروں۔ خصوصاً حامد علی خاں اور جوش ملیح آبادی اور قبلہ گاہ ب د صاحب کا کلام! عاصی از گوجرہ

(۴)

رسالہ غور سے دیکھا شروع سے لے کر اخیر تک دلچسپ تھا۔ ہر مضمون افسانہ۔ ڈراما نظم یا غزل Ranging کے الفاظ میں From the pen of a master تھی۔

ضیاالدین شمسی ایبٹ آباد

جہاں نما

گداگری کا مسئلہ

"ینگ من آف انڈیا" میں مسٹر والٹر پی وارن کا ایک مضمون "گداگر" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ امر متمدن دنیا کے لئے موجب صد ننگ و عار ہے کہ تہذیب و تمدن کے اس ترقی یافتہ دور میں ہندوستان جیسا بڑا ملک اس قابل نہ ہو کہ گداگری کے مسئلہ کے حل کے لئے کوئی مفید قانون وضع کر سکے۔
شمار و اعداد کی کتابوں میں گداگروں کی حد سے بڑھی ہوئی تعداد کے متعلق جو لرزہ خیز بیانات شائع ہوتے ہیں وہ اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ انہیں پڑھنے سے ارباب حل و عقد کے دل اب اس طور پر متاثر نہیں ہو سکتے کہ وہ نوع انساں کے اس قعرِ مذلت میں گرے ہوئے طبقہ کے مصائب کا کوئی ہمدردانہ حل تجویز کرنے کی تکلیف گوارا کریں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ عوام میں اس کے متعلق تحریک کی جائے اور اس معاشری لعنت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس قدر موثر اور پرجوش مظاہرے کئے جائیں کہ آخر بڑے بڑے لوگ اس طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ عوام کو پرزور طریقے پر اس حقیقت کی طرف توجہ دلانی چاہیئے کہ بیمار اور محتاج گداگر ہماری صحت کے لئے ایک سخت خطرناک مصیبت ہیں۔ یہ طرح طرح کے روگی اور طرح طرح کے بیمار بدقسمت لوگ قسم قسم کے رِسنے ہوئے ناسوروں اور مختلف النوع بیماریوں کے جراثیم لئے ہوئے ہمارے بازاروں میں، گلی کوچوں میں اور گزرگاہوں اور شاہراہوں پر ادھر اُدھر بیٹھے اور پھرتے پھراتے نظر آتے ہیں۔ اپنے متعدی امراض سے یہ ہمارے کھانے پینے کی چیزوں کو مہلک بنا دیتے ہیں۔ ہمارے مکان کے فرش پر ان کا ہر نقشِ قدم ہلاکت خیز جراثیم چھوڑتا جاتا ہے۔ اور جب ہمارے ملازم ننگے پاؤں وہاں پھرتے ہیں تو ان کے ذریعہ سے یہ جراثیم ان دریوں، قالینوں اور غالیچوں پر پہنچتے ہیں جہاں ہمارے بچے کھیلتے ہیں ہمارے بچے عموماً بیمار رہتے ہیں لیکن ہم بیماری کا اصلی باعث سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں۔ ہم ہندوستان کی ناسازگار آب و ہوا کو ملزم گردانتے ہیں اور ان لوگوں کو مطلق اس بیماری کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے جو عوام کی دی ہوئی طاقت کا دیانت دارانہ استعمال نہیں کرتے۔ جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور مرض کے حقیقی علاج کی طرف توجہ دینے سے بالکل بے پروا ہیں۔
پیشہ ور گداگر ملک کے لئے ایک عذاب ہیں اور ان کا وجود عوام کے کندھوں پر ایک غیر ضروری بار ہے۔

جس سے نجات صرف قانون کی مدد سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ عوام کی سخاوت اور سادہ لوحی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ایسے گداگر جو فی الواقع اپاہج یا از کار رفتہ ہیں ان کی مدد کے لئے ضرور محتاج خانے قائم ہونے چاہئیں اور ان کے متعلق نہایت سخت قوانین وضع ہونے چاہئیں تاکہ انصاف کا منشا پورا ہو۔

شادی محبّت اور مسرّت

برٹرینڈ رسل نے جنسی محبت "اور مسرت کے موضوع پر ایک مضمون میں لکھا ہے کہ آدم اور حوّا پر ہبوط کے بعد جنسیت کی بلا بطور سزا کے نازل ہوئی تھی، وہ کہتے ہیں کہ جس قدر نوجوان مرد عورتوں سے شناسا ہوں وہ سب کسی نہ کسی صورت میں اس جذبہ کی کارفرمائیوں سے گرفتار عذاب ہیں رسل اپنے قارئین ہی سے پوچھتے ہیں کہ وہی بتائیں اس جذبہ کے طفیل انہیں زیادہ راحت ملی ہے یا کلفت زمانہ گذشتہ میں مردوں کا عورتوں پر ہر طرح اقتدار تھا، مرد ہر طرح مختار تھے اور عورتیں مجبور۔ اُن دنوں نوع انسان کا صرف ایک حصہ عذاب میں تھا لیکن موجودہ مساوات کے عہد میں جب مرد عورت کے یکساں حقوق کا غلغلہ بلند ہوا ہے مرد عورت دونوں ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں اور دونوں کی زندگیاں یکساں ناشاد ہیں۔ پرانے قصوں کا انجام ہمیشہ یہ ہوا کرتا تھا کہ اُس کے بعد ان کی شادی ہو گئی اور وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اگر آج کل بھی لوگ اپنی زندگی کے افسانے کا یہی انجام کریں تو جھگڑا ختم ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ شادی کے کچھ عرصہ بعد یا بیوی اکتا جاتی ہے یا شوہر یا دونوں اس کا نتیجہ آخر کار طلاق ہوتا ہے رسل نے لکھا ہے کہ میں امریکن لیڈیوں سے گفتگو کرتے ہوئے بارہا یہ دیکھ کر گھبرا گیا ہوں کہ جس کسی شخص کا نام میں نے اتفاق سے لیا اس کے متعلق مجھے یہ بتایا گیا کہ وہ کسی نہ کسی وقت ان کا شوہر رہ چکا ہے یہ حالات افسوسناک ہیں لیکن ان کا باعث یہ غلط خیال ہے کہ لوگ جنسی تعلقات کو مسرت کا موجب سمجھتے ہیں حالانکہ اگر وہ اس سے رنج کی توقع رکھیں تو شاید انہیں بعد میں اتنا عذاب نہ ہو اگر ہم "حقیقت پرست" بن جائیں اور رشک و حسد اور بدمزاجی وغیرہ کو اعتدال پر لے آئیں تو کئی مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں۔ موجودہ زمانے کی شادیاں نہ صرف عورت اور مرد کی مسرت کی ضامن نہیں بلکہ ان سے قابلِ اطمینان بچے بھی پیدا نہیں ہوتے حالانکہ بحیثیت ایک معاشرتی نظام کے شادی کا یہی مقصد ہے آج کل کے بچے کمزور اور ذکی الحس ہوتے ہیں اور ان کی پرورش اس قسم کے دردناک حول میں ہوتی ہے کہ وہ اچھی طرح پھولنے پھلنے بھی نہیں پاتے

موجودہ زمانے کے اکثر مصائب کا باعث یہ ہے کہ لوگ رومنٹک محبت کو شادی سے الگ نہیں سمجھتے حالانکہ وہ ایک مثالی اور شاعرانہ جذبہ ہے اور شادی ایک معاشری ضابطہ یا نظام۔ وہ شاعری ہے اور یہ حقیقت۔

(تصویر) یہ ایک انگریز مصوّر مارکس سٹون (۱۸۴۰ء) کی مشہور تصویر ہے۔ اس قسم کی شاعرانہ مصوّری کے کئی نفیس اور پاکیزہ نمونے اس کے موقلم اور لطیف تخیل نے پیدا کئے۔ اس کی ایک تصویر "پہلا محبت نامہ" ساڑھے چار ہزار پاؤنڈ میں بکی تھی۔ اس مصوّر کی تاریخی تصاویر بھی مشہور ہیں۔ مثلاً "واٹرلو سے پیرس کو" "ہنری ہشتم اور این بولین" وغیرہ موجودہ تصویر پاکیزہ تخیلات و تصورات کی بہترین آئینہ دار ہے۔

گریہ

جلا کر شمع پروانے کو شب بھر آپ بھی روئی

نہ بے جا اعتمادِ عشق تُو نے آبرو کھوئی

یونہیں سات آسماں چکّر میں ہیں، یارب یہاں کیا ہے

فغاں اِک بے نوا درویش کی سُنتا نہیں کوئی

جگانے والے روئے آسماں کو دیکھ کر برسوں

جو سوئی بھی تو کیسی نیند اے تقدیر تو سوئی!

مکدّر دوست سے ہو کس طرح، جس کی یہ حالت ہے

بُرائی دل میں دشمن کی، نہ لب پر اُس کی بدگوئی

حقیقت کھُل گئی شبنم پہ حُسنِ بے وفا تیری

اِدھر مُنہ پھُول کا چُوما اُدھر جی کھول کر روئی

حامد علی خاں

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن ؛ حیراں بودن

اقبال اور سیاسیات

اقبال نے اگرچہ سیاسیات کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی لیکن اس کے باوجود اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اقبال کی تصنیفات سیاست کے بے شمار بلند حقائق سے لبریز ہیں۔ لٹریچر اُن زبردست اور عامل قوتوں میں سے ہے جو قوموں کو ایک زبردست ذہنی انقلاب کے لئے آمادہ کر دیتی ہیں۔ اقبال کی شاعری کو صرف شاعری ہی کے نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ اس حیثیت سے بھی اس پر نظر ڈالنی چاہیئے کہ اس کا شاعری کے علاوہ ایک اور بلند تر مفہوم بھی ہے۔ اقبال کی شاعری اور سیاست باہم اس طرح ملی جلی ہیں جس طرح دانتے کی شاعری اور فلارنس کی سیاسیات۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال — پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اقبال ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوا جب کہ مشرق و مغرب میں زندگی اور اس کے مختلف شعبوں میں عجیب و غریب انقلاب نمودار ہو رہا تھا۔ مشرق کی جہاں گیریاں، جہاں ستانیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اور مغرب کی سیاسی تیغ زنیوں کے قدم بقدم ذہن اور فکر کی فتوحات کا سکہ بھی بیٹھ رہا تھا اہلِ مشرق اور علی الخصوص مسلمانوں کی آنکھیں مغرب کے روشن اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے تخیل سے چندھیائی جا رہی تھیں۔ ہر سمت زوال، اور پستی کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ اور مرعوبیت کی حد یہ تھی۔ کہ ہر شعبۂ حیات میں مغرب کی تقلید ضروری فرض بن گئی۔

اقبال اگرچہ استادانِ فرنگ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کر چکا تھا اور تہذیبِ فرنگ کے خمستاں سے مدتوں تک سیراب ہوتا رہا۔ لیکن اسے پیرانِ مشرق کا فیضِ صحبت کہئے یا سعادت ازلی کی یاوری اور مساعدت کہ جس قدر یورپی افکار اور خیالات کے مطالعہ کا زیادہ موقع ملتا گیا اس کے ذہن میں مغربی اندازِ خیال کے خلاف ایک شورش ترقی پکڑتی گئی۔ مغربی سیاست کے نظری اکتساب اور تجرباتی ادراک نے اقبال کو اس نظر فریب تہذیب کے دام میں پھنسنے سے بچا لیا۔ برگساں جس قدر ہربرٹ سپنسر کے خیالات کا گہرا مطالعہ کرتا جاتا تھا اسی قدر اس کے دل میں "مادیت" کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اقبال بھی مغربی استادوں کی کتابوں سے جس قدر قریب ہوا اتنا ہی وہ ان نظریاتِ زندگی سے بیزار ہوا جن سے وہ لبریز تھیں۔

مشرق کی اس بیچارگی اور فکرِ صحیح کی اس درماندگی کے احساس نے اقبال کے نہاں خانۂ دماغ میں خیالات

(نوٹ) یہ مضمون اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام "اقبال ڈے" کی تقریب پر پڑھا گیا تھا۔ راقم

کی ایک نئی بستی کی بنیاد رکھی۔ جو اپنی ترکیب اور نوعیت کے لحاظ سے تو خالص اسلامی طرز کی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ مشرق و مغرب کے افکار کے آزادانہ مقابلے اور موازنے اور امتزاج اور اختلاط کے بعد تیار ہوئی ہے۔ یہ نیا فلسفۂ سیاست جو اقبال کے نغموں سے دنیا میں پھیلا وہ صرف افلاطون، ارسطو، میکیاولی، ہابس، کانٹ اور روسو کے علم ہی پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کی تیاری میں قرآن و حدیث، غزالی اور رازی، ماوردی اور نظام الملک، ابن حزم اور ابن خلدون کے خیالات سے بھی مدد لی گئی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ عام انسانی تجربات نے بھی اس کی تعمیر و ترکیب پر خاصا اثر ڈالا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اقبال کی سیاست کا ایک ایسے زمانے میں جب کہ مغربی انداز خیال بے حد مقبول ہے یورپ میں بلکہ خود ہندوستان میں زیادہ خیر مقدم نہیں ہوا۔ لیکن ہمیں ہرگز یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اقبال جن خیالات کی تعلیم دے رہا ہے۔ وہ ہوا اور فضا کے بالکل مخالف ہیں جنہیں وہ شاعر فرد ہونے کی حیثیت سے "کل" کی بجائے آج ہی ظاہر کر رہا ہے۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہو رہا ہے کہ ان تعلیمات کی صداقت کی بعض دلیلیں خود شاعر کی زندگی میں مل رہی ہیں اور دنیا اُس نصب العین سیاست کی طرف خود بخود کھچی چلی آتی ہے جو اقبال کے نزدیک اصلی اور صحیح ترین نصب العین ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ جہاں اقبال کا نصب العین تقریباً وہی ہے۔ جو اسلام کا عین منشا ہے۔ وہاں خود مسلمان اس وقت تک طوفان مغرب میں اس قدر تیزی اور شدت کے ساتھ بہہ گئے ہیں کہ انہیں یہ نصب العین کچھ اجنبی سا معلوم ہوتا ہے۔

اقبال کے سیاسی فکر کا نشو و ارتقا۔ اقبال کے بعض مغربی معترضین، عام طور پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہ اقبال کا سیاسی نصب العین اکثر بدلتا رہتا ہے۔ اور اس کے افکار میں اوقات کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اسرار خودی پر تبصرہ کرتے ہوئے، انگریزی رسالہ "اکفینیم" کے ایک مضمون نگار مسٹر فارسٹر نے یہی کہا تھا کہ اقبال کا قدم کسی ایک راستے پر نہ رہے گا۔" اس اعتراض کی تائید میں عموماً یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اقبال کسی زمانے میں ہندوستانیت کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر تصویر درد، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت جیسی قومیت آفریں اور وطنیت سے لبریز نظمیں لکھتا ہے تھوڑے ہی عرصے کے بعد، اس کے خیالات میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس وطنی عقیدت سے بیزار ہو کر بلاد اسلامیہ، ترانۂ ملی، خطاب بہ "جوانان اسلام"، شکوہ" اور "جواب شکوہ" اور اس قسم کی سینکڑوں ملی اور خالص اسلامی نظمیں لکھتا ہے۔ اس اعتراض کی صداقت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن اس بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اقبال کے سیاسی فکر کی پختگی میں ان تجربات کا حصۂ کثیر بھی شامل ہے جو اُسے اوضاع و اطوار عالم کے عمیق مطالعہ سے حاصل ہوئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اقبال ایک زمانے میں وطنیت اور قومیت کے موید اور حامی تھے۔ لیکن ان کے یہ خیالات زیادہ تر اس کتابی علم اور مطالعہ پر موقوف تھے جو انہیں مغرب کے ایسے مصنفین کی کتابوں سے حاصل ہوا جو عموماً قومیت اور وطنی عصبیت کو اپنے افکار سیاسی کا جزو لاینفک خیال کرتے ہیں۔ آج دنیا

کے اکثر ارباب علم یورپ کے نظر فریب اور دل کو لبھا لینے والے تمدن سے اس قدر متاثر ہیں کہ یورپ کی ہر حجت کو حجت قاطع اور ہر خیال کو وحیٔ ناطق سمجھتے ہیں۔ جو خیال یورپ سے اٹھتا ہے۔ قبول کر لیا جاتا ہے۔ جو بات یورپ کی زبان سے نکلتی ہے مشرق میں اس پر درست اور بجا کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ مولانا شبلی فرما گئے ہیں :۔

نکتۂ شرع با فسانہ برابر ہمی یورپ ار گپ زند آں نیز مسلم باشد

سچ تو یہ ہے کہ تہذیب فرنگ کی تابانی کے سامنے بڑے بڑے خودی آشنا اور خود آشنا بھی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔ اقبال بھی چندے اس کے دام میں گرفتار ہوئے لیکن فلاسفۂ مشرق کے گہرے مطالعۂ اسلام اور مشرقی تمدن کی روح کے صحیح ادراک، یورپ کے سفر اور تمدنِ مغرب کے قریبی نظارے نے ان کو بہت جلد اس کی تابانی سے بدظن کر دیا۔

وائے بر سادگیٔ ما کہ فسونش خوردیم رہزنے بود کمیں کردہ و رہِ آدم زد

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اقبال نے جب تک یورپ کو نہ دیکھا تھا ان کے ذہن میں مغربی رجحان زیادہ تھا لیکن جب یورپ کو نزدیک سے دیکھا تو ان کے خیالات میں مغرب سے دُوری پیدا ہو گئی جو اب تک قائم ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال ماہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ رائے بدل لیتے ہیں اور زمانے کے معمولی سے انقلاب کے ساتھ نیا راگ گانے لگتے ہیں۔ اقبال نے جب سے اپنے سیاسی افکار کے لئے ایک مرکز محور تجویز کر لیا ہے اور گرد و پیش کی تمام عامل قوتوں اور ماضی و استقبال کے تمام سیاسی اور تمدنی مسائل پر غائر نظر ڈال کر اپنے لئے دائرۂ فکر معین کر لیا ہے، اس کے بعد ان کی ساری قوت، اُسی کی تبلیغ و اشاعت میں صرف ہو رہی ہے۔ زمانہ ہر لحظہ جو رنگ بدلتا جاتا ہے اور جو نیرنگیاں دکھلاتا ہے، اقبال ان پر اسی ایک زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں جو ان کے نزدیک معقول ترین مناسب ترین اور صحیح ترین زاویۂ نگاہ ہے۔

اقبال کے سیاسی فکر کے مآخذ۔ اقبال کے سیاسی فکر کے نشو و ارتقا کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنے چمنِ فکر کی آبیاری کے لئے کن کن سرچشموں کی جانب التفات کیا ہے اور ان کے تخیل کو موجودہ قالب میں ڈھالنے میں کون کون سے زبردست اثرات کارفرما ہوئے ہیں۔ مغربی نقاد اور بعض مشرقی دوست عموماً فرمایا کرتے ہیں کہ اقبال نے بہت حد تک ولیم بلیک، نیٹشے اور برگساں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے اس قول کی بنیاد صرف اس مفروضے پر ہے۔ کہ اقبال اور نیٹشے، یا اقبال اور برگساں میں، بعض معاملات میں، اتحادِ خیال پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف معمولی سی وحدتِ خیال اس امر کے لئے ایک محکم ثبوت نہیں بن سکتی کہ اقبال نے تمام تر خیالات ان فلسفیوں سے لئے ہیں۔ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے کہ اقبال بہت حد تک، مغربی تخیل سے نفور ہیں لیکن اس کے باوجود بعض مغربی مفکرین کے

ساتھ ان کا بعض معاملات میں اتحادِ خیال ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا ایک خاص زاویۂ نگاہ ہے۔ جس کی رو سے انہیں نیٹشے اور برگساں کا اندازِ خیال پسند ہے۔ جس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ان دونوں کے افکار میں اقبال کو اپنے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کی مزید توضیح اس بات سے ہو سکتی ہے۔ کہ اقبال کو نیٹشے اور برگساں سے بعض اہم معاملات میں اختلاف ہے جو اصولی حیثیت رکھتے ہیں اور جنہیں آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ اقبال کی کتابوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اقبال پر مولانائے روم کا کتنا زبردست اثر ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی تازہ تصنیف جاوید نامہ میں مولانائے روم کو اپنا اسی طرح رہنما تسلیم کرتے ہیں جس طرح دانتے نے ورجل کو اپنا رہنما تسلیم کیا تھا۔ یہ بات بلا خوف تردید پیش کی جا سکتی ہے کہ اقبال نے پیرِ روم کے فکرِ روشن سے جس قدر روشنی حاصل کی ہے اتنی کسی اور گوشے سے انہیں دستیاب نہیں ہوئی۔

بیا کہ من زخُمِ پیرِ روم آوردم ؎ مئے سخن کہ جواں تر زبادۂ عنبی ست

البتہ یہ ضرور ہے کہ مشرق اور مغرب کے علوم کے امتزاج نے، اقبال کو اپنے لئے ایک نئی اور مستقل شاہراہ اختیار کرنے میں مدد ضروری ہے عجمی تفلسف اور تصوف کو مغربی دانش و حکمت کے معیار پر پرکھا اور پھر ان کے مقابلے اور توازن سے ایک معتدل اور زندہ حکمت پیدا کی جس پر مغرب کے بجائے مشرق کا اثر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ خود اقبال لکھتے ہیں[۱]:۔

"مقامِ تاسف ہے کہ مغرب اسلامی فلسفہ سے اس قدر ناآشنا ہے کہ مجھے اگر اس بحث پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کی فرصت ہوتی تو میں یورپ کے فلاسفہ کو بتلا سکتا کہ ہمارے اور ان کے فلسفہ میں کس بڑی حد تک اشتراک ہے۔ پھر فرماتے ہیں:۔

"میرا جو فلسفہ ہے وہ قدیم مسلمان صوفیہ و حکماہی کی تعلیمات کا تکملہ ہے۔ بلکہ بالفاظ صحیح تر یوں کہنا چاہئے کہ یہ جدید تجربات کی روشنی میں قدیم متن کی تفسیر ہے۔"

اقبال کا پیغام سیاسی ہے یا اخلاقی؟ تمہیدی مباحث میں سے اب صرف ایک بحث باقی ہے جس کی طرف اشارہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اقبال کا پیغام، ایک خالص سیاسی حیثیت رکھتا ہے یا اس کی بنیادیں اس سے بھی زیادہ گہری اور عمیق انسانی فطرت پر رکھی گئی ہیں؟ عام طور پر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے "کہ اقبال کا کلام تمام تر ایک جارحانہ سیاسی مفہوم رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے فلسفیانہ اشعار اور شاعرانہ غزلیات کا مفہوم بھی سیاسی ہے۔ یہ بقول مسٹر ڈکنسن کے ایک شگونِ نحس ہے جو فساد، ہلاکت اور خونریزی کا پتہ دیتا ہے۔"

---

[۱] معارف اکتوبر ۱۹۳۱ء ص ۲۸۶ (ماخوذ از رسالہ Quest)

حقیقت یہ ہے کہ استعمار پسند یورپ جب مشرقی اقوام میں زندگی اور احساس کی معمولی سی علامت بھی دیکھ پاتا ہے تو اس کے جسم پر ایک ارتعاش کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کا ذہن مرعوب ہو جاتا ہے اور مشرق کی مظلومیوں کے ردِ عمل کا تخیل ایک انتقام کا کابوس بن کر اس کے دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے جب مشرق کو متحد ہونے کی دعوت دی تو یورپ نے اس جنبش اور اثر زندگی کو ایک خوفناک تحریک کی شکل میں پیش کیا اور خود ہی موہوم خطرے کی خیالی تصویریں بنا بنا کر، اس کو ایک مہیب صورت دے دی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا ہے کہ مغرب ان زنجیروں کو ذرا زیادہ سخت اور گراں کر دے۔ جن سے اس نے مشرق کی جانِ ناتواں کو جکڑ رکھا ہے۔ نکلسن ہوں یا فارسٹر یا ڈکنسن انہیں مشرق سے ایک ایسی گونج سنائی دی جو فطرتِ انسانی کے عمیق اور پختہ ادراک پر مبنی ہے۔ جس کا اثر یقینی طور پر بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ مشرق زندگی کے اس احساس سے بہرہ ور ہوگا جس سے شعور میں ایک انقلاب پیدا ہونا بے حد یقینی ہے اور جس کے اثرات دُور رس اور جس کے نتائج ہمہ گیر ہوں گے۔ مغرب اپنی کم نگہی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ اقبال کا پیام سیاسی ہے۔ لیکن یہ خیال اس کے محدود اور زنگ تخیل کی پیداوار ہے جس کا طول و عرض صرف "مادیت" ہے۔ حالانکہ اقبال کا منتہائے نظر رباب حیات کے ان تاروں کو چھیڑنا ہے جو ارضی نہیں بلکہ آسمانی ہیں۔ جو صرف آب و گل اور مادہ کی بستی کو متاثر نہ کریں گے بلکہ روح کی اقلیم کو مسخر کریں گے۔ ان کا اثر جغرافیہ اور تاریخ کی زمینی حد بندیوں سے کہیں زیادہ قلوب کی پہنائیوں پر ہوگا۔ اقبال خود اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :۔

"میں اس کشمکش کا جو مفہوم لیتا ہوں وہ اصلاً اخلاقی ہے نہ کہ سیاسی۔ درآں حالیکہ نیٹشے کے پیش نظر اس کا سیاسی نصب العین ہے"

پھر پیامِ مشرق کے دیباچے میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں :۔

"اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر وا ما بانفسہم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اور میں نے اپنی فارسی تصنیفات میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے" اقبال نے جن اندرونی گہرائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان سے مراد وہ کلچرل اور اخلاقی انقلاب ہے جو اقوام کے شعور کو تبدیل کرتا ہے اور ان کے ضمیر کو ایک ایسے قالب میں ڈھالتا ہے جس سے "خودی" کے راگ نکلتے ہیں۔ اس کے "نئے کش مکش" کا عمل ضروری ہے اس نکتے کی وضاحت کے لئے میں یہ عرض کردوں گا کہ اقبال نے مسلسل اور پیہم مغرب کے کلچر اور تمدن

کی اس بنا پر مخالفت کی ہے کہ اس میں عقل "Intellectualism" اور مادّیت کے عناصر اصولی اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے اقبال، اپنے تمام کاموں کی بنا عشق پر رکھتے ہیں اور اسی ایک چیز کو کائنات کی ترقی اور صحت کا باعث سمجھتے ہیں۔ مغربی کلچر کے تمام شعبوں کے خلاف اقبال کو جو شکایت ہے وہ یہی ہے کہ اس کے تمام شعبے، اسی مرضِ مادیت و عقلیت کے جراثیم سے متاثر ہیں جن کی بدولت تہذیبِ یورپ کا وجود روز بروز زکمزور ہو رہا ہے۔ مشرق جو خود فراموشی کے عالم میں ہے، جب انہی مہلک جراثیم سے متاثر ہوتا ہے تو اقبال کو رنج ہوتا ہے۔ ان کے دل میں بیقراری اور اضطراب کے طوفان پیدا ہوتے ہیں۔ یہ طوفان کچھ تو اشکوں اور کچھ نالوں کی صورت میں زبان اور آنکھوں سے منظرستانِ عالم میں نمودار ہوتے ہیں۔ یہی نالے ہیں جو پیامِ مشرق، بانگِ درا، جاوید نامہ اور زبورِ عجم کا محسوس جامہ پہن کر باہر آتے ہیں اور دنیا کو متاثر کرتے ہیں۔ ان سب میں ہم اقبال کو مغرب کی مادہ پرستی اور روحانیت سے بیگانگی پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اقبال کی نظر مغرب کے سیاسی استیلا اور ملک گیری پر بھی رہتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اسے مغرب کی روحانی علالتوں اور اس کی تہذیب میں اخلاقی عنصر کی کمی دیکھ کر رنج ہوتا ہے اور اقبال یہ دیکھ کر رنج میں ڈوب جاتا ہے کہ سادہ لوح مشرق بھی مغرب کے روحانی امراض سے متاثر ہو رہا ہے۔

غرض اقبال کے پیغام کا مقصد دوگانہ ہے۔ اولاً یہ کہ وہ مشرق کو اس روحانی بیماری سے بچائے دوم یہ کہ یورپ کو اس مرضِ مہلک سے آگاہ اور خبردار کرے۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ پیامِ مشرق کے باب "نقشِ فرنگ" سے خوب واضح ہوگا جس کے کچھ اشعار یہاں لکھتا ہوں:۔

از من اے بادِ صبا گوے بدانائے فرنگ	عقل تا بال کشودست گرفتار تر است
برق را ایں بجگر می زند آں رام کند	عشق از عقل فسوں پیشہ جگردار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ور نہ	آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری	عجب اینست کہ بیمارِ تو بیمار تر است
دانش اندوختۂ دل ز کف انداختۂ	آہ ازاں نقدِ گراں مایہ کہ درباختۂ

زبورِ عجم میں فرماتے ہیں:۔

برعقلِ فلک پیما ترکانہ شبیخوں بہ	یک ذرۂ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ

یہ اور اس قسم کے ہزاروں اشعار، اسی ایک امر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ اقبال کو یورپین کلچر کی روح سے سخت نفرت ہے۔ یہ نفرت لینن، ایچ۔ جی۔ ویلز اور برنارڈ شا کی نفرت سے جداگانہ ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہنوز اس نسخۂ شفا

کی تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ کاش مغرب اقبال کی آواز کو سن سکے۔ لیکن اگر مغربیوں کو اپنی موہوم بلندی اور تفاخر کا پندارِ باطل ایک مشرقی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے مانع آئے تو پھر وہ اپنے ہی ایک ہموطن برگساں سے ان علالتوں اور پریشانیوں کا علاج دریافت کریں جو اقبال کی زبان میں یہ کہتا ہوا سنائی دے گا۔

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہامِ باطل است   عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

اقبال کے فلسفۂ سیاست کے اہم اجزا

ان گذارشات کے بعد میں اقبال کے فلسفۂ سیاست کے اہم اجزا کی طرف توجہ کرتا ہوں۔

ایک کامل سوسائٹی۔ اقبال کا سب سے بڑا سیاسی تخیل یہ ہے کہ وہ ایک زندہ اور بہمہ وجوہ کامل سوسائٹی کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے جو موجودہ قوانین، موجودہ اندازِ خیال، موجودہ جذبات اور ارادوں سے بالکل جدا ہوگی۔ جس کے سب افراد، مافوق الانسان ہوں گے جو خدائے لم یزل کے زیادہ قریب ہوں گے۔ یہ نئی سوسائٹی، مساوات، اخوت، اور یک جہتی کا زندہ نمونہ ہوگی اور اس میں مادیت اور عقلیت سے پیدا شدہ خرابیاں بہت کم ہوں گی اقبال کے خیال میں ایسی زندہ اور باعمل جماعت، کسی ایسے نظام کی بنیادوں پر اٹھے گی جو اپنے زاویۂ نگاہ میں مغربی اقوام کی طرح تنگ نظر اور کوتاہ بیں نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا تصور، انسان اور کائنات کے متعلق زیادہ وسیع، زیادہ آزادانہ اور زیادہ روحانی ہوگا۔ اس وقت دنیا میں جس قدر ترقی پذیر نظامِ معاشرت و سیاست موجود ہیں۔ اقبال ان میں اسلامی نظام کو اپنے خاص نصب العین اور اپنے خاص تصورِ ملت کے قریب تر سمجھتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اقبال ایسے فلسفی اور مفکر کا کسی خاص جماعت اور قوم کو یوں سراہنا، بادی النظر میں اکثر لوگوں کو عجیب معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ یورپ اور ہندوستان کے بعض معترضین کو اقبال کی یہ بات سخت ناپسند بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسٹر ڈکنسن فارسٹر اور نکلسن اس تصور پر بہت چین بجبیں معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جیسا خود اقبال اپنے ایک مقالے میں وضاحت فرما چکے ہیں۔ ان کا یہ تخیل کسی اندھی اور جامد تقلید اور خوش اعتقادی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ عملی سہولتوں اور نظامِ اسلامی کے اندر ترقی پذیر ممکنات کی موجودگی نے انہیں اس یقین پر مجبور کر دیا کہ وہ دنیا کے بے شمار نظام ہائے زندگی میں سے اپنی زندہ اور کامل سوسائٹی کی تعمیر کے لئے صرف اسلام ہی کو بطور بنیادِ عمل اپنے پیشِ نظر رکھیں۔ اقبال نے اپنی ساری تصانیف میں "ملتِ اسلام" کو صرف اپنے ہی خاص زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور جابجا، اس قوم کو مستقبل کی بہترین قوم قرار دیا ہے۔ سب سے بڑی دلیل جو اس سلسلے میں پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں وسیع ترین انسانی برادری اور قوم کا جو خیال "ملتِ اسلام" نے پیش کیا ہے وہ کسی اور نظام اور گروہ میں نہیں ملتا۔ اسلام کی حدود بہت وسیع ہیں۔ اس کی ماہیت غیر محدود اور لافانی ہے۔ اس کا

وجود زمان اور مکان کی قیود سے آزاد ہے، اور جیسا کہ اقبال خود فرماتے ہیں[1]: "اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی قومیت کا دار و مدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔" اسلام کی قومیت کا تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ اس کا اصل اصول مظاہرِ کائنات کے متعلق ایک ایسا اتحادِ خیال ہے جو سب انسانوں کو ایک رشتۂ وحدت میں پرو سکتا ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس کے ماننے والے افریقہ کی کالی دنیا سے متعلق ہیں یا ریگستانِ بطحا کے شجاع عرب۔ گنگا کی وادیوں میں بسنے والے آریا ہیں یا پامیر کے بلند کوہساروں کے مکیں۔ کوئی زمینی قید ان میں تفرقہ نہیں ڈال سکتی۔ کوئی مادی جدائی، ان کو جدا نہیں کر سکتی اور کوئی نسل یا زبان کا امتیاز ان میں باہمی امتیاز کا باعث نہیں ہو سکتا۔ یہی معاشری قانون ہے جس کی وسعت اور ہمہ گیری کا اقبال کو یقین ہے اور یہی نکتہ ہے جسے اقبال سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

انہی خیالات کو اقبال رموزِ بیخودی میں اپنے دلکش انداز میں بار بار پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر کہ چونکہ ملتِ اسلام کا دار و مدار توحید و رسالت پر ہے۔ اس لئے مکان (Space) کے نکتۂ نگاہ سے وہ لاانتہا ہے آپ فرماتے ہیں[2]:-

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست ۔۔۔ بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست ۔۔۔ رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست ۔۔۔ مرز و بوم او بجز اسلام نیست

از وطن آقائے ما ہجرت نمود ۔۔۔ عقدۂ قومیتِ مسلم کشود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد ۔۔۔ بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں ۔۔۔ مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں
صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو ۔۔۔ یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

اقبال کے اس خیال کا یورپ میں زیادہ خیر مقدم نہیں ہوا لیکن بایں ہمہ عصبیت، یورپ میں ایسے اہلِ دل موجود ہیں جو ان افکار کی درستی کے قائل ہیں۔ مثلاً پروفیسر ہرگرونجے نے اسلام اور مسئلہ نسل پر مضمون لکھتے ہوئے ان تمام امور کا اعتراف کیا ہے اور ان کے علاوہ بے شمار دوسرے اہلِ قلم نے اسلام کی اس برتری کا اقرار کیا ہے،

ملتِ اسلام جس طرح مکانی لحاظ سے لامحدود ہے اُسی طرح زمانی معیار سے بھی اس کی کوئی مقرر حد نہیں چنانچہ رموز میں لکھتے ہیں[3]:-

گرچہ ہم ملت بمیرد مثلِ فرد ۔۔۔ از اجل فرماں پذیرد مثلِ فرد
امتِ مسلم ز آیاتِ خداست ۔۔۔ اصلش از ہنگامۂ قالو بلیٰ ست

---

[1] ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر ص ۹ [2] رموز۔ ۴۵ [3] رموز۔ ۵۳ و مابعد

از اجل ایں قوم بے پروا ستے — استوار از نحن نزلنا ستے
ما کہ توحید خدا را حجتیم — حافظ رمز کتاب و حکمتیم
آسماں با ما سر پیکار داشت — در بغل یک فتنۂ تاتار داشت
فتنۂ صد آشوب در آغوش او — صبح امروزے نزاید دوش او
سطوت مسلم بخاک و خوں تپید — دید بغداد آنچہ روما ہم ندید
تو مگر از چرخ کج رفتار پرس — زاں نو آئین کہن پندار پرس
آتش تاتاریاں گلزار کیست — شعلہ ہائے او گل دستار کیست؟

شعلہ ہائے انقلاب روزگار — چوں بباغ ما رسد گردد بہار
رومیاں را گرم بازاری نماند — آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست — رونق خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند — استخوان او تہ اہرام ماند
در جہاں بانگ اذاں بود ست و ہست — ملت اسلامیاں بود ست و ہست
عشق آئین حیات عالم است — امتزاج سالمات عالم است
عشق از سوز دل ما زندہ است — از شرار لا الٰہ پایندہ است

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما — گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی حکمت کی باتیں جو آپنے اشعار میں سنی ہیں۔ اقبال انہیں "مدراس لیکچرز"[ا] میں پیرایۂ نثر میں ادا کرتے ہیں یہ خیال کہ ملت اسلام کا زمان کے نکتۂ نظر سے کوئی محدود انجام نہیں اس وقت تک صحیح شکل اور قالب نہیں اختیار کر سکتا جب تک اس کے قوانین کی ہر زمانے میں نئی تعبیر و توجیہ نہ کی جائے۔ صرف اصول، اسلامی نظام کو فرسودہ پرانا اور ناقابل عمل ہونے سے بچا سکتا ہے۔ اور اسی کی بدولت اسلام انسانی معاشرت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک، یہ چیز اسلام کا اصول "اجتہاد" ہے" جو مفکرین کو نئے نئے مسائل کے حل اور مختلف معاملات میں اصول شریعت کی زمانی تعبیر کا اختیار دیتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اقبال "عالمان کم نظر" کے اجتہاد کے مخالف اور ہر کہ و مہ کے اجتہاد کو ملت کے لئے بے حد مضر سمجھتے ہیں۔

غرض یہ وہ آئیڈیل سوسائٹی ہے جس کی تعمیر اقبال کی زندگی کا مقصد ہے۔ ڈاکٹر نکلسن جنہوں نے اسرار کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔ شکایت کرتے ہیں کہ ان خیالات میں اقبال ایک پرجوش مذہبی مسلمان معلوم ہوتے ہیں نہ کہ فلسفی۔ ادھر ان کا ہر قول و ہر خیال ایک مسلمان کا قول اور خیال معلوم ہوتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ مسٹر نکلسن کے اس قول کی تائید کروں یا تردید۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں مجھے مشکل معلوم ہوتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ڈاکٹر نکلسن جب ان خیالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے سامنے یکایک موجودہ زمانے کی مسلمان سوسائٹی آجاتی ہو حالانکہ اقبال کی نگاہ مذہب اسلام کی اُن ممکنات اور ترقی پذیر عناصر پر ہے جو اسلام کی فطرت میں موجود ہیں مگر انہیں پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملا اور کوئی تعجب نہیں کہ خود بقول اقبال کے مسلمانوں کی فتوحات ہی اس کے راستے

ا. Lecture on the "Principles of movement in the Structure of Islam."

میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہوں حقیقت میں "اسلام" کائنات کے ضمیر میں ہنوز ایک تخیل کا درجہ رکھتا ہے اور فطرت کی قوتیں اپنے عمل اور ردِ عمل سے اس "تخیل" کو وجود کی شکل دے رہی ہیں۔ ع

ہنوز اندر طبیعت مے خلد موزوں شود روزے

اقبال کے اس "تصورِ ملت" پر عموماً اعتراض کیا جاتا ہے کہ اصولی طور پر تو اقبال کا فلسفہ عام ہوتا ہے لیکن اس کو ایک خاص قوم سے وابستہ کر دینا تنگ نظری ہے۔ اس کا جواب خود اقبال کی زبانی سننا چاہیئے:۔

"شاعری اور فلسفہ میں انسانی نصب العین ہمیشہ عالمگیر ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کی تفصیل عملی زندگی میں کی جائے گی تو لامحالہ اس کا آغاز کسی مخصوص جماعت سے کرنا ہوگا جو اپنا ایک مستقل اور مخصوص موضوع رکھتی ہو اور جس کے حدود میں تبلیغ عملی و لسانی سے وسعت ہو سکتی ہو۔ یہ جماعت میرے عقیدے میں اسلام ہے۔

طوالت کے خوف سے اس سوسائٹی کے مختلف ترکیبی اجزا پر مفصل تبصرہ نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم مختصراً اہم مباحث کی طرف اشارہ کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

انسانِ کامل۔ اقبال کے نزدیک ایسی سوسائٹی کے لئے ویسے ہی آیڈیل (مثالی) افراد کی ضرورت ہے جو اس نظام کو کامیاب بنائیں گے۔ یہ آیڈیل افراد ایسے ہوں گے جن میں "خودی" کی تکمیل ہو چکی ہوگی۔ خودی اقبال کے نزدیک ایک "نوری نقطہ" ہے۔ جو محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی محبت، خودی کی تکمیل کا باعث ہوگی اور یہی خودی ان افراد میں بے خوفی اور مردانگی پیدا کرے گی۔ خودی نظامِ عالم کی بنیاد ہے جس کے بغیر عناصر ترکیب نہیں پا سکتے۔

می شود از بہرِ اغراضِ عمل عامل و معمول و اسباب و علل
خیزد انگیزد فتد تابد رمد سوزد افروزد خرامد پر زند
وانمودن خویش را خوئے خودی ست خفتہ در ہر ذرۂ یزدی خودی ست

چونکہ زندگی "خودی" کی تکمیل سے ہے اسی لئے سختی اور سخت کوشی، استواری اور طاقت، زندگی کی ضروریات میں سے ہیں۔ افراد جس قدر کش مکش اور تحمل و برداشت کے عادی ہوں گے اسی قدر ان میں خودی کی تکمیل زیادہ ہوگی لیکن خودی کے تسلسل اور بقا کے لئے مقاصد اور نصب العین کا ہونا ضروری ہے کیونکہ زندگی جستجو میں مسلسل میں پوشیدہ ہے۔ آرزوؤں اور کوششوں کا نام کامیاب زندگی ہے۔ جب تک آرزو اور مقاصد کو حاصل کرنے کا جنون نہ ہوگا زندگی پختہ تر نہ ہوگی۔[1]

زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل او در آرزو پوشیدہ است
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات
چوں ز تخلیقِ تمنا باز ماند شہپرش بشکست و از پرواز ماند

---

[1] معارف (محولہ بالا) ماخوذ از Quest ص ۵۳ اسرار ۲۱

اقبال ان سب اثرات کا سخت مخالف ہے جو خودی کو ذرا بھی کمزور کرتے ہیں وہ افلاطوں کے گوسفندانہ فلسفہ کو اسی لئے ناپسند کرتا ہے کہ اس نے زندگی کا انجام موت کو قرار دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک ایسی تعلیم خودی کو کمزور کرتی ہے۔ اور خودی کو کمزور کرنے کا حربہ ان اقوام نے ایجاد کیا ہے جو خود کمزور ہیں اس لئے ان کی خواہش ہے کہ طاقتور بھی کمزور ہو جائیں۔ اقبال نے ایسی تعلیم کی قباحتوں کو ایک حکایت کے ضمن میں بیان کیا ہے جس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ ایک شیر نے بکریوں کے اسی قسم کے خودی کُش وعظ سے متاثر ہو کر گوشت کھانا ترک کر دیا تھا جس کے معنی "شیر" کی موت اور تباہی کے بغیر کچھ نہ تھے۔

آنکہ کردے گوسفنداں را شکار ــــ کرد دین گوسفندی اختیار
از علف آں تیزیٔ دنداں نماند ــــ ہیبت چشم شرر افشاں نماند
باپلنگاں سازگار آمد علف ــــ گشت آخر گوہر شیرے خزف
آں جنون کوشش کامل نماند ــــ آں تقاضائے عمل در دل نماند
شیر بیدار از فسون میش خفت ــــ انحطاط خویش را تہذیب گفت

نیٹشے کی طرح اقبال بھی استیلا، قوت اور جہاد کو خودی کی تربیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ نیٹشے کہتا ہے "نیکی قوت اور ہمت مردانہ کا نام ہے بلکہ ہر اس شئے کا نام ہے جو انسانوں میں استیلا اور قوت کے جذبات کو ترقی دے۔ اور بدی ہر وہ چیز ہے جو کمزوری سے پیدا ہو" اقبال جہاد کو زندگی کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں لیکن کونسا جہاد۔ ساری دنیا کو غلام بنانے کے لئے نہیں بلکہ خدائی کلمہ کی تبلیغ کے لئے۔ جوع الارض اور دنیا کی تسخیر کا جہاد اقبال کے نزدیک حرام ہے۔

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید ــــ تیغ او در سینۂ او آرمید

اس جہاد کے سلسلے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اقبال کا منتہا مادی قوت نہیں بلکہ روحانی قوت ہے جیسا کہ خود اقبال ایک مقام پر کہتے ہیں :-

"جدید سائنس سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ قوت مادی کا ہر سالمہ ہزار سال کے ارتقا کے بعد اپنی موجودہ ہیئت تک پہنچا ہے۔ اس پر بھی اُسے دوام نہیں اور وہ انحلال قبول کر لیتا ہے بالکل یہی حال روحانی قوت کا ہے یعنی فرد انسانی بے شمار فرقوں کے تنازع اور جدوجہد کے بعد اس مرتبے تک پہنچا ہے اور پھر بھی آسانی کے ساتھ انحلال قبول کر لیتا ہے۔ . . . . اس لئے اگر اپنے وجود کو برقرار رکھنا ہے تو لازم ہے کہ گذشتہ زندگی میں جو تجربات حاصل ہوئے ہیں اور ماضی میں جو قوتیں اس کے ثبات میں مددگار ہوئی ہیں۔ ان سے مستقبل میں بھی کام لیتے رہے اس سے معلوم ہوگا کہ میں نے تنازع اور جنگ کی ضرورت جس مفہوم میں تسلیم کی ہے اخلاقی ہی ہے"۔

جہاد کے بعد خودی کی تربیت کے لئے تین مرحلے ہیں۔ اطاعت ضبط نفس۔ اور نیابت الٰہی

قطرہا دریاست از آئین وصل ــــ ذرہ ہا صحراست از آئین وصل

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی — تو چرا غافل ازیں ساماں روی

جب ایک فرد اطاعت اور ضبطِ نفس کے مراحل طے کر چکتا ہے۔ تو پھر وہ نیابتِ الٰہی کی منزل میں آپہنچتا ہے۔ اقبال اس پختہ عنصر فردِ کامل کو نائبِ حق کا خطاب دیتے ہیں جس کی عقیدت سے ان کا دل سرشار ہے۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است — بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است — ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو و کل آگہ بود — در جہاں قائم بامر اللہ بود
نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر — ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر
مشتِ خاکِ ما سرِ گردوں رسید — زیں غبار آں شہسوار آید پدید
ذاتِ او توجیہِ ذاتِ عالم است — از جلالِ او نجاتِ عالم است
زندگی را مے کند تفسیرِ نو — مے دہد ایں خواب را تعبیرِ نو
طبعِ فطرت عمرہا در خوں تپید — تا دو بیتِ ذاتِ او موزوں شود

اقبال اس مردِ میدان کا شدت سے انتظار کرتے ہیں جس کا وجود اطاعتِ کامل اور ضبطِ نفس کی تمام قیود اور امتحانوں سے کامیاب ہو کر اس درجے تک پہنچا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ — جامِ صہبائے محبت باز دہ
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو — در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
باز در عالم بیار ایامِ صلح — جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح
شورشِ اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر — از جبینِ شرمسارِ ما بگیر
از وجودِ تو سرافرازیم ما — پس بہ سوزِ ایں جہاں سازیم ما

"یہ نائبِ حق" کا تخیل اقبال کا نیا تخیل نہیں بلکہ مشرق و مغرب کا پرانا تخیل ہے۔ نیٹشے کا "مافوق الانسان" کارلائل کا ہیرو اور گوئٹے کا Genius اسی قسم کے افراد ہیں۔ نیٹشے اور اقبال میں جو وحدت پائی جاتی ہے اس سے بعض مغربی نقادوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اقبال نے انسانِ کامل کا خیال اسی جرمن فلسفی سے مستعار لیا ہے۔ حالانکہ اقبال خود فرماتے ہیں کہ[1]:۔

میں نے یہ خیال نیٹشے سے نہیں لیا بلکہ تصوف کا "انسانِ کامل" آج سے بیس سال قبل میرے پیش نظر رہا ہے۔ انگریزوں کو اپنے ایک ہموطن فلسفی الیگزینڈر کے خیالات کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ لیکن ہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ الیگزینڈر کے خیال میں حقیقتِ منتظر ایک خدائے ممکن الوجود کی شکل میں جلوہ گر ہوگی۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ شانِ الٰہی ایک برتر انسان کے قالب میں جلوہ گر ہو کر رہے گی"۔

اقبال نے تصوف کے جس انسانِ کامل کی جانب اشارہ کیا ہے وہ محی الدین ابن عربی اور ابراہیم الجیلی

---

[1] معارف (محولہ بالا)۔ ماخوذ از Quest

کا انسان کامل" ہے۔ افسوس کہ اندیشۂ طوالت مانع ہے۔ ورنہ یہ بتایا جاتا کہ ابراہیم جیلی کا "انسانِ کامل" اقبال کے نائب حق سے بہت مختلف ہے۔ اس کا مفصل حال اقبال کی کتاب "فلسفۂ عجم" اور نکلسن کی کتاب "Studies in Islamic mysticism" میں ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں نے اجمالاً مگر وضاحت کے ساتھ اقبال کی کامل سوسائٹی اور "کامل انسان" کا حال آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ جس کی بعض تفصیلات کو دانستہ ترک کر دیا گیا ہے۔ ساری کی ساری تصنیفات میں اقبال اس کامل سوسائٹی کے بلند مقاصد کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں نہ صرف تخیل اور فلسفہ ہی میں بلکہ اپنی مختصر سی عملی سیاست کی زندگی میں بھی انہوں نے ایسے خیالات اور افکار کی پرجوش مخالفت کی ہے جو انہیں ذرا بھی اس خاص نصب العین کے لئے مضرت رساں نظر آئے۔ اقبال شروع سے لے کر آج تک اس زندہ سوسائٹی کی کامیابی کے متعلق ایمان اور ایقان رکھتے ہیں اور اپنی بصیرت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خاکی مگر خودی آشنا افراد ایک دن فرشتوں سے بھی بڑھ جائیں گے۔

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے ۔۔۔ زمین از کوکبِ تقدیر ما گردوں شود روزے

یکے در معنیِ آدم نگر از من چہ مے پرسی ۔۔۔ ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے ۔۔۔ کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پرخوں شود روزے

اقبال کا نظریۂ حکومت و خلافت:۔ حکومت اور خلافت کے متعلق اقبال نے بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا تاہم خلافتِ انسانی کے اہم اصول انہوں نے اپنی نظموں میں بیان کر دئے ہیں۔ اقبال ایک عادل اور موثر حکومت کے لئے ایمان اور عشق کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری ۔۔۔ یہ سب کیا ہے فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

حکومت اور سروری اقبال کے خیال میں خدمتگری کا دوسرا نام ہے لیکن انسان میں حقیقی اور بے لوث خدمتِ خلق کا مادہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ تاآنکہ تمام کاموں کی بنیاد عشق پر نہ رکھی جائے اور تمام امور میں یقین اور ایمان کی مشعل سے روشنی نہ حاصل کی جائے۔ گویا دوسرے الفاظ میں درویشی اور سلطانی کا اجتماع ہونا ضروری ہے۔ یہاں بھی اقبال اپنے "انسانِ کامل" کو فراموش نہیں کرتے اور حکمرانی کے لئے عشقِ مصطفےٰ کو ایک ضروری شرط قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ یہی عشقِ افرادِ قوم کو ایک نقطے پر جمع کر سکتا ہے اور اسی کی ذات کے ساتھ بستگی اس پریشان شیرازے میں ایک نظم پیدا کر سکتی ہے پیام میں فرماتے ہیں:۔

زبور ۱۵۹

سروری در دینِ ما خدمتگری ست ۔۔ عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری ست
آں مسلماناں کہ میری کردہ اند ۔۔ در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در ہجومِ کارہائے ملک و دیں ۔۔ با دلِ خود یک نفس خلوت گزیں
ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست ۔۔ بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست
روح را جز عشقِ او آرام نیست ۔۔ عشقِ او روزیست کو را شام نیست

اقبال جس طرح باقی امور میں "عقلی" بنیادِ عمل کے مخالف ہیں اور عقلیت یعنی Intellectualism کو عالمِ انسانیت کے لئے بے حد مضر سمجھتے ہیں اسی طرح "نظریۂ سلطنت" میں بھی انہیں "عقلی" بنیاد سے خاص پرخاش ہے، کیونکہ جو قوانینِ عقلیت فرسودہ دماغوں سے وضع ہوں گے ان میں انسان کی خود غرضی اور انفرادپسندی کی چاشنی ضرور ہوگی اور ظاہر ہے کہ انسان، سوسائٹی اور اجتماعی امور میں اس لئے نہیں شامل ہوتا کہ اس سے اجتماع کو زیادہ مستحکم کرنا منظور ہوتا ہے بلکہ اس کے پیشِ نظر صرف یہ چیز ہوتی ہے کہ سوسائٹی کے تابع رہنے سے، اس کے خاص مفاد بہتر طریق سے محفوظ ہو سکتے ہیں[1] یہی وجہ ہے کہ آئین سب لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتے اور جو اقلیت غیر مطمئن ہوتی ہے وہ ان قوانین کے خلاف آواز بلند کرتی ہے پس اقبال کے نزدیک بصورتِ حالات چونکہ عقلیت کی مرہونِ احسان ہے اس لئے اس سے بچنا چاہئے اور اس کے بجائے وحی کے دئے ہوئے قوانین کی اطاعت کرنی چاہئے۔ جاوید نامہ[2] میں فرماتے ہیں:۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام ۔۔ نے غلام او را نہ او کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس ۔۔ ملک و آئینش خداداد است و بس
عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر ۔۔ سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ ۔۔ در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ
عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف ۔۔ وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف
حاصلِ آئین و دستورِ ملوک ۔۔ دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

مذہب اور حکومت۔ "دین اور سلطنت" کی پرانی بحث میں اقبال اسلامی طریقے کی پرزور حمایت کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک، مارٹن لوتھر مسیحیت کا سب سے بڑا دشمن تھا جس نے مذہب اور حکومت کو دو مختلف اور مستقل وجود قرار دیا ہے۔ آپ کے خیال میں مذہب اور حکومت کی مثال جسم اور روح کی ہے جن کا ربطِ باہمی، زندگی کے لئے ضروری ہے اور جن کا ایک دوسرے سے قطعِ تعلق، موت کے مرادف ہے۔ اقبال کے اس خیال کی اس زمانے میں شاید زیادہ تائید نہ ہو سکے لیکن خود یورپ میں سیاسیات کے مصنفین نے، سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ان مضامین پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں جن کا کامل اطلاق، ان حالات پر نہیں ہو سکتا جو اقبال کے پیشِ نظر ہیں۔ کیونکہ قرونِ وسطیٰ میں یورپ کا مسیحی نظامِ حکومت و مذہب بالکل ایک خاص قسم کا نظام تھا جس میں پوپ اور بادشاہ دونوں کو یکساں طور پر جسمانی اور روحانی بزرگ تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن اقبال کی حکومت میں جسمانی اور روحانی کوئی دو جدا بستیاں نہیں بلکہ ایک

1. The Ethical basis of the State, Wilde chapter iii, iv

[2] ص ۷۸

ہی شخص اور ایک ہی نظام میں دونوں ملی ہوئی ہیں۔ گلشن راز جدید[۱] میں لکھتے ہیں :-

تن و جان را دو تا گفتن کلام است ‏ تن و جان را دوتا دیدن حرام است
کلیسا سبحۂ پطرس شمارد ‏ کہ با او حاکمی کارے ندارد
بدن را تا فرنگ از جاں جدا دید ‏ نگاہش ملک و دین را ہم دوتا دید
خرد را با دلِ خود ہمسفر کن ‏ یکے بر ملتِ ترکاں نظر کن
بہ تقلیدِ فرنگ از خود رمیدند ‏ میانِ ملک و دین ربطے ندیدند

رموز[۲] میں فرماتے ہیں :-

تا حکومت مسندِ مذہب گرفت ‏ ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت
قصۂ دینِ مسیحائی فسرد ‏ شعلۂ شمعِ کلیسائی فسرد

دورِ جدید میں ترکوں نے یورپ کی دیکھا دیکھی مذہب اور حکومت کو الگ کر دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک ترکوں کی یہ تدبیر صحیح نہیں۔ اس لئے کہ یہ اُس نظریۂ حکومت کے خلاف ہے جس کی بنیاد عشق اور عشقِ مصطفےٰ پر ہے مصطفےٰ کمال نے یورپ کی اُس چیز کو جسے خود اہلِ یورپ اب پُرانا سمجھتے ہیں نیا سمجھ کر اختیار کر لیا ہے حالانکہ مردِ مومن کو اپنی دنیا خود پیدا کرنی چاہئے۔ مگر یہ قوتِ عمل صرف "عشق" ہی کی کارفرمائیوں سے ممکن ہو سکتی ہے جاوید نامہ[۳] میں لکھتے ہیں

ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست ‏ تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

جمہوریت۔ اقبال یورپ کے جمہوری نظام کے متعلق بہت زیادہ حُسنِ ظن نہیں رکھتے ان کا خیال ہے کہ یہ جمہوریت بھی استبداد تسلط اور غلبۂ عام کی ایک نئی شکل ہے۔ اصولی طور پر اقبال حکومت میں عوام کی مداخلت کے زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتے اس لئے کہ ان کے نزدیک عوام میں سے ہر فرد کو قدرت نے مصالحِ حکومت کو سمجھنے کی توفیق نہیں دی۔ آپ نے ایک زمانے میں خلافتِ اسلامیہ کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا تھا جس میں کسی حد تک انتخاب کے طریقے کی تعریف کی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس مسئلہ کے متعلق ان کے خیالات میں یک گونہ تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ آپ ایک نظامِ سیاست میں ایک کامل طور پر حساس فرد یعنی Personality کے قائل ہیں اور نیٹشے کی طرح زندہ اور طاقتور Personalities کی حکومت کو زیادہ کامیاب اور مناسب خیال کرتے ہیں پیام میں آپ فرماتے ہیں :-

متاعِ معنئ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی ‏ ز موراں شوخئ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو ‏ کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

دوسرا اگرچہ ایسی جمہوریت کا قائل تھا جس میں حریت، اخوت اور مساوات بطور اصل الاصول ہوں لیکن

---

[۱] ص ۲۱۷ [۲] ص ۹۴ [۳] جاوید نامہ ۲۰۷

جمہوریت کے اصولی نقائص کا اسے پورا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اس کا قول ہے کہ ایسی طرزِ حکومت تو فرشتوں کی دنیا کے لئے مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ہم انسان تو اس کے قابل نظر نہیں آتے"۔ لیکن اب یورپ میں جمہوریت کے خلاف زبردست رائے پیدا ہوگئی ہے۔ اور بیسیوں کتابیں اس کی خرابیوں کو ظاہر کرنے کے لئے لکھی جارہی ہیں۔

اقبال کو سب سے بڑی شکایت اس طرزِ حکومت سے یہ ہے کہ اس میں "قابلیت" نہیں بلکہ مقبولیت معیار ہے حالانکہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص "قابل" ہونے کے بغیر مقبول ہو۔ اس پر اقبال کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جمہوریت گروہ بندی اور فرقہ پرستی کو ترقی دیتی ہے۔ لاسکی اگرچہ جمہوریت کی خوبیوں کا بے حد معترف ہے لیکن اسے بھی سب سے زیادہ اسی بات کا خطرہ ہے کہ یہ عوام کی مداخلت اور Franchise کی وسعت، فرقوں میں بے حد وسعت اور کثرت کا باعث ہورہی ہے۔ جمہور کی آزادی کی لاکھ برکات ہوں مگر اس میں شبہ نہیں کہ جمہور کا یہ غلبۂ عام او مطلق العنانی کسی نظام کو زندہ اور مستحکم نہیں ہونے دے گی۔ اور ارتقا کے فطرتی اور قدرتی طریق سے معاملات کی تکمیل کے بجائے انقلاب اور سریع الوقوع تغیرات، عام اور زیادہ ہوجائیں گے۔ گلشنِ راز[1] میں اقبال نے انہی نکات کی جانب اشارہ کیا ہے:۔

فرنگ آئینِ جمہوری نہاد ست　　رسن از گردنِ دیوے نہاد ست
خدائش یار اگر کارش چنین است　　گروہے را گروہے در کمین است
چو رہزن کاروانے در تگ و تاز　　شکمہا بہرِ نانے در تگ و تاز
ز من دہ اہلِ مغرب را پیامے　　کہ جمہوریت تیغِ بے نیامے
نماند در غلافِ خود زمانے　　برد جانِ خود و جانِ جہانے

ان اشعار کے ساتھ "خضرِ راہ" کے ان اشعار کو بھی سُن لیجئے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق　　طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں　　یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو　　آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

قیصر ولیم اور لینن کے مکالمے میں یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ انسانی طبیعت اطاعت پر مجبور ہے خواہ وہ ایک طاقتور فرد کی ہو یا ایک پارلیمنٹ کی۔ وہی خرابیاں جو مطلق العناں حکومتوں میں ہیں، وہی جمہوری اداروں میں بھی وارد ہوسکتی ہیں:۔

---

[1] ص ۲۲۳

گناہِ عشوہ و نازِ بتاں چیست ۔ طواف اندر سرشت برہمن ہست
اگر تا جے کئی جمہور پوشد ۔ ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
نماند نازِ شیریں بے خریدار ۔ اگر خسرو نباشد کوہکن ہست[۵]

قومیت کا تصور۔ قومیت یا نیشنلزم کے متعلق اقبال کے عقاید اس قدر واضح اور صاف ہیں کہ ان پر طویل تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ جو لوگ اقبال کے نقطۂ نظر کے مطابق عالمگیر برادری اور وسیع انسانی اخوت کے تخیل کو سمجھتے ہیں وہ اقبال کو نیشنلزم کی اس شدید مخالفت میں ضرور حق بجانب سمجھتے ہوں گے۔ خود یورپ اس فرقہ پسندی سے تنگ آچکا ہے اور اس جماعت تراشی سے بھاگ کر، جمعیۃ الاقوام کی تخیل میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے اگرچہ اقبال اس کی ان کوششوں کی کامیابی کے متعلق بھی یقین نہیں رکھتے۔ اور اس بظاہر یونیورسل نظام کو کفن چوروں کی انجمن کا خطاب دیتے ہیں، کیونکہ اس کا منتہا بھی وہی "مادیت" ہے جس کے خلاف اقبال نے اپنی زندگی صرف کر دی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ لیگ آف نیشنز کی پے در پے ناکامیاں اور طاقتور اقوام کا اس کے نظام پر تسلط اقبال کو بدظن کر دیتا ہے اور اس بدظنی کے لئے اس کے پاس وجوہ موجود ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ لیگ ابھی تک کمزوروں کی حفاظت نہیں کر سکی اور *Disarmament* یا تخفیفِ اسلحہ کی کوششیں بقول ریمزے میور *Armament* (اسلحہ اندوزی) پر ختم ہو رہی ہیں۔ لیگ کی اس ناکامی کا سب سے بڑا سبب بھی نیشنلزم ہی ہے جس طرح کہ دورِ جدید کی اکثر لڑائیوں کا اصلی سبب نیشنلزم ہی تھا۔ ہندوستان کے اکثر حضرات جب اقبال کو نیشنلزم کی مخالفت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ بہت برہم ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غلط فہمی کی وجہ سے اقبال کے خیالات کا صحیح اور گہرا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ اقبال نیشنلزم کی مخالفت اس لئے نہیں کرتے کہ انہیں "آزادی" پسند نہیں کیا، یا وہ "غلامی" کو محبوب سمجھتے ہیں بلکہ اس کی محرک بعض اور چیزیں ہیں جن کے متعلق اجمالی طور پر آئیڈیل سوسائٹی کے ضمن میں بحث ہو چکی ہے افسوس کا مقام ہے کہ جس شخص نے عمر بھر افراد اور ملتوں کو "خودی" کا سبق پڑھایا۔ جس نے بندگی نامہ لکھ کر یہ ثابت کیا کہ بندگی اور زندگی دو مخالف چیزیں ہیں، جس نے انسانوں کو عام حریت، عام اخوت، عام انصاف، اور عام رواداری کا پیغام دیا اس کے متعلق مہربانانِ وطن اپنے دلوں میں یہ خیال جاگزیں کر لیں کہ اسے ان عام انسانی جذبات سے بھی نفرت ہے جو بقول "روسو" کیڑے میں بھی موجود ہیں اور جن کے بغیر کوئی سیرت مکمل نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال ایک یونیورسلسٹ ہیں پس وہ ہر چیز جو اس خاص نصب العین سے ٹکرائے گی وہ اس کی مخالفت کریں گے۔ یہی "یونیورسلزم" کی عام تبلیغ ہے جسے بعض دوست "پین اسلامزم" کے نام سے

[۵] پیام ۲۵۰

تعبیر کر دیتے ہیں، حالانکہ اقبال ہیں اسلامزم کو بھی ایک ناقص اور محدود تدبیر سمجھتے ہیں۔ یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ اقبال جا بجا مسلمان اقوام کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں اور وطن اور نسل کے امتیاز سے دوری کی تعلیم دیتے ہیں جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلامی تعلیم وتربیت کے صدقے میں صرف مسلمان اقوام ہی اس تعلیم کو بہ آسانی سمجھ سکتی ہیں۔ باقی اقوام نیشنلزم سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ اس یونیورسل اپیل کو "Utopian" سمجھیں گی یا اسے اپنے تسلط کے منافی سمجھیں گی۔

اقبال نیشنلزم کے ہر اُس تصور کا شدید مخالف ہے جس کا معیار وطن رنگ، نسل اور زبان ہو۔ رینان کا یہ مقولہ کہ "اسلام اور سائنس باہم متناقض ہیں" صحیح نہیں۔ کیونکہ اصل میں "اسلام اور نسلی امتیاز باہم متناقض ہیں" اقبال خود ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

"میں نے جب یہ محسوس کیا کہ قومیت کا تخیل جو نسل و وطن کے امتیازات پر مبنی ہے۔ دنیائے اسلام پر بھی حاوی ہوتا جاتا ہے اور جب مجھے یہ نظر آیا کہ مسلمان اپنے وطن کی عمومیت اور عالمگیری کو چھوڑ کر وطنیت اور قومیت کے پھندے میں پھنستے جاتے ہیں تو بحیثیت ایک مسلمان اور محب نوع انسان کے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ میں ارتقائے انسانیت میں انہیں ان کے اصلی فرض کی طرف توجہ دلاؤں۔ اس سے انکار نہیں کہ اجتماعی زندگی کے ارتقا اور نشوونما میں قبیلے اور قومی نظامات کا وجود بھی ایک عارضی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اگر ان کی اتنی ہی کائنات تسلیم کی جائے تو میں ان کا مخالف نہیں لیکن جب انہیں انتہائی منزل قرار دیا جائے تو مجھے ان کے بدترین لعنت قرار دینے میں مطلق تامل نہیں۔"

اس بحث کو زیادہ طول دینے کے بغیر میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ اقبال کے اُن سینکڑوں اشعار کی طرف مبذول کروں جن میں اقبال نے نیشنلزم کی مخالفت کی ہے۔ اور دنیا کی سب سے بڑی قوم، یعنی انٹرنیشنلزم بلکہ یونیورسلزم میں اعتقاد رکھنے والی قوم کو، ان جغرافیائی اور غیر فطری قیود سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہے "وطنیت" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں لکھتے ہیں :-

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ــــ تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ــــ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے ــــ قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ان اشعار اور سینکڑوں دوسرے ترانوں کو ریمزے میور کی ایک مختصر سی کتاب The Political Consequences of War کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو ان فقرات کی صداقت کا مزید یقین ہو جائے گا "سوشلزم اور سرمایہ" کے موضوع پر "اقبال" نے نہایت صاف انداز میں اظہار خیال کیا ہے

اقبال مزدور کا حامی ہے۔ سرمائے کی مضرتوں اور ناانصافیوں کا دردناک حال نہایت شیریں اور دلگداز نغموں میں ظاہر کرتا ہے۔ قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" اور خضر راہ کے معرکتہ آلارا بند میں جہاں سرمایہ دار کی شاخ نبات کا ذکر ہے اس بلیغ پیرایے میں مزدور کی محکومی اور مجبوری کا اظہار کیا ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں اقبال کو سوشلسٹ سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن اقبال جس طرح باقی تخیلات میں مستقل راہ اور رجحان رکھتا ہے اسی طرح اس معاملے میں بھی وہ ان مسائل کو اپنے خاص نصب العین کے معیار پر پرکھتا ہے چنانچہ جاوید نامہ میں سید جمال الدین افغانی کی زبانی جن اسرار کا اظہار کیا ہے وہ خاص غور کے قابل ہیں۔ افغانی پہلے تو یہ بتلاتے ہیں کہ قیصریت کی شکست، سود کی مذمت، زمین پر خدا کا قبضہ، تمام انسانی برادری کی مساوات وغیرہ میں مسلمان اور روسی متحد الخیال ہیں لیکن اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ روسی کے تصور کی بنیاد "شکم" پر ہے اور روح کی ترقی کے بجائے اس کا منتہائے نظر "جسم" ہے۔ روس کی تہذیب لاکھ مدح کے قابل سہی لیکن چونکہ اس میں "ذکر حق" کی کمی ہے اس لئے اس سے بھی احتراز لازم ہے۔ کارل مارکس کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۵]۔

صاحب سرمایہ از نسل خلیل	یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل او مضمر است	قلب او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را	در شکم جویند جان پاک را

جزبہ تن کارے ندارد اشتراک	رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک
بر مساوات شکم دارد اساس	دین آں پیغمبر ناحق شناس
ہیچ او در دل نہ در آب و گل است	تا اخوت را مقام اندر دل است

اقبال سوشلزم کو وسیع انسانی برادری کی تعمیر اور ترکیب کے لئے اتنا مضر نہیں سمجھتے جتنا نیشنلزم کو۔ مگر سوشلزم کو بھی روحانیت کے بغیر ناقص خیال کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اب تک میں یہ ظاہر کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکا ہوں کہ اقبال، موجودہ تمدن اور اس کے مختلف شعبوں میں کس قسم کا انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ فرنگی تہذیب خود اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر رہی ہے اور مغرب خود اپنی ہی تلوار کے زخموں سے گھائل ہو رہا ہے۔ ایشیا تاریخ کے اس زبردست انقلاب کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اہل ایشیا کا فرض ہے کہ اس رستخیز میں دیدۂ بینا اور گوش شنوا سے کام لیں اور اپنے آپ کو ان مضرتوں سے محفوظ رکھیں جو یورپ کی ہلاکت کا باعث ہو رہی ہیں۔ جس طرح روسو اور والٹیر کا لٹریچر فرانس میں ایک زبردست تبدیلی اور ہیجان کا پیش رو تھا اسی طرح اقبال کا لٹریچر ایشیا میں ایک عظیم الشان ذہنی قیامت کا پیغامبر ثابت ہوگا۔ جس کے آثار روز بروز زیادہ روشن ہوتے جاتے ہیں۔

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک	بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم
خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند	جوہر نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

سید محمد عبداللہ

نین کٹاری

سُن توسکھی میں تجھ پرواری　　مجھ کو دیکھ ہنسیں نرناری

میں تو تن من دھن سب ہاری

ہردے لاگی نین کٹاری

کل اشنان کیا جو میں نے　　کوٹھا چھوڑ چڑھی اٹاری[1]

دیکھی صورت سانولی پیاری

ہردے لاگی نین کٹاری

ہاتھ سے میں نے بال نچوڑے　　کنگھی لے کے مانگ نکاری

پہن رہی تھی صندل ساری

ہردے لاگی نین کٹاری

سکھی بنا کچھ، نو جگ کھیلی　　نئی نویلی میں دُکھیاری

مار گیو موکو گردھاری

ہردے لاگی نین کٹاری

سید مقبول حسین
احمد پوری

[1] اٹاری کوٹھے سے اونچی جگہ زینے کی چھت

مادھوری

شریمتی جی نے ہنس کر کہا "ڈاکیا دو پتر دے گیا ہے۔ ایک بھگوانداس جی کا دوسرا ڈاکٹر ٹنڈن کا" میں نے جواب دیا اچھا ہوا ارات کی گاڑی سے ہم مسوری نہیں گئے۔ میں رام کشور کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا اُس کو ریل سے گرے ایک مہینہ ہونے آیا ڈاکٹر ٹنڈن کہتے تھے کہ چوٹ بھی معمولی آئی ہے لیکن وہ ابھی تک کاشی کیوں نہیں لوٹے۔ ڈاکٹر ٹنڈن کا خط یہ تھا:۔

(۱)

از لکھنؤ۔ مورخہ ۳ مئی ۱۹۳۱ء

آپ کا خط ملا۔ معاف کیجئے جواب دینے میں دیر ہوئی۔ رام کشور کو زیادہ چوٹ آئی ہے تاہم جلد اچھا ہو جانے کی امید ہے لیکن مجھے سخت تعجب ہے۔ کہ وہ اس عمر میں زندگی سے کیوں اکتا گیا ہے۔ ایک نامراد عاشق بھی اپنے محبوب کے التفات کے انتظار میں ایک طویل مدت کاٹ دیتا ہے محض اس خیال سے کہ کبھی نہ کبھی اس کے دل کی بات پوری ہو گی لیکن یہ ۲۸ سال کا لونڈا زندگی سے ایسا روٹھ گیا ہے کہ کسی طرح اس کا جی نہیں بہلتا وہ اخبارات سے پنکھے کا کام لیتا ہے اور رسائل بوڑھے ملازم کے سر پر پھینک دیتا ہے خطوط تو کبھی پڑھتا ہی نہیں اگر اس کی یہی حالت رہی تو خدا نہ کرے کسی مہلک مرض کے ہو جانے کا اندیشہ ہے آپ از راہ نوازش اس کو خط لکھتے رہیئے اسے یہ علم نہیں کہ میں اُس کی کیفیت آپ کو لکھ رہا ہوں۔ بسا اوقات تمام دن سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے اکثر الماری کی کتابوں اور رسائل سے غریب ملازم کے سر کی تواضع کرتا ہے اگر للو میرا پرانا ملازم نہ ہوتا تو یقیناً میرے گھر میں ملازم کا رہنا ایک دشوار امر تھا اور کیا لکھوں آج رات کی گاڑی سے میرٹھ جا رہا ہوں۔ واپسی پر ملنے کی کوشش کروں گا

میں نے سوچا کل مسوری جا کر سب سے پہلے رام کشور کو خط لکھوں گا پھر کوئی دوسرا کام کروں گا۔

(۲)

مسوری۔ مورخہ ۴ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

ڈاکٹر ٹنڈن کے خط سے یہ معلوم ہوکر کہ اب تمہاری حالت روبراہ ہے میری فکر دور ہوئی۔ وہ بڑے خلیق اور ہمدرد ڈاکٹر ہیں تم کو بہت جلد پاؤں چلنا سکھادیں گے۔ میرے اس خشک اور روکھے پھیکے خط سے تمہارا دل کیا بہلے گا کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوتا تو پریوں کا تذکرہ کرتا لیکن کیا کروں کرائے سے لئے ہوئے اس نئے بنگلے کے ایک کمرے میں ٹھہرا ہوں جس کی مالکہ ایک عیسائی عورت (مسز مکرجی) ہے عمر تقریباً اسّی نوے سال ہوگی آج کل اس کے پاس صرف ایک بھتیجا ہے۔ سارا بنگلہ خالی پڑا ہے۔ سنا ہے دو تین دن میں دہلی سے مسز مکرجی کی بہن کی لڑکی جو وہاں کرسچین کالج میں پڑھتی ہے آنے والی ہے۔ اُس کی عمر چودہ سال کی ہے اور نام مادھوری ہے ایف اے میں پڑھتی ہے گذشتہ سال انٹرنس کے امتحان میں اس کا چوتھا نمبر تھا۔

تمہاری بہن خط نہ لکھنے کے باعث تم سے سخت ناراض ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ تم کو ان کا سلام نہ لکھا جائے۔ گو مجھے کاغذ سیاہ کرنے کی عادت ہے جلد اپنی خیریت کی اطلاع دو

شیام چرن

(۳)

از لکھنو مورخہ ۶ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے شیام چرن!

تمہارا خط ملا بھلا میں کیا اور میری ناراضی کیا! ٹانگ کا زخم اب مندمل ہوتا جاتا رہا ہے۔ سیتا جی کے بیاہ کو آج پندرہ برس ہوئے لیکن اس عرصہ میں مجھے پلنگ پر رات دن پڑے رہنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا البتہ اس سے پہلے بیمار ضرور ہوا تھا۔

لکھنؤ ایسے مقام میں بھی میری طبیعت نہیں لگتی مجھے چاروں طرف ویرانہ نظر آتا ہے۔ اس باغ میں جہنوب کوئی نیا چہرہ دکھائی نہیں دیتا بس بلو مالی اور ڈاکٹر روزانہ آتے ہیں اور وہاں قریب کے قدِ آدم آئینہ میں ایک اور چہرہ نظر آتا ہے۔

یہاں شدت کی گرمی پڑرہی ہے۔ تم روز خط لکھا کرو کم از کم دوسرے روز تو ضرور لکھ دیا کرو۔ مس مادھوری کے حالات لکھنا۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ ہنوز تمہارا دل حسن کا شیدا ہے۔ سب باتیں تفصیل سے لکھنا، بال کتنے لمبے ہیں دانت کیسے ہیں، کس رنگ کا لباس پہنا کرتی ہیں وغیرہ۔ سیتا کو پیار اگر تمہاری مادھوری دراصل مادھوری ہوئیں تو میں بھی بہت جلد اُن کو دیکھنے آؤں گا۔

رام کیشور

(۴)

مسوری۔ مورخہ ۹ مئی

مس صاحبہ آگئی ہیں آج صبح درشن ہوئے۔ اُس وقت ہلکی گلابی ساڑھی پہنے ہوئے تھیں اور پاؤں میں

قیمتی کا مدار ہوتا تھا۔ خانساماں سے میں نے دریافت کیا ہے، والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ گرمیوں میں اکثر مسوری میں رہتی ہیں ٹکٹ جمع کرنے کا بہت شوق ہے کوئی دو ہزار ٹکٹ جمع کر چکی ہیں ملازمین سے بہت اچھا برتاؤ کرتی ہیں ٹینس کھیلتی ہیں ناچ دیکھتی ہیں۔ بائیبل پڑھتی ہیں۔ غرض بحیثیتِ مجموعی ایک حیرت انگیز ہستی ہیں۔

بس آج اسی قدر باقی کل۔ وجہ یہ ہے کہ میں آج مادھوری اور ان کی خالہ کے ساتھ سینما دیکھنے جا رہا ہوں

شیام چرن

(۵)

مسوری مورخہ ۱۱ مئی

مادھوری ایک نہایت خوبصورت لڑکی ہے۔ ایشور نہیں جلد اچھا کر دے۔ تم خود دیکھ لوگے۔ جب ہنستی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ ایسی حسین دوشیزہ میری نظر سے پہلے نہیں گذری۔ آنکھوں کی خوبصورتی کے متعلق کچھ لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ اُس کے خصائل متعجب کن ہیں۔

چودہ سال کی لڑکی میرے کمرے میں دوڑتی ہوئی آکر پوچھتی ہے" درما جی آج کچھ ٹکٹ آئے" کبھی نگاہ نہیں اٹھتی حالانکہ میں بہت محتاط ہوں تاہم اگر یہی کیفیت رہی تو تعطیل کسی اور جگہ گذارنی ہوگی اگر تم دیکھنا چاہتے ہو تو جلد بھلے چنگے ہو کر آؤ۔

شیام چرن

(۶)

از لکھنؤ مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے شیام چرن جی

بھگوان کے لئے اور دس بارہ دن مسوری ٹھہرو۔ میں بہت جلد اچھا ہو جاؤں گا۔ ٹانگ کا زخم مندمل ہو جانے میں دو تین دن کی کسر ہے۔ لیکن ابھی ڈاکٹر صاحب آٹھ دس روز نہیں اٹھنے دیں گے۔ کیا اس کی کوئی تصویر بھیج سکتے ہو یہ خط میں بہت عجلت میں لکھ رہا ہوں۔

رام کیشور

(۷)

مسوری مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

تار کے پارسل سے رس گلے اور امرتی بھیجو۔ بے تکلفی روز بروز بڑھ رہی ہے اس نے بتایا کہ اُس کا پہلا نام نیلس ہے نیلس مادھوری دت تم یہ معلوم کر کے خوش ہو گے کہ وہ رباب پر بہت عمدگی سے گا سکتی ہے اس سلسلہ میں آج میں نے تمہارا ذکر کر دیا۔ کہنے لگی وہ کب تک آئیں گے۔ میں تو مہینے سوا مہینے میں چلی جاؤں گی۔ تمہاری تصویر دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے کل دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ باوجود عیسائی ہونے کے اس کا میلان زیادہ تر ہندو دھرم کی طرف ہے۔ ہندی منظومات سے بہت دلچسپی لیتی ہے کوئی ہندی نظموں کی اچھی سی کتاب اپنے ساتھ لیتے آنا لیکن میری مٹھائی مت بھولنا،

شیام چرن

(۸)

مسوری مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

صرف شکریہ ادا کرنے سے کیا ہوتا ہے بغیر رس گلے اور امرتی کے کام نہیں چلے گا۔ میں محنت بھی تو خوب کر رہا ہوں ہاں تو بتاؤ تم خود عیسائی ہو جاؤ گے یا اس کو شدھ کرو گے۔ وہ کہتی ہے کہ میں ہندو دھرم کی پرستار ہوں۔ لیکن نانا کے خوف سے اپنا مذہب چھوڑنا پسند نہیں کرتی۔ یہ کان کھول کر سن لو کہ ایک عیسائی عورت سے ہمارا کوئی سروکار نہیں ہو سکتا۔

اس نے تمہاری تصویر دیکھنے کو لی تھی اب کہتی ہے کھو گئی اب میں تم سے اس کی سفارش نہیں کر سکتا۔ مجھے پسند نہیں کہ تمہاری بیوی جھوٹی ہو۔ تمہاری تصویر اس نے بائیبل میں رکھی ہے اور روز بائیبل پڑھنے کے حیلے سے تمہارے درشن کرتی ہے اُف عورت کا دل بھی کس قدر فریب آشنا ہے اگر مجھ سے یوں ہی مانگتی تو کیا میں اس کو نہ دے دیتا۔ تم نے دریافت کیا ہے کہ کیا میں مادھوری کو ایک مختصر مکتوبِ محبت لکھ سکتا ہوں۔ سنو تم ہرگز نہیں لکھ سکتے۔ کیونکہ مسز مکرجی اس کے باہر سے آئے ہوئے خطوط کو بڑے غور سے پڑھتی ہیں دوسرے ابھی اُس کا سن ہی کیا ہے

شیام چرن

(۹)

ازمسوری مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کیشور

واضح ہو کہ بنی بنائی بات بگڑ گئی۔ مسز مکرجی نے کل بائیبل میں تمہاری تصویر دیکھ لی۔ وہ مجھ سے بھی منہ پھلائے بیٹھی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مادھوری نے بھی خالہ سے کچھ گستاخی کی ہے۔ ایسی حالت میں تمہارا یہاں جلدی کر کے آنا محض بیکار ہے۔ ٹانگ جب بالکل اچھی ہو جائے اور ڈاکٹر صاحب اجازت دیں تو روانہ ہونا۔ ورنہ ابھی ٹھہرو۔

شیام چرن

(۱۰)

ازمسوری مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۳۱ء

جناب ڈاکٹر صاحب

میں نے سوچا تھا کچھ اور ہوا کچھ رام کشور کا یہاں عجلت کر کے آنا یقیناً نامناسب ہے جس طرح ممکن ہو اُس کو اور کچھ دن روک لیجئے آج اُس کا تار ملا ہے کہ میں پرسوں روانہ ہو جاؤں گا۔

شیام چرن

تار ——— ۲۵ — ۵ — ۳۱

رام کشور معرفت ڈاکٹر ٹنڈن سندر باغ لکھنو

فی الحال آنا بیکار ہے۔ ٹھیک وقت پر اطلاع دوں گا

شیام چرن

تار ۔۔۔ ۳۱ ۔۔۔ ۵ ۔۔۔ ۳۱

ورما۔ برچ ویلا مسوری

میرا آنا پوشیدہ رکھا جا سکتا ہے کل روانہ ہو جاؤں گا۔

رام کشور

تار ۔۔۔ ۳۱ ۔۔۔ ۵ ۔۔۔ ۳۱

رام کشور معرفت ڈاکٹر ٹنڈن سندر باغ لکھنو

پاگل پن نہ کرو۔ تم اس سے مل نہیں سکتے۔ اُس نے اپنی محبت ظاہر کر دی ہے۔ اس سے ہر قسم کی ملاقات بند کر دی گئی ہے۔

شیام چرن

تار ۔۔۔ ۳۱ ۔۔۔ ۵ ۔۔۔ ۳۱

ورما برچ ویلا مسوری

ملاقات بند کر دی گئی ہے؟ بس انتہا ہو گئی آج رات کی اکسپریس سے روانہ ہوتا ہوں۔

رام کشور

مسوری۔ مورخہ ۲۷ رمئی ۱۹۳۱ء

پیارے رام کشور

سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ تم کو منہ نہیں دکھا سکتا لہذا آج مسوری سے روانہ ہو رہا ہوں۔ ڈاکٹر ٹنڈن سے تمہاری کیفیت معلوم کر کے تمہاری طبیعت بہلانے کے لئے میں نے یہ ترکیب سوچی تھی اور اس لئے اس عیسائی لڑکی کا من گھڑت قصہ چھیڑ دیا تھا۔ میں کیا جانتا تھا کہ تم اتنے بے صبر ہو جاؤ گے۔ برچ ویلا ایک کشمیری دوست کا بنگلہ ہے۔ میں نے پورا بنگلہ کرائے پر لے رکھا ہے میں یہاں نہ کسی کرسچین اور نہ کسی ہندو کالج کی لڑکی سے آشنا ہوں امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔

شیام چرن

(ترجمہ از سرسوتی)

تقی علی ہاشمی ناگ پور

غزل

فقر کے پردے میں پنہاں ہے غنا میرے لئے
مسندِ شاہی ہے میرا بوریا میرے لئے

اُس نے کی تجویز کچھ ایسی دوا میرے لئے
دوست میرے کر رہے ہیں اب دعا میرے لئے

تو نہ کر افسوس اے جانِ وفا میرے لئے
عشق تھا شرط اور محرومی جزا میرے لئے

کوئے جاناں کے لئے میں ہی نہیں ہوں مضطر
کوئے جاناں بھی ہے آتش زیر پا میرے لئے

وہ نگاہیں کاہے کو ہوتیں مروّت آشنا
رہ گئی سر پیٹتی میری وفا میرے لئے

کعبۂ مقصود ہے مجھ کو کسی کی رہگزر !
ہے گلِ امید ہر ہر نقش پا میرے لئے

اب خفا ہونے لگے ہو مجھ سے ہر ہر بات پر
تم کہ ہو جاتے تھے دشمن سے خفا میرے لئے

دِل دھڑکتا ہے اِدھر اور تُند اُدھر اُن کا مزاج
کس قدر مشکل ہے عرضِ مُدعا میرے لئے

محفلِ اغیار میں وحشت نہیں میں نامُراد
مضطرب ہے وہ نگاہِ آشنا میرے لئے

رضا علی وحشت

بُدھ اور اُس کا مت

سائنس کی ترقی کے ساتھ جہاں مذہب سے بیگانگی نے ترقی کی وہاں مذہب کے متعلق تاریخی تحقیقات کا ذوق بڑھا۔ اس سلسلے میں مذاہب کا مقابلہ شروع ہوا تو بدھ مت کی جانب دنیا کی توجہ مبذول ہونے لگی۔ حتیٰ کہ اب بدھ اور اس کے مذہب کے متعلق کئی مبسوط کتابیں ممالک غیر میں شائع ہو چکی ہیں۔ حال میں ایک ضخیم کتاب مسز رس ڈیودس نے "ساکیا" کے نام سے شائع کی ہے جس میں درج ہے کہ بدھی مذہبی کتابیں دنیا بھر کی مذہبی کتابوں سے شمار میں کہیں زیادہ ہیں۔ اس کتاب میں بُدھ مت پر نہایت مفصل نکتہ چینی کی گئی ہے۔ گذشتہ چند سال میں بُدھ دھرم کی جاترا (ڈاکٹر پریٹ)، لائف آف بُدھا (بروسٹر)، لائف آف بُدھا (ہیرالڈ) اور سر ہری سنگھ گوڑ کی کتاب "جوہر بُدھ مت" شائع ہوئی ہیں مختلف کتب کے مطالعہ سے مذہبی تحقیق کے شائق پریشانی میں پڑ جاتے ہیں کہ کس واقعہ کو صحیح اور کس کو غیر صحیح مانا جائے۔ کثرتِ تعبیر خواب ہی کو پریشان کر دیتی ہے۔ آخر کیونکر کتبِ قدیم کے ذخارِ سمندر میں سے اصلی واقعات دریافت ہو سکیں۔

بُدھ مذہب کے مختلف فرقے۔ جب کہ الہامی کُتب کے پیرؤں میں کثیر التعداد فرقے ہو گئے ہیں تو بُدھ مذہب میں جو انسانی دماغ کا نتیجہ ہے۔ فرقے کیوں نہ پیدا ہوتے۔ واضح ہو کہ بُدھ دھرم کے دو بڑے فرقے ہیں ایک جو اپنے کو مہایانا کہتا ہے یعنی بڑی سواری۔ اس نے دوسرے فرقے کو ہین یانا یعنی چھوٹی سواری کا نام دے دیا ہے۔ مگر وہ اپنے تئیں تھراوادا کہتے ہیں۔ اول الذکر کے اصول میں ویدانت کے فلسفہ کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ آخر الذکر میں لاادریہ یا دہریہ خیالات کا رنگ غالب ہے۔ ان دونوں فرقوں کی کئی اور شاخیں ہیں جن میں کئی موشگافیاں کی گئی ہیں میرا عقیدہ جو تاریخی مطالعہ سے قائم ہوا ہے یہ ہے کہ کوئی مذہب اپنی اصلی سادگی مدت تک قائم نہیں رکھ سکتا یہی صورت بُدھ مت کی ہے۔ یورپین مصنفوں نے بُدھ کو مختلف پیرایوں میں دکھایا ہے۔ اور اس کی تعلیم کو اپنے اپنے خیالات کے مطابق رنگ دے دیا ہے چنانچہ:۔

ایک صاحب اس کو دہریہ کہتے ہیں اس کی تعلیم کو بے معنی لکھتے ہیں اور سانکھ فلاسفی کی نقل سمجھتے ہیں۔

دوسرے صاحب اس کو لاادریہ اور اس کی تعلیم کو موجودہ سائنس کے مطابق سمجھتے ہیں۔

تیسرے صاحب اس کو ویدک مذہب کا پیرو اور آپ نشدون کا قائل بیان کرتے ہیں۔

چوتھے صاحب۔ اس کو صرف ابنائے جنس کے درد والم کو محسوس کرنے والا اور اس کا درمان بتانے والا [illegible]

پانچویں صاحب۔ اس کو انسان و حیوان کا شفیق اور محبت کرنے والا تصور کرتے ہیں اور محبت کا پہلا موجد سمجھتے ہیں۔

چھٹے صاحب بدھ لٹریچر کو بعد کی تحویلیں اور تحریفیں سمجھتے ہیں بقول ان کے صرف پہلا وعظ جو بدھ نے سارناتھ میں کیا حافظوں نے سینہ بہ سینہ صحیح طور پر بدھ کے اپنے لفظوں میں یاد رکھا ہے۔

جو مصنف بدھ مت کے پیرو ہیں انہوں نے اپنے اپنے ایمان کے مطابق اس کے سوانح اور تعلیم بیان کی ہے۔ راقم الحروف کو سنسکرت اور پالی اور دیگر غیر زبانوں کی ناواقفیت کے باعث یہ حوصلہ نہیں کہ کسی وثوق یا اعتماد سے اصلیت کو بعد کی تحریفات سے جدا کر سکے۔ تاہم اکثر ایسے واقعات ہیں اور بہت سا حصہ بدھ کی تعلیم کا ایسا ہے جس میں اختلاف نہیں۔

چنانچہ بدھ کے واعظ بننے سے قبل کے واقعات کتب معتبر میں یوں بیان ہوئے ہیں :-

بدھ کی پیدائش اور حالات نیپال کے ترائی میں ایک بڑی زمینداری یا ریاست ہوتی تھی جسے سنسکرت میں کپل وستو اور پالی میں کپل وستھو کہتے ہیں۔ اس کا راجا یا حکمران سدھودھن ساکھیا قوم اور گوتم گوت کا تھا۔ اس نے کولیا قوم کے راجا کی دو بیٹیاں بیاہی تھیں ایک کا نام مایا تھا جس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سدآرتھ رکھا گیا۔ کولیا قوم دریائے روہنی کے پار بستی تھی۔ یہ دونوں راجے کشتری تھے۔ دستور تھا کہ رانی اپنے میکے جا کر بچہ جنتی تھی چنانچہ مایا میکے روانہ ہوئی مگر راستے میں ایک جنگل موسوم لمبینی میں اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سدآرتھ رکھا گیا۔ اس کا زائچہ تیار ہوا۔ اور ماہران علم جوتش نے پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا چکرورتی یعنی یا تو دنیا کا عظیم الشان بادشاہ ہوگا یا روحانی مملکت پر تسلط کرے گا۔ جب سدآرتھ عظمت کے درجے کو پہنچا، تو فرط تعظیم سے بہت سے نام اُس کو دیئے گئے مثلاً

ساکیا منی۔ قوم ساکھیا کا دانشمند۔

بھگوت۔ محترم۔

ستھا۔ استاد۔

جنا۔ فاتح

بدھ۔ منور۔

علی العموم اس کو بدھ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اپنے تئیں بدھ تتھاگت (یعنی مثل رُوندگان سابق) کہا کرتا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ اس سے پہلے بھی بہت بدھ گذر چکے ہیں جن کے سلسلہ میں وہ خود کو تصور کرتا تھا۔

بدھ دھرم کا بانی ۵۶۰ یا ۵۵۷ سنہ ق م میں پیدا ہوا۔ ساتویں روز اس کی والدہ مایا انتقال کر گئی۔ اس کی ماسی پرجاپتی نے جو سوتیلی والدہ تھی اُسے پرورش کیا۔ انیس سال کی عمر میں اس کی شادی اس کی ایک رشتہ دار دسودھرا سنے ہوئی۔ یہ کولیا قوم سے تھی۔ ۱۰ سال کے بعد ایک لڑکا اس بیوی سے ہوا جس کا نام راہولا رکھا گیا۔

ترکِ دنیا۔ سدارتھ کی طبیعت نمایاں طور پر غیر معمولی تھی۔ وہ ثروت و دولت کے مقناطیس کے دام سے آزاد تھا۔ ہر وقت سوچ بچار میں منہمک رہتا اور بے ثباتی عالم پر غور کرتا تھا۔ وہ بنی نوع انسان کے مصائب کا علاج سوچتا رہتا تھا۔ بڈھوں بیماروں اور مُردوں کے نظارے نے اس کے دل پر بے انتہا اثر کیا۔ ایک تارک الدنیا زاہد کے دیکھنے سے اس کو سکونِ خاطر حاصل ہؤا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ گھر سے نکل کھڑا ہو اور ابنائے جنس کے آلام کا تدارک سوچے۔ کئی امور مانع تھے۔ لیکن جس دن اس کی بیوی کے لڑکا پیدا ہؤا اُس دن اس نے مستحکم عزم کر لیا کہ اس زنجیر سے بھی وہ آزاد ہو جائے گا۔ گھوڑے پر سوار ہؤا اور گھر سے نکل پڑا۔ راستہ میں شاہی زیبائش کی سب چیزیں سائیس کے ہاتھ واپس بھیج دیں۔ لمبے بال کٹوائے اور تارک الدنیا کا لباس زیب تن کیا۔ اور مگدھ کی راجدھانی راج گڈھ پہنچا وہاں فقرا، یوگی، برہمن ودیاوان غاروں میں مراقبہ اور درس و تدریس میں مشغول پائے۔ آلارا کلاما اور اُدکا رام پتا جیسے ودیاوانوں سے اس کی تشفی نہ ہوئی چنانچہ وہ ایک جنگل کو جسے اُس زمانہ میں یوروبلا کہتے تھے روانہ ہؤا۔ یہ جنگل گیا جی کے نواح میں تھا۔ اس جنگل میں پانچ برہمن تپسیّ دھیان میں مصروف اُس کو ملے۔ جو نفس کشی اور جسمانی تکالیف برداشت کرنے کی ریاضت میں مصروف تھے۔ سدارتھ ریاضت میں ان پانچوں زاہدوں سے بڑھ گیا۔ چھ سال یہاں وہ تپسیا کرتا رہا۔ اس تپسیا کا نتیجہ یہ ہؤا کہ لوگوں میں اس کی شہرت پھیلی کہ یہ شخص راہِ نجات کے قریب پہنچ گیا ہے لیکن اُس کی اپنی طبیعت پر برعکس اثر ہؤا اس کا تنومند جسم اور حسین صورت محض ایک سایہ رہ گئے۔ ایک روز وہ بیہوش ہو کر گر گیا۔ ایک گوالن شوجاتا نے جس کا نام بُدھی کتابوں میں لازوال ہو گیا ہے۔ اُس کو دودھ دیا ہوش میں آیا تو اُس نے غلط راستہ چھوڑنے کا عزم کر لیا۔ اس نے معمولی غذا کھانی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ وہ پانچ برہمن اس سے متنفر ہو گئے۔ اور بنارس کو چلے گئے۔ جسے وہ زیادہ مقدس اور مناسب مقام سمجھتے تھے۔

نروان اور دیگر حالات۔ سدھارتھ ایک پیپل کے تلے بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں جذبات کی کشمکش ہوتی رہتی۔ بیان ہوا ہے کہ مارا یعنی بدی کے دیوتا نے اُسے ڈرایا۔ لبھایا مگر وہ اپنے ارادے پر قائم رہا۔ سات ہفتے محویت میں صرف ہوئے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کو نورِ باطن حاصل ہو گیا ہے یعنی بُدھ ہو گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ وہ پھر جنم نہیں لے گا۔ گویا کامل رستگاری اسے حاصل ہو گئی۔ اس نے دردِ الم کا درمان دریافت کر لیا۔ ایک ہفتہ وہ اس دریافت کی مسرت سے محظوظ اور مگن رہا۔ سوچتا تھا کہ اپنی دریافت کا انکشاف کرے یا نہ کرے۔ اسے خیال یہ تھا کہ ممکن ہے کہ اس کا مسلک کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ آخر اس کے دل نے اسے ہدایت دی کہ نہیں خواہ کچھ ہو اس مسلک کو لوگوں پر ظاہر کرنا چاہئے۔ بُدھ مذہب کی کتابوں میں اس کی دماغی کشمکش کی حالت نہایت فصاحت اور بلاغت سے بیان کی گئی ہے۔ راقم الحروف میں وہ زورِ قلم نہیں کہ اس بیان کے تتبع کی جرأت کرے جس پیپل کے نیچے بدھ بیٹھا تھا اس کا بچہ آج تک موجود ہے۔ اس مقام کو بُدھ گیا کہتے ہیں۔ یہاں ایک عظیم الشان بے مثل مندر زمین سے برآمد ہوا ہے جو ایک

شیوی رمادھو کے زیر اہتمام ہے۔ اس پیپل کی ایک شاخ اشوک کے عہد میں اُس کا فرزند وختر لے گئے تھے۔ جہاں وہ درخت ہوگیا۔ اس کا اب تک طواف ہوتا ہے۔

اب سدھارتھ بُدھ کی حیثیت سے بنارس جاتا ہے۔ وہی پانچوں برہمن اُسے مل جاتے ہیں۔ جس مقام پر وہ آ سے ملے تھے سارناتھ میں واقع ہے جو شہر بنارس سے ۷ میل ہے اور جو کسی زمانہ میں کاشی جی (بنارس) کا حصہ تھا۔ اس مقام پر ایک قدیم ستوپا تھا۔ اس پر شہنشاہ ہمایوں تخت پر بیٹھا تھا اس واقعہ کی یادگار میں اکبر نے ایک گنبد بنایا اور اس پر ایک فارسی قطعہ کندہ کیا جس میں اس کے باپ کے یہاں آنے کا ذکر ہے۔ اس کندہ تحریر پر ہجری سنہ مطابق ۱۵۸۸ء کے ہے۔ یہاں بُدھ نے پہلا وعظ سنایا تھا جو بُدھ دھرم کی بنیاد ہے۔ سارناتھ بعد میں یعنی اشوک کے زمانہ میں بارونق اور مقتدر ہوگیا۔ کئی ستوپے، مندر، درگاہیں یہاں بنیں اور تباہ ہوئیں پھر بنیں اور تباہ ہوئیں۔ صدیوں کے انقلابوں اور بربادیوں کے بعد اب پھر ایک رفیع اور عظیم الشان بُدھی مندر تیار ہوگیا ہے۔ سارناتھ کے پھر نصیب جاگے ہیں اُس کو حیاتِ تازہ حاصل ہوگئی ہے۔

بُدھ کے وعظ اور قانونِ اخلاق ۔ اگر ہم بُدھ کے وعظوں اور مقالات کو بیان کریں تو کئی جلدیں درکار ہونگی۔ بعض پر اعتراضات بھی ہیں کہ وہ بعد کی اختراعات ہیں لیکن کم از کم پہلا وعظ نکتہ چینی سے مُعرا ہے قبل اس کے کہ ہم اس وعظ کو نقل کریں یہ بتانا ضروری ہے کہ بُدھ نے ایک قانونِ اخلاق دنیاداروں کے لئے بھی وضع کیا جس کی اس نے تلقین کی اور ایک فرقۂ فقرا قائم کیا جس کے لئے اس نے سخت قواعد مقرر کئے۔ شروع میں یہ فرقہ جو بھکو کہلاتا تھا صرف ذکور پر محدود تھا۔ بعد میں اس نے اپنی ماسی کے اصرار پر اور اپنے شاگردِ رشید انند کی سفارش پر اناث کو بھی اس میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ ابتدائی زمانہ میں ہی بھکو اور بھکشنیں تھیں جنھوں نے یہ دھرم دنیا میں پھیلایا۔ بعض نکتہ چینوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ بُدھ مت حزن و ملال اور یاس و حرماں کا مجسم نمونہ ہے۔ اس میں نشاط مسرت، اطمینان، امید قطعی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں راگ اور ویراگ دونوں ہیں۔ یہ مت سب زنجیروں سے آزاد ہے۔ کسی کا خوف و خطر نہیں۔ واقعیت اس کی کلید ہے۔ انسانوں کے آلام باعثِ ملال ہیں۔ اُس کے مدافعت میں کامل مسرت اور بہجت ہے گرھست یعنی دنیاداری کے زندگی کو بدھ دھرم نفرت یا بے اعتنائی سے نہیں دیکھتا بلکہ تفصیل سے بُدھ نے گرہست کے لئے ہدایات دی ہیں۔ بھکوؤں کے لئے تجرد ضروری ہے۔ ان کا فرض ہے قانونِ بدھ کا پرچار کریں۔ ملکوں میں پھرنا اور تبلیغ کرنا ان کا کام ہے بھکو نہ تو منک (MONK) ہیں نہ ایسے تارک ہیں کہ پھر دنیادار نہ ہوسکیں۔ ان کو اجازت ہے کہ اگر قواعد کو وہ برداشت نہ کریں تو سنیاسیوں وغیرہ کے برعکس دوبارہ دنیوی زندگی اختیار کرلیں۔ بجائے اس کے کہ حرکات ناشائستہ کریں۔

پہلا وعظ ۔ اب ہم وعظِ اولیں بیان کرتے ہیں۔ بُدھ دھرم سمجھنے کے لئے یہی کافی ہے۔ پالی زبان میں یہ

وعظ من وعن بلاکم وکاست انہیں الفاظ میں جو ذات مبارک کے دہن سے نکلے تھے محفوظ ہے۔ سب مورخوں اور محققوں کا اس بارے میں اتفاق ہے :۔

سنو بھکشو! یہ مسلک دکھ نوارنے کے لئے شاہراہ ہے۔ یہ مسلک پہلے کسی نے نہ سنا تھا۔ مجھ میں روشنی علم۔ ادراک عقل پیدا ہو گئی ہے۔ اس مسلک کو سمجھنا چاہئے۔

سنو بھکشو! ان عالی سچائیوں کو مع ان کے بارہ بابوں کے میں پہلے نہ سمجھ سکا تھا۔ نہ اس دنیا کے دیوتا مارڑا یا برہما سے۔ نہ تارکوں نہ برہمنوں سے مجھے کچھ حاصل ہوا تھا۔ اب مجھے نورِ باطن حاصل ہو گیا ہے۔ یہ زیست میری آخری زندگانی ہے۔ اب میں دوسرا قالب اختیار نہیں کروں گا۔ مجھے اب رستگاری حاصل ہو گئی ہے۔ رستگاری کے خواستگار کو دو اتّوں (Extremes) سے احتراز کرنا چاہئے۔ ایک اتّ لذّات و خواہشاتِ نفسانی کا پورا کرنا ہے جو رذیل اور ہیچ ہے۔ دوسری ات بیجد نفس کشی اور جسمانی تعزیر ہے جو دکھ دائک اور بے سود ہے۔

مسلکِ درمیانہ جو تتھاگت نے معلوم کیا ہے۔ ان دونوں غلط رستوں سے الگ ہے۔ جو آنکھیں کھول دیتا ہے جو بصیرت بخشتا ہے۔ خردمندی مخلصی۔ بیداری۔ دھیان کی راہ بتلاتا ہے۔ یہ ذیل کا ہشتگانہ مسلک گرامی ہے۔

رائے صحیح۔ تمنائے صحیح۔ کلامِ صحیح۔ اعمالِ صحیح۔ معاشِ صحیح۔ سعیٔ صحیح۔ توجہِ صحیح۔

اب دُکھ کی حقیقت حسب ذیل ہے :۔

پیدائش دکھ ہے۔ عارضہ دکھ ہے۔ موت دکھ ہے۔ اندوہ غم و درد دکھ ہے۔ آہ وزاری دُکھ ہے۔ ناگوار کے ساتھ ملاپ دُکھ ہے۔ پیاری چیزوں سے لگاؤ دُکھ ہے۔ ناکام خواہش دُکھ ہے۔ القصہ لگاؤ کے پانچوں زمرے دُکھ ہیں۔ دُکھ کے اسباب کی حقیقت حسب ذیل ہے۔

سچ جانو یہ تشنگی ہے یعنی زیست کی ہوس اور اس کے لُطف اٹھانے کی تمنا جس سے پُنر جنم ہوتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح خواہشات نفسانی پوری ہوں۔ ہوائے نفسانی کے بھوگنے کی ہوس۔ ہوسِ زیست خواہ زندگیٔ حال یا زندگیٔ آئندہ کی ہو یا آرزوئے فنا۔ دُکھ کے پیدا کرنے والے ہیں۔ دُکھ کے زائل کرنے کی حقیقت یہ ہے :۔

اس ہوس کو قطعی نیست و نابود کرنا۔ اس پر فتح پانا۔ اس کا فنا کرنا ہے۔ اب حقیقتِ گرامی اس مسلک کی جس سے دُکھ کا ناش ہوتا ہے یہ ہے :۔

سچ جانو یہ ہشتگانہ مسلکِ گرامی ہے یعنی رائے صحیح۔ تمنائے صحیح۔ اعمالِ صحیح۔ معاشِ صحیح۔ سعیٔ صحیح۔ فکرِ صحیح توجہ صحیح "

توضیح۔ یہ الفاظ بُدھ کے تھے۔ بظاہر یہ بالکل سادہ معلوم ہوتے ہیں بلکہ تقریباً اتنے سادہ کہ حیرت ہوتی ہے کہ کیسے وہ اتنے بڑے مذہب اور فلسفہ کی بنیاد ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کا پورا مفہوم سمجھنے کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہے اور یہ

اس طرح ہوسکتا ہے کہ ان کو اکثر پڑھا جائے۔ اور ان پر تعمق سے دھیان کیا جائے۔ ان کی مختصر تصریح کی جاتی ہے (از مسٹر سٹراس) **حقیقت اوّل** کی زیادہ توضیح کی ضرورت نہیں۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ زندگی دکھ سے پُر ہے اور اگر نسبتاً کبھی کسی موقع پر ہم کو جسمانی یا ذہنی دکھ نہیں پہنچتا تو یہ صرف دکھ کے وقفے ہیں۔ مثلاً اگر گذشتہ جنگِ عظیم کے بے شمار پُر درد اور پُر شوب نتائج کو خیال میں نہ لائیں کیونکہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا تو ذرا ہسپتالوں۔ جیلخانوں۔ پاگل خانوں۔ غربا کے مساکن۔ ذبح خانوں اور اسی قسم کے مقامات کو دیکھئے تو حقیقتِ اول کی صداقت کا تیقن ہوجاتا ہے۔

وہ شخص بُدھ کے مت کو کیا سمجھ سکتا ہے جس کی رائے میں یہی دنیا سب دنیاؤں سے بہتر ہے (مثلاً لیبنز) یا جو اتنا اندھا یا خود پرست ہے جسے ہر جگہ جہاں میں بے اندازہ دکھ نظر ہی نہیں آتا۔ "لگاؤ کے پانچ زمرے" جو اوپر بیان ہوئے محتاج صراحت ہیں۔

بُدھ نے سائنٹفک طریق پر شخصیت کا پانچ حصوں میں تجزیہ کیا ہے:۔

جسم۔ احساس۔ تفہیم۔ تحت شعور۔ شعور۔

بُدھ نے ثابت کیا ہے کہ منفرداً اور مجموعی حالت میں یہ حالتیں عارضی ہیں اور ایسی عارضی حالتوں کی ہوس کا نام شخصیت ہے جو جلد یا دیر سے دکھ پیدا کرتی ہیں۔ لیکن **دوسری حقیقت** کی توضیح زیادہ تفصیل کی محتاج ہے۔ اس سے عالمگیر دکھ کا سبب دریافت ہوتا ہے یہ ہوس ہے جو مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی ہے۔ اس ہوس کے لئے پالی کا لفظ تنشا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی پیاس کے ہیں۔ غالباً یہ لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہو کہ گرم ملکوں میں پیاس زیادہ ستاتی ہے۔ (تنشا فارسی لفظ تشنگی کے مترادف ہے)

ہم اپنے طرز بیان میں اس کو "ارادۂ زیست" کہہ سکتے ہیں۔ یہ جگت (سمسار) بے آغاز و بے انجام ہے ہستیاں جو مایا میں مبتلا ہیں "ارادۂ زیست" میں گرفتار ہو کر بلا روک نئے جنم اور نئے دکھ پاتی ہیں۔ اس تشنگی کی جڑ ارادہ میں ہے۔ جو ہوسِ زیست میں نمایاں ہوتی ہے اسی سے ہوسِ جاہ ہوس شہرت اور ہوسِ لذات پیدا ہوتی ہے۔ بعض اشخاص کو خودکشی کی تحریک ہوجاتی ہے۔ یہ بھی مثل اور ہوسوں کے ایک قسم کی انانیت ہے جو بشکلِ تنفر و حقارت نمودار ہوتی ہے۔ **تیسری حقیقت** سادہ اور صاف ہے۔ جب سبب یعنی پیاس ختم ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دکھ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ پس حتی الوسع سارا زور اس پیاس کے فنا کرنے میں صرف کرنا چاہئے۔ **چوتھی حقیقت**۔ وہ مسلک یعنی راستہ ہے جس سے ہوس ختم ہوتی ہے۔ لہٰذا جس سے دکھ دفع ہوجاتا ہے۔ وہ ہشت گانہ مسلک گرامی ہے۔ اس کے ہر حصہ کے ساتھ لفظ صحیح آتا ہے۔ بُدھ کے مکالمات میں "صحیح" کے معنی وضاحت سے کئے گئے ہیں جو ہم خلاصۃً ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

ہشتگانہ مسلک گرامی

(۱) رائے صحیح یعنی چار گرامی حقیقتوں اور بدھ کے سارے مت کو بخوبی جاننا وہموں اور تعصبوں سے آزاد ہونا۔

(۲) تمنائے صحیح۔ بدھ مت کو درست سمجھ کر مستحکم ارادہ سے اس کی پیروی کرنا ثابت قدمی سے کام کئے جانا جب تک مراد حاصل نہ ہو جائے۔ یہ ارادہ کر لینا ہے کہ کسی کی بدخواہی نہیں کرنی ہے۔ نہ کسی کو رنج پہنچانا ہے۔

(۳) کلام صحیح۔ جھوٹ نہ بولنا کسی کی بدگوئی نہ کرنا۔ نہ درشت کلامی کرنا۔ نہ احمقانہ یادہ گوئی کرنا بدھ نے اپنے شاگردوں سے کہا تھا کہ جب تم مل کر بیٹھو تو دو چیزیں تمہارے لئے مناسب حال ہیں (سبق آموز گفتگو یا متبرک خاموشی)

(۴) اعمال صحیح۔ ایسے کام کرنا جن میں انسان یا حیوان ہلاک نہ ہوں۔ نہ ایسی شے لینا جو تمہیں بخوشی نہیں دی گئی اور ناپاک افعال سے احتراز کرنا۔

(۵) معاش صحیح۔ ایسا پیشہ یا کام اختیار نہ کرنا جس سے اوروں کو دکھ پہنچے۔ مثلاً ذبح کرنا۔ شکار کھیلنا۔ مسکرات کا بیچنا۔ بردہ فروشی وغیرہ۔

(مسلک کے اس حصہ سے پایا جاتا ہے کہ یہ ہدایت سنگھا یعنی بھکوؤں کی جماعت ہی کے لئے مخصوص نہ تھی جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے۔ بلکہ سب انسانوں کے لئے ہے کیونکہ سنگھا خاص قواعد کے مطابق دنیوی کاموں اور پیشوں کے اختیار کرنے سے منع کئے گئے ہیں)

(۶) سعیٔ صحیح۔ اس سے مراد ہے کہ برے خیال اور بری خواہشیں دل میں نہ آنے دینا اور اگر برے خیال اور بری خواہشیں پیدا ہو گئی ہیں تو ان کو دور کرنا۔ نیک خیالوں اور نیک خواہشوں کو جو پیدا نہیں ہوئی ہیں جگانا موجودہ نیک خیالوں اور نیک خواہشوں کو قائم رکھنا اور ان کو ترقی دینا۔ انسان کو چاہئے صالح خیال اور خواہشیں پیدا کرے۔ خواہشوں کی دکھ دائی ماہیت پر غور کرے یا ان کے اجزا کو الگ الگ کر کے تحلیل کرے۔ یعنی ان کی ترکیب ایسی توڑ دے کہ وہ اپنے عنصروں میں واپس چلی جائیں یا اپنی قوت اور ہمت سے ان کو مغلوب کرے۔ پھر ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح مضر خیالات اور خواہشیں پراگندہ ہو کر خود ہی معدوم ہو جاتی ہیں اور انسان کا دل سکون اور امان پاتا ہے

(۷) فکر صحیح۔ جسم۔ حسیات۔ خیالات اور اشیا کی حقیقت پر عموماً غور و فکر کرنا۔ ان چیزوں پر کامل غور کرنے سے یہ ادراک ہو جاتا ہے کہ ان کا آغاز اور انجام سلسلۂ اسباب پر اور قوانین کے مطابق ہے۔ نیز یہ کہ وہ عارضی ہیں اور کوئی شے نہیں جس کی نسبت کہا جاسکے کہ "یہ میری ہے۔ یہ میں ہوں"۔ بدھوں کے ہاں دعاؤں کے بجائے بچار ہے۔ کیونکہ کسی بالائی ہستی کے وہ قائل نہیں جو امداد کر سکے یا نقصان پہنچا سکے پس کسی ہستی سے وہ دعا نہیں کر سکتے۔

۸ توجہ صحیح۔ من کو استھر کر کے اپنے باطن کا امتحان کرنا ہے۔ اکثر اوقات اس طریق سے ایک حالت وجد پیدا ہو جاتی ہے اور ایسی حالت سے بقول بعض اوکلٹ (occult) یا مافوق الفطرت طاقتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن منزل مراد

یعنی نبھان کے حصول کے لئے ان طاقتوں کی حاجت نہیں۔ وہ محض انجام تک پہنچنے کے ذریعے ہیں اور بُدھ نے خود کہا ہے کہ منزلِ مراد کو پہنچنے کے لئے نہ ان کی ضرورت ہے نہ وہ کافی ہیں۔

پانچ پرن ۔ بُدھ مت میں داخل ہونے کے واسطے پانچ اقرار کرنے پڑتے ہیں جنہیں پنچ سیلہ کہتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔ پرن بمعنی اقرار ہے۔

(۱) میں پرن کرتا ہوں کہ میں کسی جاندار کو نہ ماروں گا (نہ انسان نہ حیوان کو)

(۲) میں پرن کرتا ہوں کہ میں کوئی شے نہ لوں گا جو مجھے بخوشی نہ دی گئی ہو۔ (اس لئے سرقہ ہی منع نہیں بلکہ کسی حکمت سے کچھ حاصل کرنا مثلاً زیادہ سود لینا یا فریب سے کچھ حاصل کرنا بھی منع ہے)

(۳) میں پرن کرتا ہوں کہ ناجائز حظِ نفس سے اجتناب کروں گا۔

(۴) میں پرن کرتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں گا (جس میں کسی پر تہمت لگانا شامل ہے۔ تہمت سے الفاظ ذیل میں منع کیا گیا ہے:"تاکہ انسانوں میں نفاق پیدا نہ ہو۔ وہاں کا سنا یہاں دُہرانا نہ چاہئے اور یہاں کا سنا وہاں دہرانا نہ چاہئے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ایسے الفاظ منہ سے نکالے جن سے اتفاق بڑھے: تاکہ وہ اس کا لطف اٹھائے")

(۵) میں پرن کرتا ہوں کہ نشہ آور چیزوں سے احتراز کروں گا۔

بُدھی کلمہ ۔ بدھ مت میں ایک کلمہ پوجا کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ اس کو تین بنا ہیں کہتے ہیں وہ یہ ہے:۔

بدہم شرنم گچھیامی = آتا ہوں میں بُدھ کے قدموں میں۔
دھرمم شرنم گچھیامی = آتا ہوں میں دھرم کے قدموں میں۔
سنگھم شرنم گچھیامی = آتا ہوں میں سنگت کے قدموں میں۔

گویا اصولِ ایمان کا یہ خلاصہ ہے کہ بُدھ دھرم والاعقلِ سلیم (بُدھ) دھرم (فرائض) سنگھم (انسانی برادری) کا قائل ہو۔

بُدھ کے مجسمے ۔ واضح ہو کہ بدھ نے اپنے مجسمے بت یا اور کسی قسم کے اشکال و تصاویر بنانا منع کر دیا تھا۔ تین سو سال تک اس کا کوئی بت نہ بنا۔ لیکن آخر جذباتِ انسانی کو کون روک سکتا ہے۔ اس کی ذاتِ بابرکات کی صفات نے دلوں کو اتنا تسخیر کر لیا تھا کہ لاکھوں بت بن گئے۔ ثنا خوانی اور مدح کی انتہا نہیں رہی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ محبوب انسان کروڑوں دلوں پر تسلط رکھتا ہے۔ یورپین اور امریکن بھی اس کے گرویدہ ہوتے جاتے ہیں۔ مگر زاد بوم میں وہی مثل ہے۔ گھر کے جوگی جوگنے باہر کے جوگی سدھ

شمیم

اصلاح

تجھے گماں ہے کہ ہے رات کی جبیں تاریک
مجھے یقیں ہے کہ یہ بھی ہے موجِ گردشِ رنگ

تجھے یہ وہم کہ ہے موت زندگی کا مآل
مجھے یہ علم کہ باطل نہیں زمانہ تنگ

تری نگاہ میں ہستی، رہینِ کیفِ سکوں
مرے خیال میں گیتی محیطِ شورشِ جنگ

تجھے بایں ہمہ دانش غمِ زمانہ ہے تلخ
مجھے بایں ہمہ کاوش سرورِ بادۂ رنگ

تجھے خیال کہ قصرِ طرب ہے نقش برآب
مجھے یقیں کہ صنم آفریں ہے ریزۂ سنگ

تجھے فسانۂ باطل حدیثِ سوز و گداز
مجھے پیامِ حقیقت صدائے بربط و چنگ

سکونِ قلب تری سعیِ ناتمام کی حد
نشاطِ روح مری ہمتِ بلند کو ننگ

چلا ہے تو کہ ہے دنیا مقامِ حزن و ملال
بڑھا ہوں میں کہ تجھے دوں پیامِ رامش و رنگ

ترا وہ قلب کہ آسودۂ فریبِ جمال
مری وہ روح کہ بیگانۂ حجاب و درنگ

وہ موجِ لو کہ ہے جس پر گراں روانیِ سیر
وہ صید میں کہ جسے خود ہی آرزوئے خدنگ

فسردگی سی ہے ظلمت فروشِ تیرِ خیال
شگفتگی سے ضیا آفریں ہے میری امنگ

پھر اُس پہ دعوئ نقد و نظر خدا کی پناہ
کہاں جمالِ حقیقت کہاں ضمیرِ گناہ

علی اختر
(حیدرآباد دکن)

عدنان

عدنان اُسی دن نیلوفر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جب وہ پہلے پہل خادمہ کی حیثیت سے کلب گھر میں داخل ہوئی تھی۔ نیلوفر نے اُس سے پیچھا چھڑانے کی ہزار کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ وہ اُسے کام کے بہانے سے اپنی میز کے پاس بلا لیا کرتا تھا اور مشکل یہ تھی کہ نیلوفر فرمانبرداری کے متعلق بڑی خادمہ کی سخت ہدایات سے روگرداں ہونے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ بڑی خادمہ جس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی ایک پاؤں سے ذرا سا لنگڑاتی تھی۔ وہ نہایت ہوشیار اور جہاں دیدہ عورت تھی اور اگرچہ چھوٹی لڑکیوں سے بہت شفقت کرتی تھی لیکن جب نیلوفر نے اُس سے عدنان کے طرزِ عمل کا ذکر کیا اور بتایا کہ میں اس وجہ سے اُس کی میزبانی کے فرائض انجام دینے سے قاصر ہوں تو اس عورت نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ "میری بچی تم بہت نادان ہو" اور اس کی شکایت رفع کرنے کا کچھ انتظام نہ کیا۔

پرتکلف کھانوں کی فرمائشوں کے ساتھ ہی ساتھ عدنان نیلوفر پر اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا کرتا اور کہتا "کاش تم میری خادمہ ہونے کے بجائے ایک ہی میز پر نفیس کھانوں کی فرمائشوں میں میری شریک بن جاؤ"۔

نیلوفر زیرِ لب کہتی "زبان سنبھال کر بات کرو" اور پھر بلند آواز سے پوچھتی "ماہی پلاؤ یا نرگسی آفندی؟"

"نرگسی! اور نیلوفر مجھے تم سے محبت ہے۔ گاؤں میں میرا ننھا سا مکان تمہارا انتظار کر رہا ہے"۔

"میرا انتظار کرتے کرتے اُس کے کھنڈر زمین پر آ رہیں گے" (پھر باآوازِ بلند) "مسلّم مرغ یا تیتر آفندی"؟

"تیتر! اور ہاں ننھی سی گڑیا مجھے کبھی کسی سے اتنی محبت نہیں ہوئی اور مجھے کبھی کسی سے اتنی محبت نہ ہو گی نیلوفر کیا تم میری بات نہیں سمجھ سکتیں ......" بات ختم ہونے سے پہلے نیلوفر اُس کی فرمائش کی تعمیل کے لئے بھاگ کر سنی ان سُنی ایک کر جاتی تھی۔

دو مرتبہ نیلوفر ملازمت سے کنارہ کش ہوئی لیکن دونوں مرتبہ وہ پھر بلا لی گئی اور از بس کہ اُس کا باپ بیمار محتاج اور از کار رفتہ تھا وہ مجبوراً دوبارہ اپنی جگہ پر واپس چلی جاتی۔ کام کی اجرت سے وہ اپنے دو کمروں کا کرایہ ادا کرتی اور انعامات کی رقم سے اُن کے کھانے کا خرچ چلتا۔ انعام دینے میں عدنان سب سے زیادہ فراخ دل تھا۔ کبھی کبھی نیلوفر اپنے خیالات میں کھو جاتی اور سوچتی کہ اگر میں عدنان کی بات مان لوں تو اُس کی دولت سے میرے باپ کو کس قدر راحت ملے۔ اس خیال سے کئی دفعہ وہ اُس مکان کو بھی تصور میں دیکھتی جو عدنان نے

گاؤں میں سیب کے درختوں کے جھنڈ کے درمیان بنا رکھا تھا پھر وہ تھا بھی ایک خوش مزاج اور پسندیدہ خصلت آدمی اور ایک دن جب ناشپاتی کے پنیر لے رائتہ اور عرقِ نعناع کی فرمائش کے دوران میں اُس نے کہا "نیلو فر اگر تم ایک ہی دفعہ اپنے محبوب قدموں سے میرے سیاہ خانے کی آبرو بڑھا سکو تو میں تمہیں ہزار طوالزندر دوں ...."
اُس دن وہ ایک لمحہ کے لئے ہچکچائی اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تامل کے اس وقفہ میں اس نے عدنان کی آنکھوں کے درمیان کی گہری شکنیں اُس کی خمدار ٹھوڑی اُس کے ہموار دانت اور اس کی وہ نگاہیں جو فتح مندی کے خیال سے قبل از وقت چمک اٹھی تھیں دیکھیں۔ پھر عدنان نے اُس سے پوچھا تم یہاں سے کس وقت فارغ ہو جاتی ہو لیکن نیلو فر نے ترش روئی سے جواب دیا "میں آپ کے فراغت پانے سے پہلے فارغ ہو جاؤں گی"۔ اس پر وہ افسردہ و رنجیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نیلو فر اس وقت میز کے سرے پر خالی برتنوں کے ایک تشت کو سہارا دئے کھڑی تھی۔ دفعۃً وہ یہ کہتے ہوئے الگ ہٹ گئی کہ "اب کبھی کلب گھر والے مجھے نہ بلائیں گے"۔ اور برتن تمام زمین پر گر کر پاش پاش ہو گئے۔

باپ کے مرنے پر نیلو فر نے ایک محرر سے شادی کر لی اور تیس سال سے زائد مدت تنگی ترشی میں کاٹی۔ اس کا شوہر کبھی بردبار ہو جاتا کبھی چڑچڑا، وہ کبھی صابر ہو جاتی کبھی شاکی، اور ان کے دو بچے کبھی فرشتے بن جاتے کبھی شیطان۔ زندگی کے دن کسی ایسی بات کے لئے تیاری اور مصروفیت میں گزر رہے تھے جو ہمیشہ ان بوجھی کی ان بوجھی ہی رہی۔ نیلو فر جانتی تھی کہ اس کی چار دیواری کے باہر عظیم الشان اجتماعات ہیں، بڑے بڑے حادثات ہیں، سورج چاند اور ستارے ہیں لیکن وہ اپنے بچوں اور اپنے شوہر کی ضروریات کے خیالوں میں ایسی کھوئی سی رہتی تھی کہ ان چیزوں سے اُسے اپنا کوئی سروکار معلوم نہ ہوتا تھا۔ اُس کے لئے آئے دن ایک ہی جھگڑا، نت وہی ٹنٹا تھا۔

نیلو فر پچاس برس کی عمر میں بھی حسین تھی اُن دنوں اسے اپنے ڈاکٹر سے معلوم ہوا کہ ہفتاد سالہ امیر عدنان قریب کے ایک بڑے شفاخانے میں مقیم ہے۔ وہ شریف اور رقیق القلب تھی اس کے علاوہ اس کی زندگی کا بلانہ بے لطفی میں بسر ہو رہی تھی۔ اس لئے تنہائی میں کئی دن کی سوچ بچار کے بعد ایک دن وہ چپکے سے ہسپتال میں چلی گئی جہاں پہنچتے ہی اُس نے عدنان سے ملاقات کی درخواست کی۔

وہ غسل کا بادامی لبادہ پہنے ہوئے، ایک دریچے کے قریب مطالعہ میں مصروف بیٹھا ہوا خوش و خرم اور علیل معلوم ہو رہا تھا۔ نیلو فر نے اُس کی آنکھوں کے درمیان گہری شکنیں، اس کی خمدار ٹھوڑی اور اس کی نگاہیں جن میں فتح مندی کی وہی غیر فانی چمک نظر آ رہی تھی، دیکھیں۔ شگفتہ رو پری چہرہ عورت اس کے قریب بیٹھ گئی اور بولی آفندی میں آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں ہمیشہ آپ کو احسان مندی سے یاد کرتی رہی ہوں کیونکہ آپ

کے انعامات کے صدقے میں میرے مرحوم باپ کو بہت آرام پہنچا تھا۔ میں وہی نیلوفر ہوں جو شہر کے کلب گھر میں آپ کی خدمت گار تھی"۔ شاید آپ کو یاد نہ ہو . . . . "

اُس کا چہرہ چمک اٹھا اور وہ نیلوفر کا ہاتھ تھام کر بولا "ہاں مجھے خوب یاد ہے اور تم اب بھی حسین ہو"۔

نیلوفر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر آپ کی یہ مدد شریکِ حال نہ ہوتی تو میرا مرحوم باپ کئی ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم رہ جاتا"۔

وہ اپنا ہاتھ اٹھا کر بولا "لیکن مجھے سچ بتاؤ کیا تمہارے دل میں کبھی میرا خیال بھی آیا ہے ؟"

"ہاں! اور ہمیشہ منت گزاری کے ساتھ"

پھر وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا "کیا وہ دن بھی تمہیں یاد ہے جب سہ پہر کے وقت ہم ایک پرانے باغ میں پھرتے رہے تھے اور پھر ایک سایہ دار درخت کے نیچے ہری ہری دوب کے فرش پر بیٹھ کر میں نے تمہیں اپنے مہمل سوالوں سے گھبرا دیا تھا . . . . ؟"

نیلوفر نے حیران ہو کر اُس کے چہرے پر مستفسرانہ نگاہیں ڈالیں۔ عدنان کی آنکھوں میں اُس وقت دیوانوں کی سی چمک نظر آتی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی دُور، بہت دُور کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ پھر وہ آہ بھر کر کہنے لگا "میں کبھی وہ دن نہیں بھولا"

نیلوفر گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "آفندی میں نیلوفر ہوں، شہر کے کلب گھر والی آپ کی پرانی خادمہ"۔

عدنان نے ملاطفت سے کہا "ہاں تم نیلوفر ہی ہو۔ کیا تمہیں یہ شک ہے کہ مجھے یاد نہیں ؟"

(بہ تصرف از زونا گیل)

حامد علی خاں

---

(۱)

سرخ گلاب ہیجانی کیفیات کا پتہ دیتا ہے، اور سفید پاک محبت کی نشانی ہے۔ گویا احمریں گلاب بمنزلہ شاہباز کے ہے اور بلوریں قمری کی مانند ہے۔

(۲)

اے دلنواز، میں تجھ کو ایک بلوریں کلی بھیجتا ہوں جس کی پتیوں کے سر پر گلابی تاج ہے کیونکہ پاک اور بے لوث محبت کے لبوں پر ہمیشہ بوسۂ آرزو کا نشان ہوتا ہے۔

احمد الدین مارہروی

رُخصت!

بہے چلی جا، سرد اور شیریں پانی کی ندی! بے پایاں، نیلے سمندر کی سمت۔ دامن میں اپنی نوخیز موجوں کا نذرانہ لئے ہوئے ——— بہے چلی جا۔

آہ میرے پُرشوق قدم آج تیرے کنارے کی محبوب ریت پر اپنا آخری نقش چھوڑتے ہیں۔

بہے چلی جا ——— اسی پرسکون رفتار سے، دھیمے، دھیمے ——— مرغزار اور سبز مخملیں خطوں میں سے ہوتی ہوئی۔

جب زمانہ تجھے ——— اے ننھی سی ندی! ایک پُرشور دریا میں تبدیل کر ڈالے۔

کہیں بھی تیری ریت پر پھر ان تھکے ہوئے قدموں کا نشان نظر نہ آئے گا۔ لیکن بید مجنوں کا درخت سائیں، سائیں کرتے ہوئے جھونکوں کے درمیان یونہی رک رک کر آہیں بھرتا رہے گا اور اس کی کانپتی ہوئی شاخیں یونہی تجھ پر جھکی رہیں گی۔

اور نازک پروں والی شہد کی مکھی ہر موسم بہار میں اسی طرح تیرے آر پار بھنبھناتی ہوئی اڑتی پھرے گی۔

ہاں ہمیشہ یہ سب یونہی رہے گا۔

سالہا سال سورج کی جھلملاتی ہوئی کرنیں تیری سطح پر یونہی آکر تیریں گی اور سالہا سال چاند کا نورانی عکس تیرے سیمیں پانیوں کے اندر لرزتا رہے گا۔

لیکن یہ قدم آج ہمیشہ کے لئے تجھ سے رخصت ہوتے ہیں۔

آہ رخصت ——— ہمیشہ کے لئے۔

(ترجمہ)

"زیب"

اصلاحِ ادب

(۲)

بہ سلسلۂ اشاعتِ مارچ

نثر

فقرہ۔ احسن صاحب بمع جناب انور کے مشاعرے میں گئے تھے۔

اصلاح۔ احسن صاحب مع جنابِ انور (بہ سکونِ عین وکسرۂ باء) کے مشاعرے میں گئے تھے۔

یا

احسن صاحب مع جنابِ انور (بہ کسرۂ عین و باء) مشاعرے میں گئے تھے۔

وجہ۔ "بمع" میں "ب" زائد ہے۔

فقرہ۔ اغلباً یہ ڈراما آپ کا شاہکار ہے۔

اصلاح۔ غالباً یہ ڈراما آپ کا شاہکار ہے۔

وجہ۔ عربی میں "افضل التفضیل" پر تنوین نہیں آتی۔ اسی طرح "اوسطاً" بھی غلط ہے۔

فقرہ۔ ہندوستان کے اصلی باشندے جنگلوں میں رہائش رکھتے ہیں۔

اصلاح۔ ہندوستان کے اصلی باشندے جنگلوں میں بود و باش رکھتے ہیں۔

یا

ہندوستان کے اصلی باشندے جنگلوں میں رہتے ہیں۔

وجہ۔ اردو مصدر "رہنا" سے فارسی قاعدے کے مطابق "رہائش" حاصل مصدر بنا لینا صحیح نہیں۔

فقرہ۔ اس خاطر و مدارات کے لئے مشکور ہوں۔

اصلاح۔ اس خاطر مدارات کے لئے ممنون ہوں۔

وجہ۔ "خاطر" تواضع کے معنی میں ہندی ہے اور "مدارات" عربی لہذا واوِ عطف جائز نہیں۔

(۲) "مشکور" "پسندیدہ" کے معنی میں صحیح لیکن "ممنون" کے معنی میں غلط ہے۔

فقرہ۔ چُپ کرو کیا چیخ و پکار لگا رکھی ہے؟

اصلاح۔ چُپ رہو۔ کیا چیخ پکار لگا رکھی ہے؟

وجہ۔ (۱) "چُپ کرنا" "خاموش ہونا" کے معنی میں پنجابی ہے۔ لیکن اردو میں "خاموش کرانا" کے معنی میں مستعمل ہے۔ (۲) "چیخ" اور "پکار" دونوں ہندی ہیں۔ اس لئے واوِ عطف غلط ہے۔

فقرہ۔ اُف۔ آپ نے یہ کیسی سنسنی خیز خبر سنائی۔

اصلاح۔ اُف۔ آپ نے یہ کیسی سنسنی پیدا کر دینے والی خبر سنائی۔

وجہ۔ "سنسنی" ہندی ہے اور "خیز" فارسی۔ اس لئے ترکیب غلط ہے۔ اس کی جگہ کپکپا دینے والی" یا "لرزہ خیز" بھی مناسب موقع لکھ سکتے ہیں۔

فقرہ۔ آپ کو اسے زدوکوب کرنے کا مجاز نہیں۔

اصلاح۔ آپ اسے زدوکوب کرنے کے مجاز نہیں۔

وجہ۔ "مجاز" اختیار کے معنی میں غلط ہے

فقرہ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتفاق و یگانگت سے رہنا چاہئیے۔

اصلاح۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتفاق و یگانگی سے رہنا چاہئیے۔

وجہ۔ "یگانہ" فارسی ہے۔ اس لئے عربی کے قاعدے سے اس کا حاصل مصدر بنانا غلط ہے۔

فقرہ۔ رفیق بیچارہ کئی سالوں سے بیمار ہے

اصلاح۔ رفیق بیچارہ کئی سال سے بیمار ہے

یا

رفیق بیچارہ برسوں سے بیمار ہے

وجہ۔ "سال" کی جمع "سالوں" سے ذم کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

فقرہ۔ میں جناب کے گرامی نامے کے مطالعے کے دوران میں کئی بار ہنسا۔

اصلاح۔ میں جناب کا گرامی نامہ پڑھتے پڑھتے کئی بار ہنسا

وجہ۔ توالیِ اضافات (کے کے کے) سے اہل زبان بیں مکروہ ہے۔

فقرہ۔ آپ کی غزل کے دو اشعار مجھے بہت پسند آئے۔

اصلاح۔ آپ کی غزل کے دو شعر مجھے بہت پسند آئے۔

وجہ۔ "اشعار" دو سے زیادہ کے لئے لکھنا چاہئیے۔ اسی طرح "دو احباب"۔ "دو آرا"۔ "دو شعرا" "دو وزرا" وغیرہ بھی صحیح نہیں۔

فقرہ۔ نہ تو آپ جلسے میں خود تشریف لائے اور نہ ہی اپنی نظم ارسال فرمائی

اصلاح۔ نہ تو آپ جلسے میں خود تشریف لائے اور نہ اپنی نظم ہی ارسال فرمائی۔

وجہ۔ "نہ ہی" لکھنا صحیح نہیں۔

فقرہ۔ وہ سطحِ سمندر پر دو تیرتی ہوئی لاشیں دیکھ کر ڈر گیا۔

اصلاح۔ وہ سمندر کی سطح پر دو تیرتی ہوئی لاشیں دیکھ کر ڈر گیا۔

یا

وہ سطحِ بحر پر دو تیرتی ہوئی لاشیں دیکھ کر ڈر گیا۔

وجہ۔ "سطح" عربی ہے اور "سمندر" ہندی۔ اس لئے اضافت غلط ہے۔ اسی طرح "عرصۂ دراز" "عالمِ سنسان" "آغوشِ مچھر" "مینارِ بلند" وغیرہ سب ترکیبیں غلط ہیں

فقرہ۔ اس تازی مٹھائی کے تین جدے جدے حصے کر دو۔

اصلاح۔ اس تازہ مٹھائی کے تین جدا جدا حصے کر دو۔

وجہ۔ "تازہ" کی "ہ" اور "جدا" کا الف کسی صورت میں بدلے نہیں جا سکتے۔

فقرہ۔ آپ تاہنوز یہیں ہیں؟

اصلاح۔ آپ ہنوز یہیں ہیں؟

یا

آپ ابھی یہیں ہیں؟

وجہ۔ "تاہنوز" میں "تا" زائد ہے۔

فقرہ۔ دہلی میں متعدد عالی شان عمارتوں کے کھنڈرات زبانِ حال سے جلیل القدر مسلمان بادشاہوں کی عظمتِ رفتہ کے افسانے سنا رہے ہیں

اصلاح۔ دہلی میں متعدد عالی شان عمارتوں کے کھنڈر زبانِ حال سے جلیل القدر مسلمان بادشاہوں کی عظمتِ رفتہ کے افسانے سنا رہے ہیں۔

وجہ۔ "کھنڈر" ہندی ہے۔ اس لئے عربی قاعدے سے اس کی جمع بنانا غلط ہے۔

نظم

شعر۔ لاش پر میری پیامی کامیاب آیا تو کیا
بعد میرے میرے نامے کا جواب آیا تو کیا

اصلاح۔ میری میت پر جو قاصد کامیاب آیا تو کیا
بعد میرے آہ اگر خط کا جواب آیا تو کیا

وجہ۔ "لاش" نہایت مکروہ لفظ ہے۔ "پیامی" بھی اچھا نہیں۔ مصرعِ دوم میں دوسرا "میرے" حشو ہے

شعر۔ پھر یہ فوجِ قہر موج اک حشر برپا کر گئی
برقِ طوفاں تھی۔ جدھر چمکی صفایا کر گئی

اصلاح۔ پھر یہ فوجِ قہر موج اک حشر برپا کر گئی
برقِ خائف تھی کہ گری جس جگہ صفایا کر گئی

وجہ۔ برق چمک کر نہیں بلکہ گر کر صفایا کرتی ہے۔

شعر۔ دکھانا دل میں رہ کر دل کو شانِ دلنوازی بھی
کہ گھر دل میں مرے لے درد عشقِ یار کر لینا

اصلاح۔ دکھانا دل میں رہ کر دل کو شانِ دلنوازی بھی
ہمارے دل میں گھر اے دردِ عشقِ یار کر لینا

وجہ۔ دوسرے مصرع میں "کہ" حشو ہے۔

شعر۔ خدا مجھ کو تجھ سے ہی محروم کر دے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں۔

اصلاح۔ تجھی سے خدا مجھ کو محروم کر دے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں

وجہ (۱) "تجھ سے ہی" غلط اور "تجھی سے" صحیح ہے (۲) "تجھی سے" کو شروع میں لانے سے اس پر زور آ گیا۔ جو شاعر کا اصل مقصد ہے۔

شعر۔ بہ خونِ گشتہ تمناؤں کی اک روز چمکے گی
بسانِ غازۂ استقبال کے رخسارِ روشن پر

اصلاح۔ بہ خونِ کشتہ تمناؤں کی اک روز چمکے گی
برنگِ غازہ استقبال کے رخسارِ روشن پر

وجہ۔ "بسانِ غازہ" سے "برنگِ غازہ" کہیں بہتر ہے جس سے سارا شعر چمک اٹھا۔

شعر۔ پھر گردشِ افلاک سے آزاد رہے گی۔

دنیا ترے کوچے میں گر آباد رہے گی

اصلاح۔ پھر گردشِ افلاک سے آزاد رہے گی
دنیا ترے کوچے میں جو آباد رہے گی

وجہ۔ "گر" بجائے "اگر" بالاتفاق متروک اور "آباد" کا الف تقطیع میں گرتا ہے۔

شعر۔ کیا کریں جا کے مدینے سے کہیں اب...
کون اب روضۂ سلطانِ عرب سے اٹھے

اصلاح۔ کیا کریں جا کے مدینے سے کہیں اے...
کون اب روضۂ سلطانِ عرب سے اٹھے

وجہ۔ پہلے مصرع میں "اب" حشو ہے۔

شعر۔ کس طرح ہم کو ہو پتہ کس طرف آپ کا ہے رُخ
ایک ہی نورِ حسن ہے حلقۂ شش جہات میں

اصلاح۔ ہم کو پتہ ہو کس طرح کس طرف آپ کا ہے رخ
ایک ہی نورِ حسن ہے حلقۂ شش جہات میں

وجہ۔ "طرح" کی "ح" تقطیع میں گرتی ہے۔

شعر۔ کھل گئے عیب و ہنر سب کاتبِ تقدیر کے
رنگ میں آمادۂ پرواز ہر تصویر کے

اصلاح۔ کھل گئے عیب و ہنر صورت گرِ تقدیر کے
رنگ ہیں آمادۂ پرواز ہر تصویر کے

وجہ (۱) پہلے مصرع میں "سب" حشو ہے
(۲) "کاتب" مصور نہیں ہوتا۔

شعر۔ تم ماہ نیم ماہ اگر ہو تو کیا ہوا
میں بھی تو آفتاب لبِ بام ہو گیا

اصلاح۔ تم بڑھ کے حسن میں جو ہوئے مہرِ نیم روز
میں گھٹ کے آفتابِ لبِ بام ہو گیا

وجہ۔ بڑھنے اور گھٹنے سے معشوق کے خورشید حسن اور عاشق کے آفتابِ لبِ بام ہونے کا پورا پورا ثبوت مل جانے کے علاوہ تقابل کے حسن نے شعر کو چار چاند لگا دئے۔

شعر۔ اس رنگ سے ہو کفر پرستی تو خوب ہے
زنار ڈالئے ترے پھولوں کے ہار کا

اصلاح۔ اس رنگ سے ہو کفر پرستی تو گل کھلیں
زنار ہاتھ آئے کسی گل کے ہار کا

وجہ (۱) شاعر کو جو مضمون سوجھا تھا وہ خوبی سے بندھ نہ سکا (۲) "ترے" میں تخصیص ہے اور کسی میں تعیم۔ اور ایسے موقع پر "تعمیم" "تخصیص" سے کہیں پُرلطف ہوتی ہے۔

شعر۔ ہو رہا ہے نئے انداز سے زنداں تعمیر
چُن کے دیوانے چنے جاتے ہیں دیواروں میں

غلطی۔ "چن کے" صحیح نہیں "چُن چُن کے" محاورہ ہے۔

نشتر جالندھری

غزل

جب تک نہ پھر آؤ گے یہی یاد رہے گی — نالہ ہی ہو گا یہی فریاد رہے گی

بتلاؤ کبھی ہو گی عنایت کی نظر بھی — یا ہم پہ ہمیشہ یہی بیداد رہے گی

دل دینے میں مجبور ہی کچھ ہو گئے ورنہ — معلوم تو تھا زندگی برباد رہے گی

جب بیٹھ گئے آن کے غم بھول گئے ہم
سیفی یہ تری زندہ دلی یاد رہے گی

سیفی نوگانوی

غزل

پھر امتحاں ہے دیدۂ حیرت پناہ کا — پھر قصد کر رہا ہوں تری جلوہ گاہ کا

پیغام مرگ تھا دلِ حرماں نصیب کو — ملنا وہ اور مل کے پلٹنا نگاہ کا

کہتی ہیں صاف اُن کی پشیماں نگاہیاں — احساس ہو گیا مرے حالِ تباہ کا

طغیانیاں ہیں اشکِ ندامت میں دیکھنا — اُچھلے گا ڈوب کر نہ سفینہ گناہ کا

صدقہ نگاہِ مست کا ساقی وہ مے پلا — احساس بھی رہے نہ ثواب و گناہ کا

پھر جانوں تم کو دعوئ تمکین و ہوش ہو
کیفی جو حسن دیکھو تم اُس رشکِ ماہ کا

محمد علی کیفی

خانم

اللہ جمیل ویحب الجمال

مندرجۂ بالا عنوان کے معنی ہوئے کہ خداوند تعالیٰ خود خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ یہ تو ہوئے اس کے معنی اور اب لگے ہاتھوں میں تفسیر بھی کئے دیتا ہوں ع

(۱)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اتوار کے دن صبح لڑکے ٹہلنے کی نیت سے گھر سے نکلا۔ پھر سوچا کہ کون دیکھتا ہے ذرا خاں صاحب کے ہاں ہو آئیں۔ میں نے احمد کو پکارا " ادبے" میں نے کچھ دھمکاتے ہوئے کہا " دیکھتا ہے بے ہم ذرا . . . وہ ہم ذرا . . . ذرا خاں صاحب کے یہاں جا رہے ہیں . . . . . . یاد رکھنا چمڑی ادھیڑ دوں گا جو کہیں . . . . "

احمد نے معنی خیز طور پر سر ہلا کر کہا "بہت اچھا سرکار" اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ خانم پوچھے گی تو یہی کہہ دے گا کہ کھیتوں کھیت ٹہلنے گئے ہیں۔ خاں صاحب کے یہاں نہیں گئے ہیں۔ واللہ اعلم یہ بیویاں مردوں کے عزیز یں دوستوں کے کیوں اس قدر خلاف ہوتی ہیں کہ معلوم بھی ہو جائے کہ ملنے گئے ہیں تو نہ سہی تھوڑی بہت نتھنوں کے ذریعہ سے گرم گرم سانسیں ہی چھوڑیں گی۔

قصہ مختصر کہ میں خاں صاحب کے یہاں پہنچا چوکی پر بیٹھے خضاب دھونے کے لئے ڈھاٹا کھول رہے تھے مجھ دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔ کس محبت سے انہوں نے کہا ہے " آؤ یار مرزا " میں بیٹھ گیا۔ جلدی جلدی انہوں نے منہ دھویا تولئے سے منہ خشک کیا۔ لڑکے کو اپنے گالی دے کر شطرنج لانے کو کہا اور پھر تیل لگا کر اپنی ڈاڑھی کو چڑھانے بیٹھ گئے۔ ڈاڑھی کے بال دراصل کان تک پہنچ سکتے تھے اور وہ ارادہ کر رہے تھے کہ سر سے ہاتھ بھر اونچے پہنچا دوں۔

ڈاڑھی چڑھانے میں انہوں نے میرے سامنے تجویز پیش کی کہنے لگے کہ پانچ پانچ روپیہ چندہ ہو دریا کنارے چل کر مچھلیاں پکڑیں اور حلوہ پوری رہے "

میری باچھیں اس تجویز پر کھل گئیں۔ میں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان کی جدت کی داد دی اور اس پُر لطف تحریک کو بے حد پسند کیا۔ ذرا غور کیجئے گا کہ پسند کیسے نہ کرتا۔ دریا کنارے فرش بچھا ہوا ہے۔ حقہ لگا ہوا ہے۔

ہنسیاں پڑی ہوئی ہیں اور شطرنج ہو رہی ہے۔ قصہ مختصر میں نے ان کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے لفظ "مگر" کا استعمال کر کے وعدہ کیا کہ کل تک ہم اس کا جواب دے سکیں گے کہ ہم شرکت کر سکیں گے بھی یا نہیں۔

خاں صاحب تجربہ کار آدمی "کیوں" اور "کیا" سے دو تین جرح کے جو انہوں نے سوال کئے تو تاڑ گئے۔ پھر آخر رازدار میرے ٹھہرے سب جانتے تھے کہنے لگے کہ تمہاری "گھر میں" یوں ٹھیک نہ ہوں گی۔ ہم بتائیں ترکیب؟

میں خوش ہو گیا کہ یہ ماہر نسائیات اب مجھے کوئی نسخہ بتاتا ہے۔ چنانچہ میں نے خوش ہو کر کہا۔ "وہ کیا؟"

خاں صاحب نے اپنی انگلی ٹیڑھی کر کے اُس کا ہُک بنایا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ "مرزا صاحب۔ میں تو کہہ چکا کہ یہ گھی سیدھی اُنگلی نہیں نکلے گا یہ تو اب ایسے نکلے گا" یہ کہہ کر انگلی کا ہک میری آنکھوں کے سامنے نچایا۔

"لاحول ولاقوۃ" میں نے کہا "کوئی ترکیب تو آپ بتاتے نہیں ہیں یہ تو پچاس دفعہ سُن چکے"

ایک دم سے سنجیدہ ہو کر خاں صاحب نے کہا "سن لو میاں کان کھول کر۔ یہ بیوی ہے بیوی۔ یوں ٹھیک نہ ہوگی۔ اگر قابو میں کرنا چاہتے ہو تو میری بتائی ترکیب پر کل ہی سے چلنا شروع . . . بلکہ آج ہی سے عمل کرنا شروع کر دو۔ اگر نہ ٹھیک ہو جائیں تو میرا ذمہ"۔

میں نے گردن کو جنبش دیتے ہوئے مایوسانہ لہجہ میں جواب دیا "ہو چکیں"۔

خاں صاحب نے شرط کے لئے ہتھیلی پھیلا کر کہا "اور روپیہ جیتو آنہ ہارو"

میں نے مُسکرا کر کہا "واللہ مذاق گیا چولہے میں قسم کھاتا ہوں آج ہی سے عمل کر دوں گا۔ آپ بتائیے ترکیب"

خاں صاحب نے جوش میں آکر ایک دقت کئی طرح سے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "سن لو کان کھول کر تمہیں اُن سے لڑنا پڑے گا اور ان کی ہر بات کا کاٹ "کرنا پڑے گا"۔

میں نے دل میں گذشتہ جنگوں کی معرکہ خیز حالات پر غور کیا۔ ویسے تو میں گھر والی سے اکثر لڑ چکا ہوں مگر ان تمام لڑائیوں کا نتیجہ کچھ امید افزا نہیں رہا کبھی وہ نہ دبی تو میں دب گیا اور کبھی میں نہ دبا تو وہ بھی نہ دبی چنانچہ میں بجائے خاں صاحب کو جواب دینے کے یہی سوچنے لگا "

خاں صاحب نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو عینک کے اوپر سے جھپکا کر گردن ہلا کر کہا۔ ع

"سگ کار دیدہ بسنجد بجنگ ٭ زروبہ رمد شیر نادیدہ جنگ"

میں نے کچھ شرمندہ ہو کر خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ بھلا کیا جواب دیتا اور کیا کہتا۔ خاں صاحب نے مجھے شرمندہ اور قائل پا کر اپنے داہنے ہاتھ کا گھونسا بنایا اور اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیلا کر میرے سامنے کر کے یک لخت اپنے مصنوعی دانت نکال دیئے۔ کچھ منہ چڑا کر سخت طنز کے لہجہ میں کہا "تم بڑے بُزدل ہو۔ ارے میاں سچ جیتے

کیا ہو. لڑپڑو...... ہر بات کا اُن کی کاٹ کرو اور لڑپڑو" لفظ لڑپڑو پر زور سے داہنے ہاتھ کا گھونسا دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارا اور پھر جھوم کر جنگی جوش و خروش سے کہا یہ کہہ دو ع

بجز کامِ من گر بیاید جواب ہمیں گرز و میدان و افراسیاب"

یہ کہتے ہوئے لفظ گرز پر پھر ہتھیلی پر زور سے گھونسا مارا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگے۔

میرے دل میں دفعتہً کچھ جنگی جوش آیا۔ دل میں کچھ امنگ اور بہادری کا سا احساس ہوا۔ ہوں نا آخر چنگیز خاں کی اولاد میں۔ ایک دم سے خونِ تاتار نے میری رگوں میں جوش مارا...... میں شیر تھا..... بلکہ ہوں ...... مگر کیسا؟..... شیر نادیدہ جنگ"! اور یہی وجہ ہے جو میں خواہ مخواہ خانم سے دبتا ہوں۔ مگر شیر پھر شیر ہے...... آگے جا کر پھر شیر ٹھہرا..... اِک ذراسی جنگی تعلیم کی ضرورت ہے اور بس خاں صاحب سے دو چار باتیں پوچھ لوں اس فن کی کہ گھر والی سے کس طرح کامیابی سے لڑتے ہیں میں نے پوچھا:-

کیا جاتے ہی یک دم لڑنا شروع کر دوں۔ آخر کس بات پر شروع کر دوں"

خاں صاحب چین بہ جبیں ہو کر بولے "تم بھی عجیب آدمی ہو" میاں ذرا تیور پر بل ڈالے رکھا کرو۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ فوراً اُن کی تمام باتوں کا بات بات پر کاٹ کرنا شروع کر دو اور جو زرا وہ چین چپڑ کریں تو بس.... وہیں سانپ کا پھن کچل دو۔ مگر ہاں ایک بات ہے بے بات ہرگز نہ لڑنا۔ پہلے بات پیدا کر لو اور پھر لڑو اور خوب لڑو"

میں دانتوں تلے غصہ سے ہونٹ دبا کر جنگ کے مختلف پہلوؤں اور امکانات پر غور کرنے لگا۔

خاں صاحب میرے ولولہ کو تاڑ گئے اور انہوں نے اپنا پر زور لکچر شروع کر دیا ؎

لکچر:.... بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ گھر والی نہ ہوئی وہ ہو گئی۔ تم ہی تو گھر کے کمائی ہوا اور تم ہی کو خرچ کرنے کو نہیں ملتا۔ اس کا یہ کاٹ کرو کہ خود اپنے پاس علیحدہ رقم جمع کرو۔ گھر والی کو بس خرچ کے مطابق دو تم کہتے ہو اخبار والا کوئی روزانہ اخبار نہیں دیتا بلکہ اسے انہوں نے کچھ ایسا سکھا دیا ہے کہ وہ تصویروں والا ٹائمز ہفتہ کے ہفتہ لاتا ہے اور وہ خود تصویریں دیکھا کرتی ہیں۔ یہ سب واہیات ہے تصویریں ویسے ہی عورتوں کو دیکھنا منع ہیں اس کا یہ کاٹ کرو کہ بند کر دو ایسے لغو اخبار کو جس میں تصویریں ہوں اور ڈانٹ کر اخبار والے سے روزانہ اخبار منگاؤ ورنہ وی۔ پی سے منگوالو۔ صابن دانی کہتے ہو غسل خانہ سے انگنائی میں لانے کا حکم نہیں۔ اس کا یہ کاٹ ہوا کہ صابن دانی توڑ دو اور صابن پھینک دو۔ یہ بھی واہیات ہے کہ گھڑی کی طرح ایک وقت پر تمہیں کھانا کھانا پڑتا ہے۔ وہ کون احمق ڈاکٹر ہے جو یہ ان سے کہہ گیا۔ وہی ہو گی میم.. ڈاکٹرنی...... اول نمبر کی حرّافہ ہے.... مت آنے دو اُسے اپنے یہاں اور مت کھاؤ کھانا وقت پر۔ میز پر چھوڑ آسمان پر لگ جائے کھانا مت کھاؤ یہ کوئی وجہ نہیں کہ اب تو میز پہ کھانا لگ گیا۔ سب واہیات۔ ہر وقت منہ چلتا رہنا چاہئے۔ بیسن کے سیو۔ ریوڑیاں، مونگ پھلیاں۔ بس ایسی چیزیں جیب

ہیں رکھا کرو اور کھاتے رہا کرو۔ عمدہ سوٹ نہیں ملتے پہننے کو تو اس کا یہ علاج ہے کہ انہیں روز پہنو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ کیا کہا تم نے کہ جن دکانوں سے تمہارا حساب ہے وہاں تمہیں کوئی قرض نہیں دیتا غضب خدا کا الٹا معاملہ ہے الٹا تمہاری گھر میں" نے دکانداروں سے کہہ رکھا ہے اگر تم قرض مانگو تو نہ دیں! اماں ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ کیا واہیات تم اپنا الگ روپیہ رکھوا اپنے پاس۔ مہینے کے مہینے گھروالی کو خرچ کے لئے دو پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ پیئے ہوئے سگرٹوں کے ٹکڑے گن گن کر تم سے الجھتی ہیں۔ ڈبہ اپنے قبضہ میں رکھتی ہیں۔ اس کا یہ کاٹ کرو کہ دگنے سگرٹ پیو۔ ورنہ میں حقہ بھیج دوں گا۔ غرض ہر بات کا ان کی کاٹ کرو اور لڑپڑو۔"

(۲)

خاں صاحب نے اپنا لکچر بڑے زور در ل میں ختم کیا۔ میری رگ رگ میں غصہ کی بھڑکن تھی۔ ایسی سرکش بیوی بغیر لڑے زیر نہ ہوگی۔ خاں صاحب کا مشورہ درست ہے لاحول ولاقوۃ۔ میری بھی عالت قابلِ رحم ہے کہتے ہیں لوگ کہ تمہاری بیوی بڑی اچھی ہے۔ ادھر کچہری سے واپس آنے کا وقت ہوا اور دیکھ لو اسے کمرہ کے دروازے پر کس بے چینی سے انتظار کرتی ہوتی ہے۔ دوسرے ساتھی سنتے ہیں اور رشک کرتے ہیں کہتے ہیں کس طرح پھول کی طرح کھل کر وہ تمہارا استقبال کرتی ہوگی۔ تمام کلفتیں دور ہوجاتی ہوں گی کام کا بار ہلکا ہوجاتا ہوگا۔ دوستوں کا کہنا بالکل درست ہے جیبوں کا بار بھی ہلکا ہوجاتا ہے۔ ادھر پہنچے اور آنکھ سے آنکھ ملتے ہی پہچان جاتی ہے کہ ہے کچھ جیب میں۔ بس پھر کیا تھا مسکرا کر کندھے پر ہاتھ رکھا اور اندر باہر کی سب جیبیں ٹٹول لیں۔ تمام سحر آفرینیاں ہی ختم ہوجاتی ہیں۔ کچہری سے نیت کرکے چلو کہ کچھ رقم نہ دیں گے مگر وہاں تو سحر آفرینیوں کے پھندے اور تبسم کے جال مارے جاتے ہیں اور پوری جامہ تلاشی ہوجاتی ہے۔ بھلا مجال ہے کوڑی رہ جائے۔ ناممکن غرض میں آپ سے کیا عرض کروں جب سے خاں صاحب سے ملاقات ہوئی ہے دراصل میری آنکھوں کا پردہ اٹھ گیا ہے۔ مجھے علم ہی نہ تھا کہ ایک شوہر کے کیا حقوق ہیں اور یہ کہ میرے کون کون سے حقوق میری شریکِ زندگی نے ضبط کر رکھے ہیں بقول خاں صاحب کے مجھے چوڑیاں پہن لینا چاہئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس ذلت سے ڈوب مرنا بہتر ہے ۔ ۔ ۔ چلو بھر پانی میں ۔ ۔ ۔ ۔ بے حیا ہوں۔ بزدل ہوں۔ دن رات بیوی کی جوتیاں کھاتا ہوں اور زندہ ہوں! شرم نہیں آتی! اصل معنی میں زن مرید ہوں! یہ سب سچ ہے اور بقول خاں صاحب کے مجھے لطف زندگی بھی نہیں حاصل۔ موت بہتر ہے گھر میں آؤں تو بقول خاں صاحب کے بیوی کو کانپ جانا چاہئے۔ اُسے سانپ سونگھ جانا چاہئے۔ غضب ہے کہ وہ میرے پہنچتے ہی مجسم زندگی ہوجاتی ہے۔ ذرا نہیں ڈرتی۔ مجال نہیں جو شطرنج کھیلتا رہ جاؤں۔ قصہ مختصر میری زندگی دراصل تلخ ہے۔ بقول خاں صاحب کے میرا ناطقہ بند ہے مجھے احساس کرنا چاہئے کہ میری حالت اب وہ ہے کہ تنگ آمد بجنگ آمد۔

قصہ مختصر ان تمام امور پر غور کرتا میں گھر پہنچا۔ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ اب میں بھی خانم کو ذرا مزہ چکھاؤں

گا سختی سے کام لوں گا۔ اب کی لڑائی ہوگی تو انہیں پتہ چلے گا۔ بغیر سختی کے یہ شورہ پشت بیوی قابو میں نہیں آئے گی

جب دروازے میں کمرے کے قدم رکھا ہے تو خیال آگیا کہ خاں صاحب نے کچھ تیور چڑھانے اور غصیل صورت بنانے کا بھی مشورہ دیا تھا ایک دم سے میں نے دانت پیس کر تیور چڑھائے اور کچھ بارعب اور غصیل صورت بنانے کی دو تین دفعہ جلدی جلدی مشق کر کے کہا۔ نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب" گھر میں داخل ہوا۔ مگر کمرے سے الٹے پیر لوٹ پڑا۔ غسل خانہ میں آئینہ دیکھا۔ گال بے حد چپکے ہوئے ہیں میرے۔ میں نے دل میں سوچا کہ بس۔ یہی گال باعث مصیبت ہیں یہی تمام خرابی ہے کہ بہتیرا بارعب شکل بناؤ کچھ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ سوکھی ہوئی کھٹائی کی شکل ہو جاتی ہو شاید گال پھلانے سے کام چل جائے۔ گال پھلا کر دیکھئے مگر یہ خیال غلط نکلا۔ ویسے ہی غصہ در چہرہ میں نے بنایا۔ گھونسا تان کر خود کو آئینہ میں دکھا کر اور لڑنے کا سولہ آنہ ارادہ کر کے میں کمرہ میں آیا۔

(۳)

مگر میرا گھر میں پہنچنا تھا کہ اور ہی معاملہ در پیش آیا۔ ادھر میں داخل ہوا ہوں اور اُدھر وہ مجسم گلاب کا پھول بن کر میرے سامنے تھی۔ اُس کی چمکدار آنکھوں میں محبت کا نور جگمگا رہا تھا۔ باوجودیکہ میں سخت کبیدہ خاطر تھا مگر ایک نظر ہی کافی تھی اور جگر کے پار ہوگئی کس طرح جھپٹ کر اس نے مجھے لیا ہے کہ بیان سے باہر! "الماری" اُس کے منہ سے نکلا۔ آواز میں ایک عجیب و غریب ترنم تھا۔ لبوں پر ایک غضب کی سحر آفریں لرزش تھی اور تمام چہرہ پر مسرت اور شگفتگی اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کا دمکتا ہوا شاداب چہرہ عشق و محبت کے جذبات کا آئینہ دار ہو رہا تھا۔ وہ محبت اور عشق جس نے مجھے فنا کر دیا ہے۔ وہی جو میری تمام ذلتوں کا راز ہے!

جیسے ایک جادو تھا کہ تمام خیالات میرے دل سے آنکھوں آنکھوں میں محو ہو گئے۔ وہ جنگی جوش جس کا میں مظہر ہونے کو تھا کافور ہو چکا تھا۔ میں نے اُس کا احساس بھی نہ کیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کس محبت سے وہ اپنی نئی الماری مجھے دکھانے کے لئے جا رہی تھی جو ابھی ابھی آئی تھی۔ وہ جس کا اُسے بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔

کمرہ میں پہنچتے پہنچتے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میری داہنی طرف تھی اور میں اس کے بائیں طرف اور ہم دونوں میاں بیوی الماری کے بڑے آئینہ کے سامنے کھڑے بجائے الماری دیکھنے کے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے! میں اُس کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا کی حسین و خوبصورت ترین چیز یعنی اُس کے پرفسوں چہرہ کو اور وہ مجھے! یعنی واقعی میرے بدصورت اور کھٹائی نما اور جھرجھر چہرہ کو۔ آئینہ کیا تھا۔ یوں کہئے کہ مجمع ضدین کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔

غور سے میں نے آئینہ کو دیکھا۔ آئینہ ایک طلسم سا معلوم ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ایک لرزش کے ساتھ زیادہ دلچسپ

اور پھر ایک دم سے ہوش ربا سا ہو گیا۔ کیونکہ میں نے اپنے کندھے پر ہاتھ کا ایک ہلکا سا دباؤ محسوس کیا اور دفعتہً مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہاتھ نہیں بلکہ میرے کندھے پر کسی نے چنگاری رکھ دی !!

آئینہ سے نظر ہٹا کر میں نے اپنے داہنی طرف دیکھا .... عشق ومحبت کی بجلیاں لپک رہی تھیں۔ آنکھیں نہیں بلکہ ایک جھپکتا ہوا نور تھا .... سانس نہیں بلکہ بوئے محبت سے مہکتی ہوئی عشقِ حقیقی کی طوفاں خیز روح تھی۔ چہرہ تھا کہ "اللہ جمیل ویحب الجمال" کی جیتی جاگتی تفسیر! .... لازوال عشق ومحبت کا ایک متلاطم وطوفان خیز بحر بیکراں تھا جس نے اپنی موجوں میں مجھے گم کر دیا .... میں نے اپنے کو سچ مچ ڈوبتے ہوئے محسوس کیا .... تنکے کا سہارا ....

ایک بچے کو جس طرح کان میں گھڑی لگا کر اُس کی ٹک ٹک سناتے ہیں بس بالکل اسی طرح میں بھی اپنی پیاری مگر سرکش بیوی کو اپنے دل کی دھڑکن سنا رہا تھا !! اس کا سر میرے سینے پر تھا اور وہ غور سے میرے دل کی دھڑکن یا ٹک ٹک کان لگائے سن رہی تھی اور ساتھ ہی اپنا تمام غرور وسرکشی چھوڑ کر کس طرح نہایت ہی بھولے پن سے اپنی نشیلی اور جھپکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی .... یا شاید خود میری آنکھوں میں ہو کر میرے دِل کی گھڑی کی نازک بالکمانی کو چھُو رہی تھی !! اور وہ بھی اس طرح کہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ یہ دل کی گھڑی کہیں چلتے چلتے ایک دم رُک نہ جائے !!

ذرا غور کیجئے کہاں ایک مجھ سا گنہگار واحمق بندہ اور کہاں حضرت موسےٰ۔ مگر خدا کی دین تو خدا کی دین ہے۔ خود حضرت موسےٰ ہی اس کے شاہد ہیں .... کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے اُن سے تو خدا نے کہا "لن ترانی ......" اور مجھ سے ! .... یہ ایک سوال تھا۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے ......"

میں یہ مسائلِ علوی طے کر رہا تھا کہ دفعتہً باہر ملازم لڑکے نے کسی کو پکارا کہ میں گویا چونک پڑا

عظیم بیگ چغتائی

نوائے مضطر

آج تک یاد ہے وہ عیش و طرب کی بارش
ہائے مجبور کوئی آہ وہ شب کی بارش

یا تو افراطِ محبت کی ہے یا قلتِ مہر
کشتِ اُمید پہ ہوتی نہیں ڈھب کی بارش

بندہ پرور یہ نہ آنے کے بہانے سارے
مجھ کو معلوم نہیں بند ہی کب کی بارش؟

جور دیکھیں گے تر الطف و کرم جو چاہا
آگ برسے گی اگر ہم نے طلب کی بارش

کیا کہوں ابرِ بہاری کا برسنا کیا ہے
تیرے رنجور پہ ہے رنج و تعب کی بارش

نہ میسر ہے شراب اور نہ ممکن ہی وصال
خون رلواتی ہے مضطرؔ ہمیں اب کی بارش

بزمِ نشاط و محفلِ عشرت نہیں ہے اب
غمہائے روزگار سے فرصت نہیں ہے اب

یہ تو نہیں کہ تجھ کو محبت نہیں رہی
لیکن وہ اضطرابِ محبت نہیں ہے اب

یا لطف پر بھی شکوہ بے جا تھے بے شمار
یا جور پر بھی کوئی شکایت نہیں ہے اب

غضب کی شوخیاں ہیں اس نگاہِ فتنہ ساماں میں
نہیں ہی صبر کی طاقت مرے دل میں مری جاں میں

تلاطم ہائے دریا سے ہراساں ہو نہیں سکتے
کہ ہم پالے ہوئے ہیں پرورشِ آغوشِ طوفاں میں

وہی اک رشتہ ہے زنار اور تسبیح میں مضطرؔ
یہ کیا مہمل سے جھگڑے پڑ گئے ہیں کفر و ایماں میں

رام رتن مضطرؔ

اسلامی فنِ تعمیر پر ایک نظر

بہترین فنِ تعمیر وہ ہے جو ساخت کی مشکلات حل کرے اور تخلیقِ حسن میں بھی کامیاب ہو۔ یونانیوں کی بہترین عمارات اس معیار پر پوری اترتی ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ انہیں بہت کم مشکلات پیش آتی تھیں ہموار چھتوں کی یک منزلہ عمارتیں بنانے کے لیئے صرف یہ ضروری ہے کہ چند ستون مناسب جگہ پر کھڑے کر دیئے جائیں۔ اس خیال کے پیشِ نظر ہم یونانی فنِ تعمیر کو بہترین قرار نہیں دے سکتے۔

رومانی صناع اپنے یونانی پیشرؤں سے دو چار قدم آگے بڑھے۔ انہوں نے دو منزلہ، سہ منزلہ عمارتیں اور محرابیں بنائیں لیکن ان کے حقیقی اصول وہی تھے جو یونانیوں نے دنیا کے سامنے پیش کئے تھے۔ ان کے بعد یورپ کی باقی اقوام نے بھی وہی اصول کم و بیش تغیر و تبدل کے ساتھ پیشِ نظر رکھے۔ لیکن فنِ تعمیر کو معراجِ کمال پر پہنچانے کی سعادت مسلمانوں کی قسمت میں لکھی تھی۔

وہ ازلی چنگاری جو قدرت نے عرب کے ایک گوشے میں چھپا رکھی تھی جلد ہی شعلۂ جوالہ بن گئی اور سرحدِ چین سے ہسپانیہ تک تمام دنیا اس کی لپیٹ میں آگئی۔ مشرق و مغرب عرب جہانداروں کی تہذیب سے آشنا ہوئے جو دنیا کے لیئے آیۂ رحمت ثابت ہوئی، جو ساسانیوں، یونانیوں اور رومانیوں کے تخریبی حربوں سے متنفر تھی۔ اور جو محکوم قوموں کے ادب اور فنونِ لطیفہ کو تباہ کرنے نہیں آئی تھی بلکہ انہیں فروغ دینے اور ان کے مردہ اجسام میں نئی روح پھونکنے کے لیئے ظاہر ہوئی تھی۔ بخت نصر نے ہیکل کو برباد کیا لیکن عمر فاروق نے مفتوح بیت المقدس میں تاریخی عمارتوں کو برقرار رکھا۔ بلکہ ان میں ایک مسجد کا اضافہ کیا جو سادگی اور خوبصورتی کے لیئے تعریف کی مستحق ہے۔

مغربی نقاد یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اسلامی فنِ تعمیر میں نقل کا عنصر غالب ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دبی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے رعایا کے فنون کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کے بجائے انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ وہ جہاں جہاں گئے اپنی فتح کے شاندار نشانات چھوڑتے گئے۔ جو رہتی دنیا تک اُن کی عظمت کی داستان اہلِ نظر کو سناتے رہیں گے۔ انہوں نے صناعی کے ایسے لاجواب نمونے اہلِ عالم کو پیش کئے ہیں جن میں یونانیوں کی سادگی رومانیوں کی شان اور مصریوں کی تحیرانگیزی بیک وقت موجود ہے۔ اس کے علاوہ دل آویز بیل بوٹے بنانے اور رنگ آمیزی کا کمال جیسا مسلمانوں کی عمارتوں میں ہے اور کہیں نہیں۔ رنگدار پتھر

استعمال کرنے کا خیال بھی پہلے پہل انہی کو آیا تھا۔ ہسپانیہ کے اسلامی بادشاہوں کا محل "الحمرا" جو سرخ پتھروں کا بنا ہوا ہے اس خیال سے قابل ذکر ہے۔ یہ شاندار محل جو آج تک دنیا کے عظیم ترین عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے چودھویں صدی عیسوی میں بننا شروع ہوا اور نصف صدی تک پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کی تعمیر میں صرف خوبصورتی ہی کا خیال نہیں رکھا گیا بلکہ اس کے ہر نقش میں معمار کی جدت طبع کا ثبوت ملتا ہے۔ محل کا جو حصہ بیت الاساد کہلاتا ہے مسلمانوں کی اختراع کی شہادت دیتا ہے۔ یہ ایک صحن ہے جو چاروں طرف نظر فروز منقش محرابوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے وسط میں ایک فوارہ ہے جس سے پانی ایک طشت میں گرتا ہے جو سنگین شیروں نے اٹھا رکھا ہے۔ اور جس سے پانی شیروں کے منہ سے نکلتا ہے۔

شہزادیوں کے غسل خانے مچھلیوں کا تالاب اور بادشاہ کی خواب گاہ بیت الاساد سے کچھ کم حیرت انگیز نہیں اگرچہ موخر الذکر کے خلاف یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی محرابیں بلاضرورت بنائی گئی ہیں کیونکہ چھت کا بوجھ ستونوں نے اٹھا رکھا ہے۔ اس لئے محرابوں کو بنانا تضیع اوقات کے مترادف ہے۔ مگر اسی "تضییع اوقات" کے طفیل انسان کی نظر پر ایسا جادو ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ان محرابوں کو دیکھ کر زندگی کی کلفت سے رہا ہو جاتا ہے۔ اور چند لمحوں کے لئے ہماری غبار آلود فضا اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ حسن کا کمال یہی ہے۔ کہ وہ دیکھنے والے کو پیکارِ حیات سے تھوڑی دیر کے لئے بے نیاز کر دے۔ یہی آرٹ کا مقتضا ہے۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی "تضیع اوقات" کے عادی مسلمانوں نے اس مقصد کو نظر انداز نہ کیا۔

زمانہ کے انقلابات سے الحمرا محفوظ نہیں رہا۔ اور جا بجا شکست و ریخت کے آثار اس میں نظر آتے ہیں۔ اس لئے مغربی نقاد اس کی طرف انگلیاں اٹھا کر کہہ رہے ہیں کہ مسلمان صرف وقتی مصلحت کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے شوخ اور جلد مٹ جانے والے رنگ استعمال کئے۔ انہوں نے خوبصورتی کے لئے استحکام کو نظر انداز کیا۔ عمارت تو بنا دی۔ لیکن اس کی حفاظت خدا پر چھوڑ دی۔ مگر الحمرا کی قدامت خود اس اعتراض کا جواب دے رہی ہے۔ اور شوخ رنگوں کے استعمال کے مجرم صرف مسلمان ہی نہ تھے۔ یونارڈو دا ونچی بھی تھا۔ اور ٹیشین بھی جب وہ آسمان پر چڑھا رہے ہیں اس لحاظ سے کچھ کم قصور وار نہ تھا۔

الحمرا کے بعد ہماری نظر قرطبہ کی مسجد جامع پر پڑتی ہے۔ عینی شاہدوں کا قول ہے۔ کہ ایسی مسجد کی نظیر دنیا میں مشکل ہے۔ محرابوں کا ہجوم ایسا ہے کہ دیکھنے والے پر رعب طاری ہو جاتا ہے۔ نقادانِ فن کا فیصلہ ہے کہ مصر کے سوا کوئی ملک اس جیسی مسجد پیش نہیں کر سکتا۔ اس میں عربی رنگینی اور رومانی شان یکجا نظر آتی ہے۔

ہسپانیہ میں اس کے علاوہ کئی اسلامی عمارات ہیں جو اس ملک کی کور ذوقی کا ماتم کر رہی ہیں۔ غرناطہ میں شاہان اسلام کا "گرمائی محل" اور اشبیلیہ میں "القصر" اور "منارہ فتح" ہسپانویوں کی دستبرد سے نالاں ہیں۔ انہوں نے

موخر الذکر کو گھنٹہ گھر بنانے میں جو ظلم آرٹ پر کیا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔

ہسپانیہ کے بعد ترکی کی عمارات ہماری توجہ منعطف کرتی ہیں۔ ان میں بازنطینی رنگ نمایاں ہے۔ اور وہ عموماً مسجد ایاصوفیہ کے طرز کی ہیں۔ ان میں سلطان احمد، سلیمان اور بایزید کی مسجدیں قابلِ ذکر ہیں۔

مصر فلسطین اور ایران بھی خوبصورت عمارتوں پر کم ناز نہیں کر سکتے۔ مصر میں قایدبے کی مسجد، فلسطین میں مسجدِ عمر اور ایران میں مسجدِ اصفہان قابلِ دید ہیں۔ لیکن ان تمام عمارات سے بھی زیادہ قابلِ ذکر مدینہ کی مسجدِ نبوی ہے جو آرٹ کے شائقین کو سبق دیتی ہے۔ کہ سجاوٹ سے سادگی زیادہ جاذبِ نظر ہے۔ جو شان ہمیں وینس (حسن کی دیوی) کے یونانی مجسمہ میں نظر آتی ہے اس میں بھی ہے۔

یونانی، رومانی اور بازنطینی عیوں کا جو اثر اسلامی فنِ تعمیر پر ہوا اس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ مصری اصولِ تعمیر اثر دکھائے بغیر نہ رہے۔ اہرام مصر کو دیکھ کر بعض مسلمان بادشاہوں کو بھی شاندار مقبرے بنانے کا شوق پیدا ہوا۔ ان مقبروں میں سے بہترین وہ ہے۔ جس میں خلیفہ ہارون الرشید کی چہیتی بیگم زبیدہ دائمی نیند میں محو ہے۔ یہ مقبرہ جس کی ساخت ہشت پہلو ہے۔ اور جس کی چھت عجیب اہرام نما ہے۔ الف لیلہ سے بھی زیادہ ہارون کی شہرت کی ضامن ہے۔

ہمارے ہندوستان کا دامن بھی اسلامی تعمیر کے بیش بہا نمونوں سے بھرا پڑا ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ربطِ باہم سے ایک ایسے فنِ تعمیر کا ارتقا ہوا۔ جو اپنی پاکیزگی، موزونیت اور خوبصورتی کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ دہلی کا قطب مینار اور حیدر آباد کے چار مینار قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی عظمت کے پرشکوہ شواہد ہیں۔ ان کے علاوہ مغلوں کے تعمیری آرٹ کے شاہکار ایسے ہیں۔ جن کا شمار ناممکن ہے۔ لیکن ان کے اوصاف کا واجبی اور مکمل تذکرہ ممکن نہیں۔ کم و بیش ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں مغلوں کی کوئی نہ کوئی یادگار باقی ہے۔ شاہجہان آباد کا ذرہ ذرہ ان کا مرثیہ خواں ہے۔ آگرہ میں روضۂ تاج محل اور اورنگ آباد، سکندرہ، فتحپور سیکری اور دیگر کئی شہروں میں ان کے آثار باقی ہیں۔ ان کا بیان کرنا تحصیل حاصل ہے۔ ان کی صفات پہلے ہی عالم آشکار ہیں۔

اسلامی عمارتوں پر ایک چھچلتی ہوئی نظر ڈالنے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ مسلمانوں کا فنِ تعمیر کس حد تک قابلِ ستائش ہے۔ اور کس حد تک اس کے اصول کامیاب ہوئے ہیں۔ آرٹ سب سے پہلے خوبصورتی کا مطالبہ کرتا ہے اسلامی معمار بھی اسی مطلح نظر پر شیدا تھے۔ لیکن وہ استحکام کو بھی خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں موزونیت درکار تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو ہیرا مٹی کے ڈھیر میں دبا ہو الم نہیں دیتا۔ وہی انگشتری میں لگ کر اپنی تمام آب و تاب سے چمکنے لگتا ہے اس لئے ہندی معماروں کے برعکس وہ مناسبت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ہندو جہاں تل بھر کی جگہ دیکھتے تھے اسے آراستہ کر دیتے تھے۔ ان کی ہر عمارت میں نقش و نگار کی افراط نگاہ کو خیرہ کرتی تھی۔ مگر مسلمان معمار کفایت کا لحاظ رکھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کروڑوں خوبصورت گھونگوں سے پٹا ہوا ساحل سمندر کی سادہ نیلی چادر جتنا جاذبِ نظر نہیں۔

اسلامی معماروں نے فطرت کو اپنا حلیف بنایا۔ وہ اپنی عمارتوں کے مرمریں پیکر کی خوبصورتی باغات سے دوبالا کرتے تھے۔ یہ خصوصیت مغلوں کی اکثر عمارتوں میں نظر آتی ہے۔

اسلامی فنِ تعمیر اسلامی تہذیب کا آئینہ ہے۔ ہمیں ہر عمارت میں مسلمانوں کے اخلاق کا کوئی نہ کوئی پہلو نظر آتا ہے۔ ان کا کوہ شگاف عزم ان کی جدت طراز فطرت ان کی سادگی اور ان کی ذہانت ہر نقش دیوار میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کی عمارات میں بھڑک اور محض نمود کا نشان تک نہیں۔ انہوں نے موزونیت کو سجاوٹ اور اعتدال کو افراط پر ہمیشہ ترجیح دی۔ ان کا مطمح نگاہ نظر کو فریب دینا ہی نہ تھا بلکہ وہ عقل۔ روح اور ذوق نگاہ تینوں سے اپنے کمال کی داد لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے نزاکت کی جگہ شوکت اور دقیق انتفا کے احترام کی جگہ کمالِ فن کو اپنا مدعا ٹھہرایا۔ ان وجوہ کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ یونانی، بازنطینی، رومانی اور مصری معماروں کے لائق وارث ثابت ہوئے۔

ہر انسان کی آرزو ہے کہ وہ دنیا میں ایک جنت بنائے، جو اس کو لبھائے اور جس کا روح پہ ایک طلسمی اثر ہو تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان معماروں سے زیادہ کسی کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

عطاء اللہ کلیم

غزل

کیوں عرضِ مدعا کے لئے جا رہا ہوں میں ۔ گویا کسی کی بات میں پھر آ رہا ہوں میں

اے وائے اعتبار! کہ مایوس بھی نہیں ۔ اِک عمر سے فریبِ کرم کھا رہا ہوں میں

کچھ بات تھی کہ مجھ سے نگاہیں چُرا گئے ۔ جی کو اسی خیال سے بہلا رہا ہوں میں

جب جانتا ہوں عشق کا انجام جانگداز ۔ کیوں قلبِ نامراد کو بہکا رہا ہوں میں

میری جبیں میں ایک بھی سجدہ نہیں رہا ۔ کس آستان پہ ناصیہ فرسا رہا ہوں میں

بے سود کیوں ہو میری فغاں بے اثر سہی ۔ تجھ تک پیامِ شوق تو پہنچا رہا ہوں میں

یہ خوب عاشقی ہے کہ جینا حرام ہے
انور! خدا گواہ کہ پچھتا رہا ہوں میں

لطیف انور
گورداسپوری

اردو ادب اور میانہ روی

رسول عربی صلعم کا قول ہے کہ سب کاموں میں وہی کام اچھا ہوتا ہے۔ جو درمیانہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ اردو ادب کی چال بھی انیسویں صدی عیسوی کے انجام تک اسی قاعدے پر رہی ہے لیکن اب دس بیس برس سے ایک طرف تو یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ اردو زبان سے فارسی عربی الفاظ کو دور کر دیا جائے اور دوسری طرف سے اس میں عربی اصطلاحات اور محاورات کی ایسی بوچھاڑ ہو رہی ہے کہ اگر سر سید احمد مغفور اور پروفیسر آزاد مرحوم جیسے صاحب علم بھی جی اٹھیں تو اس معرّب اردو کو نہ پہچان سکیں۔ اردو زبان کی بناوٹ ہی عربی فارسی اور سنسکرت کے ملاپ سے ہوئی ہے۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی اس سے نکالی نہیں جا سکتی۔ اگر پہلی دو زبانوں کو اس سے خارج کر دیا جائے تو حساب الجبرہ۔ اقلیدس۔ صرف و نحو۔ طب۔ قانون اور تمام علمی کتابوں کے خزانے جو دو سو سال کی محنت سے جمع ہوئے ہیں۔ سب ضائع ہو جائیں گے۔ شمال ہند سے جنوب تک ان دو زبانوں کے ہزارہا الفاظ اور ترکیبیں زبان زدِ خلائق ہو چکی ہیں۔ جن کو ہر رنگ کے آدمی بلا امتیازِ قوم و مذہب روزمرہ استعمال کرتے ہیں اور جن کا بدل مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی تو ضروری نہیں۔ کہ ہم ایسی اردو ایجاد کریں۔ جس میں جملوں کے جملے استعارات و تشبیہات۔ تلمیحات و کنایات۔ تلازمات و ائتلافات۔ تصورات و توالیعات۔ اشارات و ضمنیات سے پر ہوں۔ یا بہ اسرار حقائق بطن و دروں۔ حقیقت الامر۔ الہام و القا۔ اعجاز نما جزالت و نزاکت کے تموج و تلاطم سے مدہوش ہوں یا جذباتِ عالیہ۔ حسیات لطیفہ۔ لزومِ مالایلزم۔ لامحالہ۔ رندِ لاابالی۔ سوفیانہ سخیف۔ اساطیر الاولین۔ مناظر و مرایاء مستحضرات و مافیات۔ عارضی و سرمدی۔ امتدادِ زمانہ۔ پرشکوہ و جزیل۔ سوفیانہ فلسفیانہ حکیمانہ نکات اعلےٰ و ارفع خیالات۔ نیم شعوری اور چشم تخیل کے صنائع بدائع سے ہم حیران ہوں۔ یا تنقید و تعقید۔ تشریح و تشکیل تجرید و تنقیح۔ تقفید و تلبیز کے جارحانہ و مدافعانہ بحرِ ظلمات میں اردو کی کشتی کو چھوڑ دیں۔ جس کے طوفان سے وہ کبھی نکل نہ سکے۔ ایسے معرا۔ عامتہ الورود۔ کیف آور۔ مطلق العنان۔ استبدادی۔ غلو آمیز انفرادی الفاظ سے خدا اہلِ ہند کو محفوظ رکھے۔ آمین

بہتر یہی ہے کہ اردو ادب کے دوست اُس میانہ روی کو جاری رکھیں۔ جس سے اس کی ترقی ہوئی ہے اور جس نے اس کو ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ والسلام

حافظ غلام سرور از پانگ ۱۶ مارچ ۱۹۳۲ء

محفل ادب

علامہ شبلی مرحوم کا تغزل

اے خوش آں روز کہ رازم فتد از پردہ بروں ٭ از دو سو طعنۂ دشمن مے زدہ رسوا باشم (شبلی)

قبل اس کے کہ علامۂ مرحوم کی غزلوں پر تنقید کروں مناسب بلکہ ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس ماحول کو بیان کر دوں، جس نے شاعر کے جذبات میں ہیجان برپا کر دیا۔ اور اس فضا کی تشریح کر دوں جس میں شاعر کے تخیلاتِ شاعرانہ کی نشو و نما ہوئی۔ ممکن ہے کہ مخصوص طبقہ میرے اس اظہارِ خیالات سے برہم ہو لیکن اب یہ کوئی رازِ سربستہ نہیں رہا ہے بلکہ "خطوط شبلی" کے مقدمہ میں مولوی عبدالحق بی۔ اے نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے اور اب یہ "رازِ عالمِ خلوت" سے نکل کر "منصۂ شہود" پر آشکارا ہو چکا ہے۔ بمبئی کی مشہور و محترم خواتین زہرا بیگم فیضیہؒ اور عطیہ بیگم فیضیہ کے اسمائے گرامی سے کون واقف نہیں۔ ان خواتین اور خصوصاً عطیہ بیگم سے مولانا کو جو فرطِ محبت اور ذوقِ ارتباط تھا وہ اُن خطوط سے نمایاں ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً بیگماتِ مذکورہ کو لکھے تھے۔ علی الخصوص عطیہ بیگم کے نام جو خطوط مولانا نے لکھے ہیں ان سے مولانا کے ایسے ایسے پوشیدہ خیالات ظاہر ہوتے ہیں جن کا اظہار انہوں نے پبلک میں کبھی نہیں کیا تھا۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا کی سیرت کے دو پہلو تھے پبلک اور پرائیویٹ۔ جلوت و خلوت مولانا کو ہرگز یہ امید نہ ہوگی کہ یہ خطوط کبھی شائع بھی ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے ان خطوط میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھدیا یہ مجموعہ جو نوادرِ ادب میں شمار ہونے کے لائق ہے شائع ہو گیا ہے۔ علامہ شبلی نے خود فرمایا تھا ؎

حکایتِ من و او گرچہ رازِ پنہاں بود ٭ بسے نہ ماند کہ ایں حرف داستاں گردد

اس مجموعہ کی ایک جلد میرے پاس بھی ہے اور میں نے ذوق و شوق سے ایک ایک "مکتوبِ محبت" کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر افسوس کہ چند روز ہوئے میرے ایک دوست اس کتاب کو بیدردی سے چھین کر لے گئے ورنہ اقتباسات درج کر کے مولانا کے خیالات و جذبات کے نمونے دکھاتا۔ تاہم جو کچھ دماغ میں محفوظ ہے پیش کرتا ہوں۔ عطیہ بیگم کا ایک خط مولانا کے پاس آیا ہے وہ اس خط کو دیکھ کر اس قدر وارفتہ و بیخود ہو جاتے ہیں کہ سر پر رکھ لیتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ بمبئی جانے کے تہیہ میں ہیں اور عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں ؎ "زودی آئم و ایں ہم دیر است"۔ اس مختصر مصرع میں جذبات کی ایک وسیع دنیا مضمر ہے جس کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ عطیہ بیگم ولایت جا رہی ہیں۔ مولانا عالمِ تصور میں

فرماتے ہیں سے می روی وگریہ می آید مرا ساعتے بنشیں کہ باراں بگزرد "
ایک خط میں فرماتے ہیں " اپنی تصویر بھیج دو" ایک نامۂ شوق میں اپنے منتخب فارسی اشعار بیگم کو سناتے ہیں اور ان کی تشریح بھی کرتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ یہ خطوط حسن جذبات و کیفیات کے حامل ہیں۔ غالباً کسی اور ادیب کے خطوط کو وہ بات نصیب نہ ہوئی۔ ان خطوط سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ علامۂ مرحوم طبقۂ نسواں کے متعلق کیا کیا خیالات رکھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ یہ جنسِ لطیف، یہ گلدستۂ جمال، یہ پیکرِ ناز و ادا، یہ صنفِ نازک، یہ جوہرِ نادر، یہ ہستیٔ زیبا، یہ مجسمۂ شعر و نغمہ آزادیٔ کامل کی مستحق ہے۔ " ندیم "

بلبلِ ہند سروجنی نیڈو کے چند نغمے

(۱) ہندوستانی جلاہے

طلوعِ صبح کے وقت اے عزیز جلاہو! تم کیا بُن رہے ہو۔ یہ نفیس و خوبصورت کپڑا جس کا رنگ نیل کنٹھ کے پر کی طرح آسمانی ہے، کیا ہے؟

یہ ایک نوزائیدہ بچے کا جامہ ہے!

غروبِ آفتاب کے وقت اے عزیز جلاہو! تم یہ کون کپڑا بن رہے ہو؟ یہ چمکیلا کپڑا جو نرم اور پرِ طاؤس کی طرح سرخ و قرمزی رنگ کا ہے تم کس لئے بن رہے ہو۔

ہم ایک عروسِ نو ملکۂ حسن کے روئے روشن کے لئے نقاب تیار کر رہے ہیں

اے عزیز جلاہو! - چاندنی کی خاموش سرد اور غم آگیں کرنوں کی پھیکی روشنی میں تم مغموم و متفکر و سرنگوں بیٹھے ہوئے اس قدر سنجیدگی کے ساتھ یہ کون کپڑا بن رہے ہو؟ - یہ مرغ کے پر کی طرح نرم اور بادل کی طرح سفید رنگ کا کپڑا کس لئے بنا رہے ہو؟

ہم ایک مُردے کا کفن تیار کر رہے ہیں!

(۲) کسنتری

مست، تیز اور زرد و اثر خوشبودار، لطیف و نازک اور چمکیلے پھولو! - تمہاری لچھی ہوئی پنکھڑیاں عطر و آتش کے گہوارے ہیں
ان پنکھڑیوں میں: -

سرسوتی	کا غم پنہاں ہے
سیتا	کی آرزوئیں چھپی ہیں
دروپدی	کے ارمان پوشیدہ ہیں
دمینتی	کا خوف و ہراس موجود ہے اور
شکنتلا	کے اشک ہائے خونیں ہیں

زمانہ

فہرستِ مضامین ہمایوں

بابت ماہِ جون ۱۹۳۲ء

تصاویر:- (۱) نومولود (۲) جبین آرٹ

ہمایوں کا سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء

رسالۂ "اردو" اورنگ آباد (دکن) کی رائے

یہ رسالہ میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا کے زیرادارت ایک خاص اصول اور متانت کے ساتھ شائع ہوتا ہے جنوری ۱۹۳۲ء میں اس کا سالگرہ نمبر شائع ہوا جس میں متنوع مضامین کے ساتھ ہر قسم کی دلچسپی اور حسن و خوبی کا خیال رکھا گیا ہے متین تحریروں کے ساتھ تفریحی مضامین بھی ہیں حکیمانہ نظموں کے ساتھ غزلیں بھی ہیں چھوٹے افسانے ہیں تو ڈرامے بھی ہیں۔ خود فاضل ایڈیٹر اور شریک ایڈیٹر کی اچھی اچھی نظمیں درج ہیں تصویروں کا معاملہ بہت بے ڈھب ہے تاہم ہمایوں کی تصویریں معقول ہیں اور نسبتاً بہتر ہیں۔

جریدۂ سیاست (لاہور) کی رائے

ہمایوں ادبی۔ علمی اخلاقی لحاظ سے اس درجہ بلند ہے کہ شاید ہی کوئی رسالہ اس کی ٹکر کا ہو۔ ادارۂ تحریر میں میاں بشیر احمد بی اے آکسن بیرسٹر خلف الصدق میاں شاہ دین صاحب مرحوم و جناب حامد علی خاں صاحب ایسی ممتاز و مایۂ ناز شخصیتیں ہیں حال ہی میں ہمایوں کا سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء شائع ہوا ہے دوسرے رسالوں میں تصاویر کا معیار نہایت پست اور گھٹیا ہوتا ہے لیکن آپ اگر اس سالگرہ نمبر کی تصاویر دیکھیں گے تو انتخاب کنندہ کے حسن مذاق کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے مضامین منظوم و منثور کا بیشتر حصہ ادارہ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر مضامین ملک کے ان ممتاز حضرات کے لکھے ہوتے ہیں جن کے نام ہی سے آپ حضرات پر واضح ہو جائے گا کہ ان بہترین دماغوں سے نکلے ہوئے مضامین کس درجہ بلند اور شاندار ہونگے مثلاً حضرت جوش ملیح آبادی خواجہ حسن نظامی مرزا فرحت اللہ بیگ منشی پریم چند سید سجاد حیدر یلدرم اثر صہبائی حضرت احسن مارہروی مولنا جلال الدین اکبر سید رضا علی وحشت بیگم شاہنواز صاحبہ گول میز کانفرنس علامہ تاجور ایڈیٹر ادبی دنیا سید راس مسعود بہادر وائس چانسلر علیگڑھ یونیورسٹی۔ محترمہ بشیر احمد بیگم صاحبہ۔ نور الٰہی محمد عمر صاحبان۔ محترمہ ح۔ ب صاحبہ محترمہ اصغری خانم اصغر گونڈوی۔ خواجہ حمید حسن دہلوی پروفیسر احمد علی صاحب دہلوی غرض کہ کس کس کا نام لکھا جائے۔ سالگرہ نمبر حقیقتاً نادر روزگار ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ نہایت نفیس ہے۔ سرورق رنگین ضخامت سوا دو سو صفحات۔

جہاں نما

مشرقی مصوری

مسٹر چودھری نے جو اُن چار نوجوان صناعوں میں سب سے کم عمر ہیں، جن کو حکومت نے انڈیا ہاؤس (لنڈن) کی آرائش کے لئے متعین کیا ہے، ایک ملاقات کے موقع پر مشرقی مصوری کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا:۔

بیسویں صدی اپنے ماضی کا احترام کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی حال کی بھی عزت کرتی ہے اور مستقبل سے بھی اپنے آپ کو وابستہ سمجھتی ہے۔ اُن دنوں کے مقابلہ میں جب ڈاکٹر ابنندر ناتھ ٹیگور ڈاکٹر ہادل کی سرپرستی میں نوجوان صناعوں کی ایک جماعت کے ساتھ فنون مشرقیہ کے احیا کا کام کر رہے تھے حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں، مگر مشرقی مصوری اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی۔ یہ اسی دیومالائی شان سے اب بھی اپنے ماضی کی ہوبہو تصویر ہے بیسویں صدی کی روزمرہ زندگی اور ہندوستانی معاشرت کا جو اپنے ماضی سے بالکل مختلف ہے اس میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ہمیں اپنی دلچسپیوں، اپنی خوشیوں، اپنی حسیات اور اپنے دکھ درد کا اس میں کوئی سراغ نہیں ملتا حقیقت یہ ہے کہ مشرقی فنون کی ترقی میں ہماری قدامت پرستی بہت کچھ حائل رہی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو ماضی سے وابستہ کر لیا ہے اور حال کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ عہد حاضر کے جذبات سے بے اعتنائی کر کے ہم نے اُس پر کسی طرح کی گرفت حاصل نہیں کی اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی فن اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے قومی جذبات کا مظہر نہ ہو سچ تو یہ ہے کہ ہم صرف اپنے قدیم استادوں کی بنائی ہوئی محدود چیزوں ہی کو دوبارہ ڈھالتے اور بناتے رہے ہیں اور پھر ڈھالتے اور بناتے رہے ہیں

درزی کا خط خدا کے نام

پولینڈ کے کسی قصبہ میں ایک غریب درزی رہتا تھا حکومت کے ٹیکسوں سے اس کی مالی مشکلات انتہا کو پہنچ گئیں تو اس نے مایوسی کے عالم میں نہایت خلوص اور سچے اعتقاد کے ساتھ خدا کے نام ایک خط لکھا۔

وارسا کے ڈاک خانے میں جب یہ خط سارٹروں کے ہاتھوں میں پڑا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ لفافے پر یہ الفاظ تھے:۔

بخدمت خدائے ذوالجلال

لفافے پر ٹکٹ بھی لگے ہوئے تھے۔ ڈاک خانے والے بہت پریشان ہوئے کہ کیا کریں آخرانہوں نے خط پوسٹ ماسٹر جنرل کے پاس بھیجا اور اُس نے یہ خط مارشل پلسوڈسکی کو دکھایا۔ مارشل نے خط کھولا تو اسے حسب ذیل تحریر نظر آئی:۔

پیارے خدا! میرا نام وی کازنسکی ہے اور میں درزی کا کام کرتا ہوں جیساکہ تجھے علم ہے میں سخت مقروض ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ پر بہت سے ٹیکس لگ گئے ہیں اب میں ٹیکس ادا کرنے سے قاصر ہوں اس لئے میری چیزیں بھی قرق ہونے والی ہیں۔

سو پیارے خدا میں سخت مشکل میں گرفتار ہوں، اور تجھ سے رحم کی التجا کرتا ہوں، کیونکہ تیرے سوا مجھے اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی اگر تو نے مدد نہ کی تو میں اور میرے گھر کے لوگ فاقوں سے مرجائیں گے۔ مجھے فوراً ایک ہزار لاٹی بھیج دے اس رقم سے میرا گھر پھر مسرت اور راحت کا گہوارہ بن جائے گا (ایک ہزار لاٹی = ۲۲ پاونڈ)

اس خط کے نیچے درزی کے دستخط تھے۔ مارشل پلسوڈسکی نے کچھ دیر غور کیا اور پھر اپنے سیکرٹری کو بلا کر حسب ذیل جواب لکھوایا:۔

خدا کا جواب

(یہ خط ایک نوٹ پیپر پر لکھا گیا جس پر قصر بیلویدر (مارشل کا محل) کی مہر تھی مضمون یہ تھا:۔

"مسٹر وی کازنسکی" مجھے تمہارا خط ملا۔ اس خط میں تم پانچ سو لاٹی کا ایک چک پاؤ گے۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے وطن کے ایک نیک اور وفادار شہری ثابت ہوگے"۔

چند دن کے بعد شکر گزار درزی کی حسب ذیل تحریر قصر بیلویدر میں پہنچی:۔

پیارے خدا! میں اس رحم اور کرم کے لئے جو تو نے ایک غریب درزی کے حال پر کیا تیرا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں۔ واقعی تو نیکی اور محبت کا خدا ہے، ہاں ایک عرض ہے کہ اب دوبارہ جس وقت تو مجھے روپیہ بھیجے تو قصر بیلویدر کی راہ سے مت بھیجیو کیونکہ وہاں کے لوگ ہر رقم کا نصف حصہ فوجی مصارف کے لئے وضع کر لیتے ہیں۔

پودوں کے ہلاکت خیز کیڑے

پودوں کو تباہ کرنے والے کیڑے مختلف رنگوں اور مختلف قسموں کے ہوتے ہیں۔ یہ سبزیوں وغیرہ کے پتے کھا جاتے ہیں اور پودوں کے تنوں میں سوراخ کر دیتے ہیں۔ اگر اس قسم کے کیڑے بہت زیادہ بڑھ جائیں تو لیڈ آرسنیٹ چھڑکنے سے ہلاک کئے جاسکتے ہیں۔ جو کیڑے درختوں کی لکڑی میں سوراخ کرتے ہیں انہیں فوراً ہلاک کر دینا چاہئے۔ سوراخوں کے اندر ان کے بچے ہوتے ہیں ان کو ہلاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دو حصے کلوروفارم اور ایک حصہ کریزوٹ ملا کر اس محلول میں روئی تر کر کے سوراخوں میں ٹھونس دی جائے اور پھر سوراخوں کے منہ موم سے

بند کردیئے جائیں۔

سیب کی غذائیت

حال کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ کھانے سے پہلے سیب کو چھیلنے سے اس کا سب سے زیادہ مقوی اور صحت افزا حصّہ ضائع ہو جاتا ہے۔ یہ ثابت ہوا ہے کہ چھلکے میں گودے سے چھ گنا زیادہ قوتِ حیات ہوتی ہے۔

اخلاقیات کا ایک دستور

لنڈن کے ایک جج نے زندگی کی چودہ بڑی غلطیاں یوں گنائی ہیں (۱) نیک و بد کا اپنا انفرادی معیار مقرر کر کے یہ توقع رکھنا کہ ہر شخص اس کی تصدیق کرے (۲) اپنے حظ و نشاط سے دوسروں کی نشاط کا اندازہ لگانا (۳) اس دنیا میں ہم آہنگیٔ رائے کی توقع رکھنا (۴) جوانی سے عقل اور تجربے کی توقع رکھنا (۵) یہ کوشش کرنا کہ سب لوگوں کی طبیعتیں یکساں ہو جائیں (۶) غیر اہم اور فضول باتوں میں طرح نہ دے جانا (۷) اپنے اعمال میں اکملیت کی توقع رکھنا (۸) جن باتوں کا کچھ علاج نہ ہو ان کے لئے اپنے آپ کو اور دوسروں کو پریشان کرنا (۹) اُس بار کو کم نہ کرنا جس کا کم کرنا ضروری ہو اور ہمارے اختیار میں ہو (۱۰) دوسروں کی کمزوریوں کو وسعتِ نگاہ سے نہ دیکھنا (۱۱) کسی ایسی بات کو ناممکن سمجھنا جو ہم خود نہیں کر سکتے (۱۲) صرف ان باتوں کو ماننا جنہیں ہی محدود دماغ سمجھ سکتا ہے (۱۳) اس طرح زندگی گزارنا گویا کوئی خاص لمحہ کوئی خاص وقت کوئی خاص دن اتنا اہم ہے کہ کبھی نہ گزرے گا (۱۴) انسان کے متعلق کسی بیرونی معیار سے اندازہ لگانا حالانکہ وہ معیار جو انسان کو انسان بناتا ہی انسان کے اندر ہی ہے۔

اردو اکادمی

جامعۂ ملیہ دہلی نے علمی تحقیق اور اشاعتِ علوم کی غرض سے یہ شعبہ قائم کیا ہے۔ ہم نے اکادمی کے قواعد دیکھے ہیں جو بہت امید افزا ہیں۔ اکادمی کے زیر اہتمام ایک مفید علمی رسالہ "جامعہ" اور ایک تعلیمی رسالہ پیام تعلیم بھی شائع ہوتا ہے۔ ہم ہی خواہانِ اردو سے متوقع ہے کہ وہ "اکادمی" کے قواعد منگوا کر اُن کا مطالعہ کریں گے اور اکادمی کے رُکن بن کر اپنی زبان کی خدمت میں اس کا ہاتھ بٹائیں گے۔

تصاویر

(۱) **جین آرٹ** کا یہ نفیس نمونہ ہمیں سید مقبول حسین صاحب نے اپنے مضمون جین آرٹ کے ساتھ بھیجا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین ہمایوں اسے دلچسپی سے دیکھیں گے (۲) **نومولود**۔ یہ تصویر ایک جرمن آرٹسٹ ایچ کالباخ کے فن کا نمونہ ہے بچہ کی پیدائش کے متعلق یہ ایک نہایت دل خوش کن تصوّر ہے کہ فرشتہ نومولود کو اٹھائے ہوئے منتظر گھر میں لئے آ رہا ہے۔

جین آرٹ

کسی قسم کی تجدید کیوں نہ ہو ہمیشہ عام پسند ہوا کرتی ہے، عام پسند اس لئے کہ ہر تجدید سے ایک نئے حسن کا وجود ہوتا ہے۔ گویا تجدید بھی ایک قسم کی ترمیم ہے یعنی اس سے اصلاحی فرائض بھی ادا ہوتے ہیں۔ اس کی تاریخی مثال مغرب میں مارٹن لوتھر کی تحریک ہے جس نے مغربی فن بُت تراشی سے مذہبی عنصر کو خارج کرنے میں مدد دی۔ شاید اسی طرح بدھ مذہب کے بعد برہمنوں کے اقتدار نے ہندوستان کے آرٹ پر اثر ڈالا کیونکہ جین لوگ جن کو بدھ مت کے بعد فروغ حاصل ہوا اور جو اب عموماً جنوبی مغربی ہندوستان میں زیادہ آباد ہیں اور جن کے بڑے بڑے مندر "گرنار پربت" اور "ماؤنٹ آبو" وغیرہ پر اب بھی شان و شوکت سے قائم ہیں۔ قدیم بدھ آرٹ کی طرح تیاگ اور بیراگ کی خشک اور خیالی مصوری کا نمونہ پیش نہیں کرتے ان کا آرٹ اصلیت پر مبنی ہے۔ البتہ اُن میں فن تعمیر کے چند ایسے نمونے بھی دیکھے گئے ہیں جن پر رسمیات کا بہت کچھ اثر پڑ گیا تھا۔ علاوہ رسمیات کے جین آرٹ میں ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ مذہبی تخیل کو پیکر تصویر میں لانے کے بجائے جین کاریگروں نے اپنی آرائشی تخیل کو بہت کچھ ظاہر کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ مسلمانوں کے ساتھ موافقت رکھتے ہیں۔ مگر مسلم آرٹ میں رسوم کو دخل نہیں۔ جین لوگوں میں یہ بہت ہے۔ آرائشی عنصر جین آرٹ میں بالکل اسی طرح نمایاں ہے جس طرح کہ یونانی آرٹ میں پہلوانی آن بان۔ اب تک آرائش صرف مسلمانوں ہی کا حصہ مانی گئی تھی لیکن جنوبی مغربی ہندوستان میں چند جین عبادت خانے ان کی آرائش کے ایسے نمونے پیش کرتے ہیں جن کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ جین لوگ اگر مسلمانوں کے مقابل نہیں تو بہت پیچھے بھی نہیں۔[۱] البتہ چند باتیں اُن کے آرٹ میں قابل اعتراض ہیں جن پر شاید ابھی تک کسی نے غور نہیں کیا۔ مثلاً عبادت خانوں کو ایک قسم کی روحانی میونسپلٹی ثابت کر دکھانا۔ آلہ شرب یا سوشل آرگن تو دنیا کا ہر مذہب ہو گیا ہے جین عبادت خانوں پر میونسپلٹی کا اطلاق یوں ہو سکتا ہے کہ ان کی تعمیر میں شاید نذرانے اور چڑھاوے وصول کرنے کی غرض بھی پنہاں تھی۔ مثلاً کوہ آبو کے پاس جو جین لوگوں کے بڑے مندر ہیں ان

---

[۱] ملاحظہ ہو مضمون مسلم آرٹ مطبوعہ ہمایوں جلد ۱۹۳۱ء

جین آرٹ
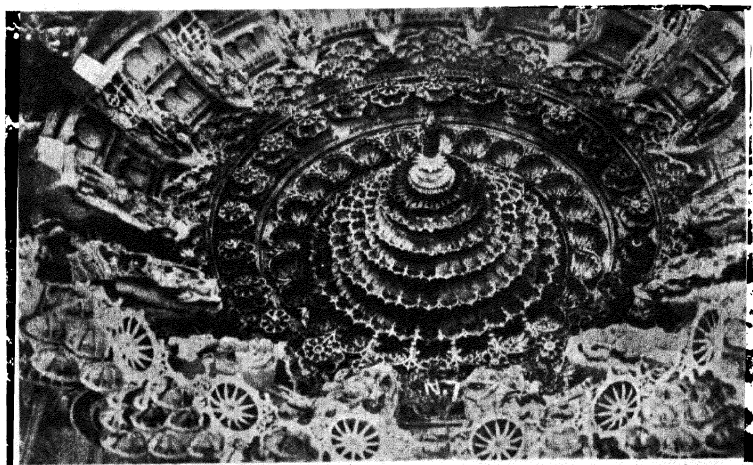
نو مولود

CALCUTTA
ART PS WORKS
LAHORE

سے ہمارے قول کی بخوبی تصدیق ہوسکتی ہے۔ یہ مندر آبادی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر جانب شمال ایک وادی نما نشیب میں واقع ہیں۔ سنگِ مرمر[۵۲] سے تعمیر ہوئے ہیں۔ باہر سے کچھ ایسے زیادہ دیدہ زیب نہیں معلوم ہوتے مگر اندر سے دیکھا جائے تو بُت تراشی اور نقاشی کے نمونے اپنی نوعیت سے نگاہ میں چکاچوند کی کیفیت پیدا کرتے ہیں یہاں ان مندروں کا مفصل حال لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان میں جو بڑا مندر ہے اس کو "دلواڑہ" کہتے ہیں۔ اس کے اندر ایک مستطیل صحن ہے جو چھوٹے چھوٹے حجروں سے گھرا ہوا ہے۔ ہر حجرے میں ایک مرمریں گدی پر ایک مرمریں بت بحالت نشست دکھلایا گیا ہے۔ ہر بت اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ گویا کوئی نذرانہ قبول کر رہا ہو۔ پجاریوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چڑھاوا اُن کے ہاتھ ہی پر رکھا جاتا ہے اور چاندی سے گھٹیا چیز مثلاً پیسے وغیرہ کو بجائے ہاتھ پر رکھنے کے پیر کے پاس رکھ دیتے ہیں غرض مندر کے چاروں طرف کم ازکم پندرہ بیس بت تو ایسے ہونگے جو اس صورت میں ظاہر کئے گئے ہیں صحن کے بیچ میں بڑی دیوی کا حجرہ ہے جس کو مندر کا قبلہ کہنا چاہئے۔ حجرے کے اندر دیوی کا بُت سنگِ سیاہ سے بنایا گیا ہے وہاں ہر قسم کا نذرانہ دیوی کے پیروں کے پاس رکھا جاتا ہے۔ ان باتوں پر غور کرنے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ عبادت خانے روحانی انکم ٹیکس آفس کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ان کے اور بہت سے رسمی اثرات ان مندروں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اکثر ایسی باتیں ہیں جو نیم مذہبی اور نیم رسمی ہیں۔ مثلاً ہاتھیوں کے مجسمے۔ پروفیسر گنگولی نے لکھا ہے کہ ہاتھی زمانۂ قدیم سے ہندوستان میں مقدس سمجھا جاتا ہے" ہاتھی کو خواب میں دیکھنا شگونِ نیک ہے۔ آپ نے اڑیسہ کے عبادت خانوں سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں مگر شاید کوہ آبو سے بڑھ کر نمایاں مثالیں ہندوستان بھر میں کہیں نہ ملیں۔ غارہائے ایلورا وغیرہ میں مجسمے بکثرت ہیں مگر دلواڑہ کے ہاتھیوں کی طرح یکجائی کی حالت میں کہیں نہیں کیونکہ دلواڑہ مندر کے ایک بڑے کمرے میں ہاتھیوں کی ایک قطار بنائی گئی ہے۔ ہر مجسمہ سخت سنگِ مرمر سے تراشا گیا ہے اور مع مہاوت و ہودج دکھلایا گیا ہے، ہاتھیوں کی یہ قطار سیاحوں کو حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ ان مجسموں کے ڈیل ڈول کا تناسب قابلِ تعریف ہے اور لطف یہ ہے کہ ہر مجسمہ زیوروں سے مخلع و مزین دکھلایا گیا ہے۔

شاید بدھ مذہب کے بعد جدید ہندو مذہب کے تمام مصوروں نے کانگڑے کی پہاڑیوں ہی کو اپنا مسکن بنایا تھا کیونکہ ہندوستان میں جدید آرٹ کی مستند شکل صرف کانگڑا اسکول ہے۔ جین آرٹ

۵۲۔ اس کی بابت یہ بھی مشہور ہے کہ "انبا دیوی نے ایک بڑے بنیا کو خواب دکھلایا کہ فلاں جگہ میرا عبادت خانہ بنوایا جائے اور یہ کہ اسی جگہ سنگِ مرمر کی کان بھی موجود ہے،

کانگڑا اسکول سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور اس بات پر شاہد ہے کہ جب مذہبی جذبات کا رنگ فنون لطیفہ میں ہلکا ہونے لگا تو رسمیات کا رنگ خود بخود گہرا ہوتا گیا۔ چنانچہ جس قسم کے پھول جس صورت میں بتوں پر چڑھائے جاتے تھے اسی صورت میں اُسی قسم کے پھول پتھروں میں بھی تراش کر دکھائے گئے ہیں۔ قدیم زمانے سے دیوتاؤں پر عموماً کنیر کے پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ دلواڑہ مندر کی دیواروں پر وہی جابجا تراشے گئے ہیں۔ جانوروں مثلاً گھوڑے اور ہاتھیوں کے لئے عموماً گیندے کے پھول وقف ہیں۔ چنانچہ گیندے کے پھول چوپایوں کے مجسموں پر ظاہر کئے گئے ہیں۔ ہاروں اور بدھیوں کا رواج ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے ہے اس لئے مندروں کی محرابوں کا کام محراب نما ہار ہی دیتے ہیں جو مستطیل نما دریچوں کے بالائی سرے پر اردو ہندسہ "۸" سے مشابہ نہایت خوبصورتی سے تراش کر دکھائے گئے ہیں۔ دلواڑہ مندر میں اس قسم کی نئی محراب بھی دیکھی گئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ والیٔ ریاست سروہی نے جن کی عملداری میں وہ مندر واقع ہے بصرف زر کثیر مرمت کر کے لگوایا ہے۔

اس مندر میں حجروں کے سامنے جو برآمدہ ہے اس کی دیواروں کے نقش و نگار اپنا ثانی نہیں رکھتے لیکن شاید اس کی چھت کا مقابلہ تو عہد قدیم کی کوئی عمارت نہ کر سکے گی[1] اس مضمون سے متعلق تصویر جو اسی نمبر میں شائع ہوئی ہے اسی چھت کی تصویر ہے۔ اس کو دیکھ کر جین لوگوں کے آرائشی جذبے کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پتھر کی کانٹ چھانٹ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آیا پتھر گلا کر سانچے میں ڈھالا گیا تھا یا یہ موم کی طرح نرم کر کے تراشا گیا تھا کہ یہ نزاکت پیدا ہو گئی۔ قدیم ہندوستان کی دستکاری کا غالباً یہ پہلا نمونہ ہے جو شاید روضۂ تاج کی دستکاری کا مقابلہ کر سکے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ قدیم عمارتوں کی دستکاری میں پھول بیل کے ساتھ ہیبت ناک تصویروں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً اژدہوں کی شکلیں، سانپ بچھو کی تصویریں، جنوبی ہندوستان میں ہاتھیوں کی شکلیں شمالی ہند میں مچھلی اور طاؤس کی تصویریں وغیرہ بہت عام نہیں۔

شاید یہ تمام شکلیں کسی جذبۂ تقدیس پر مبنی ہیں اور چونکہ پھول بیل کے ساتھ یہ شکلیں بنائی گئی ہیں اس لئے ان کو کاریگروں کے دماغی اجتماعِ اضداد پر محمول کرنا چاہئے۔ ان سے ان کے معاشرتی جذبات اور خیالی احساس کا بھی پتہ چلتا ہے اور ہمیں یہ کہنے میں بالکل پس و پیش نہیں ہوتا کہ اگر مغربی آرٹ میں ترتیب

---

[1] شاید انہی خوبیوں کی وجہ سے راجہ صاحب سروہی کی طرف سے ۲ر کا ٹکٹ مقرر ہے کہ جو مندر کو دیکھنا چاہے ٹکٹ لے کر جائے اور مندر کھلنے کے خاص اوقات بھی مقرر ہیں۔

وتناسب کا خیال نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور اسلامی آرٹ فطری آرائش کا شیدا ہے تو مشرقی آرٹ میں بقول پروفیسر گنگولی "ضرورت سے زیادہ فراخدلی بلکہ اسراف ہے" [۱]

یہ ظاہر ہے کہ ہندوستانی آرٹ کسی خاص قومی جذبے پر مبنی نہیں ہے۔ اس کا انحصار تو صرف انفرادی کوششوں پر ہے۔ لہذا انفرادی جذبہ اس پہ غالب ہے بقول پروفیسر پرسی براؤن (Percy Brown) بدھ اور راجپوت نقاشی و سنگ تراشی نے ہندوستان کی روحانی زندگی کو نمایاں کیا۔ دونوں کا مقصد مذہب ہے اور خصوصیت تصوف یا تیاگ۔ برخلاف اس کے مغل نقاشی اور کانگڑا اسکول کے آرٹ کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ تفریحی آرٹ کہنا چاہئے" [۲] یہ تفریحی عنصر جین آرٹ میں نہیں معلوم کیونکر شامل ہو گیا۔ اسی تفریحی عنصر کی وجہ سے جین آرٹ پر لفظ "فنِ لطیف" کے مفہوم کا صحیح اطلاق ہو سکتا ہے۔

بُدھ لوگوں کی طرح جین آرٹسٹ فلسفی ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ وہ تو نرے نقاش ہیں اور ان کے نقوش ہر قسم کے رنگِ تخیل سے بالکل مبرا ہیں۔ نقش روحانیت کو ظاہر کرنے کی کوشش وہ ضرور کرتے ہیں مگر اس کوشش میں وہ ایک حقیقتِ واقعی کو ظاہر کر دیتے ہیں گویا ان کا مصورانہ ضمیر جذبۂ تخیل پر غالب آ کر ان کو فنونِ لطیفہ کی اصطلاحی خاصیتوں پر قائم رکھتا ہے اور آرٹ کے اصولوں سے تجاوز نہیں ہونے دیتا۔ یہی آرٹ کی غرض و غایت بھی ہے بقول آسکر وائلڈ "آرٹ کو عیاں اور آرٹسٹ کو نہاں کرنا آرٹ کا مقصد ہے" [۳] اس اعتبار سے جین نقاش کو حقیقی آرٹسٹ کہنا بے جا نہیں۔ واقعی حقیقی حسن تو اُسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ وہ حسن ہے اگر اس میں تخیلی عنصر شامل ہو گیا تو وہ حسن کیوں رہا، وہ تو ایک قسم کی تشریح و تفسیر ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ مبالغہ جس کو اہلِ نظر ہمیشہ سے توازن و تناسب کی بربادی کا باعث سمجھتے رہے ہیں مشرقی آرٹ مشرقی ادبیات مشرقی معاشیات وغیرہ وغیرہ میں اُس کو بہت کچھ دخل رہا ہے۔ مگر جس طرح آج کل مغرب نے مشرق کو واقعیت اور اصلیت کا گرویدہ بنا لیا ہے شاید اسی طرح جین آرٹ نے بُدھ آرٹ میں تجدید کی۔

سید مقبول حسین

(احمد پوری)

---

[۱] اڑیسہ اور اس کی یادگاریں

[۲] Indian Painting

[۳] ناول The Picture of Dorian Gray.

ماہِ دَے

لُطف رونق تازگی پاکیزگی ہر شے میں ہے
ہائے کیا تاثیر کیا فرحت ہوائے دَے میں ہے

دُھوپ کیا خوش رنگ ہے سردی ہے کتنی خوشگوار
کس قدر پُر لطف خنکی ہر شجر کے نَے میں ہے

شام کیا رنگین ہے کیسی ہے نُورانی سحر
کیا ہی فرحت ناک منظر چاندنی کا دَے میں ہے

کیا نشاط افزا ہے وقتِ صبح کُہرے کا سماں
ایسے جوش و وجد کی حالت بھلا کس شے میں ہے

گھاس پر شبنم کے قطروں کی چمک تو دیکھئے
ایک بھی ایسا دُرِ خوش آب تاجِ کَے میں ہے

ساگروں کا ہو گیا ہے صاف پانی کس قدر
اس کی سی پاکیزگی کب انگبین و مَے میں ہے

نیلوفر کیا کھل رہے ہیں ہنس رہے ہیں کیا کنول
منحصر ہے کیا انہیں پر ولولہ ہر شے میں ہے

کینتکی، چمپا، چنبیلی، ناگیسر، دوپہریا
کتنے پھولوں کی مہک موجِ ہوائے دَے میں ہے

پھر سیرِ لالہ و گل کیوں نہ جاؤں بار بار
دوڑتی اک لہر سی ہر وقت دست و پے میں ہے

ہائے کیا تڑپاتی ہے شب کو ٹٹیری کی صدا
سوز و درد ایسا کہاں آوازِ ساز و نے میں ہے

صُبح کو طاؤس شاما، رات کو سارس چکور
مست ہر مُرغِ خوش الحاں اپنی اپنی لَے میں ہے

واہ کیا رُت ہے کہ دُنیا شاد ہے ساری نجیب
کوئی محوِ چنگ و نے ہے کوئی شغلِ مَے میں ہے

میر سعادت حسین نجیب

بہار

قاصد بہار کا ابھی پہنچا ہے باغ میں — جوشِ نمو نے حشر اُٹھایا ہے باغ میں

اُترے ہیں آسماں سے ملائک زمین پر — رحمت نے اپنا قافلہ بھیجا ہے باغ میں

سوئے پڑے تھے ننھے شگوفے بلا کی نیند — یہ کس نے اُن کو آن جگایا ہے باغ میں

کیوں غنچے کلبلا کے نکل آئے شاخ پر — پھولوں نے کس امید پہ جھانکا ہے باغ میں

شمشاد اور سرو نے پہنی قبائے سبز — جامہ نیا انار نے بدلا ہے باغ میں

ہیں سُرخ سُرخ پھول کہ پریاں ہیں سُرخ پوش — یا حُوریوں کا قافلہ اُترا ہے باغ میں

ہر گُل کو گدگدا کے صبا نے ہنسا دیا — اِن قہقہوں سے گُونج سی پیدا ہے باغ میں

نکہت میں اور نکھار میں جھگڑے غضب کے ہیں — دونوں میں اک مکابرہ برپا ہے باغ میں

بیٹھی ہیں شاخ شاخ پہ مسرور تتلیاں — بھونروں نے پھول پھول کو گھیرا ہے باغ میں

کیا قمریوں نے شور مچایا ہے سرو پر — کیا بلبلوں نے پھول پہ گایا ہے باغ میں

ح-ب

اے پری تو آجا۔ سہانا دن ہے، دل آرزومند ہے اور تو بادفا ہے۔ آجا، جلدی آجا۔ کیا تیرا نام لے کر تجھے پکاروں؟ کیا میں بھی اہلِ ظاہر پرست ہوں کہ دن میں پانچ دفعہ چیخ چیخ کر اس خدا کو پکاروں جو شہ رگ سے بھی قریب تر ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور سب کچھ کروں گا تیرا نام نہ لوں گا۔ میرا مذہب یاد ہے پکار نہیں۔

پرانے یونان میں ایک نوجوان محبت کی دیوی زہرہ (VENUS) کے وعدے پر کئی دن ایک جنگل میں جاتا رہا۔ زہرہ اُسے نظر نہ آئی۔ آخر وہ نوجوان اپنے آپ سے یوں ہمکلام ہوا۔

"دیویاں تو ہم انسانوں کی طرح عہد شکن نہیں ہوتیں۔ زہرہ کیوں نہیں آتی؟ کیا میں جنگل میں چڑیوں کے چہچہے سننے کے لئے آتا ہوں؟ یا اس لئے کہ سیماب رنگ جھیل میں لطخوں کی اٹھکھیلیاں دیکھوں؟ ہرگز نہیں۔ مایوسی انسان کی قسمت سہی مگر زہرہ کو آنا چاہئیے۔" اپنے آپ سے یہ باتیں کرتے ہوئے نوجوان جنگل سے چل نکلنے کو تھا کہ جھیل کے طوفان میں سے دو پیر اک نمودار ہوئے۔ نوجوان کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ ہمہ تن حیرت تھا کہ کیا محض بیخبری سے ایک فانی انسان عنقریب دو غیر فانی ہستیوں کا ہم جلیس ہونے کو ہے۔ لہروں کو چیرتی ہوئی ہاتھ میں ہاتھ دئے دو نوجوان لڑکیاں نکلیں۔

نوجوان کا دھڑکتا دل اس خیال سے کہ نہیں یہ تو انسان ہیں قابو میں آگیا۔ پہلے جو ڈر کے مارے آنکھیں نیچی کر کے ٹھٹک کر رہ گیا تھا وہ حالت نہ رہی۔ ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دونوں لڑکیاں لہروں سے نکل کر درخت کے نیچے ایک دوسری سے گویا قد و قامت کا موازنہ کرا رہی تھیں ایک دوسری کو ناپنے لگیں اور جھکیں کہ زمین سے کوئی لمبا سا تنکا اٹھا لیں اور اسی سے اپنے آپ کو ناپیں۔

اتنے میں اس نوجوان کے پاؤں تلے ایک خشک پتہ پسا اور اس آہٹ پر ان لڑکیوں میں سے وہ جو اپنے آپ کو نپوا رہی تھی کہنے لگی "تم سے کام ہے۔ یہاں آؤ" اور پھر یوں بولیں۔

ہم دونوں یونیا سے تیر کر آئی ہیں اور ہمارا معاہدہ تھا کہ جو مرد پہلے ملے اُسی سے فیصلہ کرائیں کہ کس کا اُبھار زیادہ حسین ہے مگر کوئی ادھر ادھر نظر نہ آیا تو ہم خود ایک دوسرے کو ناپنے لگ گئیں۔

یونان کا یہ پرانا قصّہ لمبا ہے۔ محبت کی دیوی نے اپنی شکل ایک لڑکی کو دے دی۔ گویا ایک کار آمد

روپ میں اُسی منتظر نوجوان سے آملی۔ یہ نوجوان وہی سنگ تراش تھا جس کا بنایا ہوا Venus (زہرہ) کا مجسمہ دنیا بھر کی حُسن پرست نگاہوں کا کعبہ ہے۔

اے میری پری۔ میں سنگ تراش نہیں ہوں۔ میرے پاس صرف ہلکا سا لفظوں کا جادو ہے اتنا ہلکا کہ تجھ پر نہیں چلتا۔ اتنا بھاری کہ میں اس کے بوجھ سے ہل نہیں سکتا۔

اے مخملیں آنکھوں والی پری! وہ شعاعیں جن سے دماغ روشن ہوں تیرے لمبے سیاہ بالوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ خوشبو جو خوشبو بھی ہے اور شوخ قوس قزح بھی تیرے تبسم سے افشاں ہے۔

یونان کے قصے کو کیا کروں۔ میں جو اپنے معبود کو نہیں مانتا پرانے حسن وعشق پر کیسے ایمان لے آؤں تو اپنی طرح کی پہلی ہے۔ نرالی ہے اور حسین ہے تو حُسن پرور ہے اور چنبیلی ہے تو گلاب ہے۔ پیاری! دنیا کے زرد پھول میری ارغوانی پرستش کی کیا تاب لائیں گے؟

آ کہ میں تجھے یاد کرتا ہوں۔

فلک پیما

غزل

سینے میں اُن کا نور چھپائے ہوئے تو ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں

تیرے گناہگار، گنہگار ہی سہی
تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں

اللہ ری کامیابیٔ آوارگانِ عشق
خود گم ہوئے تو کیا اُسے پائے ہوئے تو ہیں

ہاں! کیا ہُوا وہ حوصلۂ دیدِ اہلِ دل
دیکھو نہ وہ نقاب اٹھائے ہوئے تو ہیں

ذکر اُن کا گر زباں پہ نہیں ہے تو کیا ہُوا
میرے نفس نفس میں سمائے ہوئے تو ہیں

یوں تجھ کو اختیار ہے تاثیر دے نہ دے
دستِ دُعا ہم آج اُٹھائے ہوئے تو ہیں

رونا یہ ہے کہ نالۂ غم میں اثر نہیں
ہاں ہاں وہ آسمان پہ چھائے ہوئے تو ہیں

مٹتے ہوؤں کو دیکھ کے کیوں رو نہ دیں مجاز
آخر کسی کے ہم بھی مٹائے ہوئے تو ہیں

مجاز ہارونی رودلوی

ایک خط

پیارے سلامت، کئی ہفتوں کی پیوستہ تنہائی، مسلسل عزلت اور مستقل گوشہ نشینی کے بعد میں کل شام اپنے کلبۂ احزاں سے، جو شعاعِ مسرت و شعاعِ آفتاب دونوں سے محروم ہے، نکلا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے پیشِ نظر کوئی خاص مقام تھا یا نہیں؛ بہرحال گذشتہ سولہ سال سے چونکہ اسی خطہ کی خاک چھان رہا ہوں اس لئے قدم خود بخود ایک راہ پر چلنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ میں اس سڑک پر جا رہا تھا جس کو ہم ہیڈن روڈ کہا کرتے تھے اور جسے اب میونسپل کمیٹی کے تصرفات نے دل محمد روڈ کا نام دے رکھا ہے۔ دماغ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی شگفتگی سے معرا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مزدوروں کا ایک جمِ غفیر کدالوں، بیلچوں اور پھاوڑوں سے مسلح ایک مکان کو گرا رہا ہے۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ جو مکان گرایا جا رہا ہے وہ یادش بخیر النجد ہے ع

سلامٌ علی نجدٍ و من حلّ بالنجد

آہ کچھ نہ پوچھو کہ اس منظر کو دیکھ کر دلِ حزیں کی کیا کیفیت ہوئی۔ دل جو حوادثِ روزگار سے پہلے ہی چھلنی ہو چکا تھا اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا اور میں قدموں میں سرعت پیدا کر کے آگے نکل گیا لیکن تمام راہ یاس و حرماں، کرب و اضطراب اور رنج و الم کے سیاہ بادل قلب و دماغ پر چھائے رہے۔ اگرچہ عرصۂ دراز سے النجد بیکانیری مزدوروں، چماروں اور دھوبیوں کا مسکن بن رہا تھا لیکن اس کس مپرسی کے عالم میں بھی وہ ان روایات کا حامل، ان داستانوں کا مرکز اور ان ہنگاموں کا خزینہ تھا جن کی یاد لاہور کی اہلِ دل آبادی کے ایک قابلِ قدر حصہ کا سرمایۂ نشاط و متاعِ حیات ہے۔ میرے دل کی بجھی ہوئی چنگاریاں پھر چمک اٹھی تھیں، ماضی کے بھولے بسرے خواب مجسم صورت اختیار کر کے پھر میرے سامنے آ گئے تھے اور روح کے خوابیدہ نغمے پھر بیدار ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ سرمایہ داری اس مکان کو گرا کر اس کی بنیادوں پر ایک عظیم الشان و سر بفلک عمارت تعمیر کرے گی جس کے طفیل اُسے ہر ماہ سیم و زر کا ایک ڈھیر ملا کرے گا۔ لاہور کی آنے والی نسلیں، نہیں، نہیں، موجودہ نسلیں بھی، کہ آج کون ایسا دیوانہ ہے جو تاج محل کو دیکھ کر ایک غریب کے جھونپڑے کو تصور میں لانا پسند کرے گا، بھول جائیں گی کہ یہاں ایک ایسی چار دیواری بھی تھی جہاں اِس زمانہ میں جب کہ تمدنِ جدید کی برکات پانی کی طرح عام ہو رہی

ہیں بجلی کی روشنی نہ تھی۔ جہاں چند دیوانے علی الرغم مصائبِ حیات اکٹھے ہو کر زندگی کی الجھنوں کو مسرت و شادمانی کے قہقہوں میں فنا کر ڈالتے تھے۔ جس کی کشش کا یہ عالم تھا کہ بٹالہ، گوجرانوالہ، پسرور، شاہجہانپور اور خدا جانے کہاں کہاں کے افراد کھنچے چلے آتے تھے۔ جس کی مٹی کو یہ تاثیر میسر تھی کہ خاک کو سونا بنا دیتی تھی۔

الغرض چشمِ ظاہر بیں کے لئے مٹ گیا لیکن اب بھی ایک جماعت ایسی ہے جس کے لئے زمین کا یہ ٹکڑا ہمیشہ مقدس و معزز رہے گا۔ یہ مقام مذہبِ عشق کے پیروؤں کا کعبہ بنے گا جہاں سال کے کسی خاص حصہ میں ہندوستان کے دور و دراز خطوں سے "یاران طریقت" زیارت کے لئے پہنچا کریں گے۔ یہ زیارت گاہِ عاشقان و سجدہ گاہِ دلفروشاں ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کی فضا اب بھی یارانِ طریقت کے قہقہوں سے معمور ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ میں عشق کا سوز اور محبت کی بے کسی رچی ہوئی ہے۔ یہ وہ عمارت ہے جس کے در و دیوار میں "یاران طریقت" کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ وہ خطہ ہے جس نے سوز و سازِ حیات کے ایسے عدیم النظیر منظر دیکھے ہیں کہ مادرِ گیتی ہزاروں کروٹیں بدلنے پر بھی ان کی مثال پیدا نہیں کر سکتی۔ آہ یہ وہ مکان ہے جس کے ایک مختصر سے کمرے میں عاشق مجسم عجز و فتادگی بن کر رئیس المتغزلین حسرت موہانی کے نغمہ ہائے محبت گایا کرتا تھا جس میں سلامت کبھی رندِ لاابالی بن کر غالب کی غزلیات پڑھتا اور کبھی صوفیٔ پاکباز بن کر فرقانِ حمید کی مقدس آیات کی تلاوت کرتا تھا آہ یہ وہ مقام ہے جہاں رشید نے نفس کو اور اس کے ساتھ دنیا کو بھی فریب دینے کے لئے فلک شگاف قہقہے لگائے ہیں جہاں آغا عبدالرحیم نے سلسلہ کی بے معنی رٹ لگا کر یارانِ طریقت کے تمسخر کا سامان بہم پہنچایا ہے جہاں رؤف نے فلسفۂ حیات سے ناواقف ہونے کے باوجود حقائقِ حیات پر بصیرت افروز تقریریں کی ہیں جہاں عظیم جیسے محرمِ جذباتِ لطیفہ انسان نے بھی قیس و فرہاد کی پیروی کے عہد باندھے ہیں اور جہاں اُس طرفہ تماشا شخص اقبال نے اپنی عبوست و فرسودگی کے باوجود یارانِ طریقت کی یورش سے مجبور ہو کر ہنگامہ آرائی کی ہے۔ آہ یہ وہ مکان ہے جہاں ہر نشست میں مصائبِ حیات کا رونا رویا جاتا تھا جہاں ہر مجلس میں دادِ عشرت دینے کے باوجود زندگی کی تکالیف پر نوحہ خوانی کی جاتی تھی حقیقت یہ ہے کہ ؎

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تیری انجمن میں تھی

سعدی شیرازی نے انہدامِ بغداد پر مرثیہ لکھا، دولتِ غرناطہ کی تباہی پر ابن خلدون نے نوحہ

خوانی کی۔ دہلی کے اجڑ جانے پر داغ نے کون کون سے آنسو بہائے۔ اقبال نے دوران سفر میں سسلی کو دیکھ کر چیخیں ماریں لیکن النجد آہ النجد کی بربادی پر میرے درماندہ قلم کو خونچکانی کرنی پڑی ؎

مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

گذری ہوئی صحبتوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے گوالمنڈی کا نمبر ۲۵ ابھی موجود ہے۔ یوٹنگ ہال کا کمرہ نمبر ۱ ابھی باقی ہے، ریلوے روڈ پر فیروزپور لاج بھی کھڑی ہے گویا ع

عالم میں ٹکڑے ٹکڑے میری داستاں کے ہیں

مگر النجد کو جو خصوصیت حاصل تھی وہ اُسی کا حصہ تھی۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ یاران طریقت کا انتشار و افتراق ختم ہو۔ کیا ابھی آسمان کے ترکش میں کوئی تیر باقی ہے جس کی پذیرائی کے لئے ہمیں دل و جگر پیش کرنے پڑیں۔ کیا النجد کا انہدام ایسا واقعہ نہیں کہ یارانِ طریقت، ایک مرتبہ ہی سہی، باہم مل کر دل کے پھپھولے پھوڑلیں ؟ اگر اس حادثۂ فاجعہ سے بھی ہمارے سکوتِ بے جا میں کوئی تحرک پیدا نہ ہوا تو ہمیں آج ہی اپنی فاتحہ پڑھ لینی چاہیئے کیونکہ دانا وہی ہے جو ہوا کا رُخ پہچانے۔

نیاز آگین **عاشق**

محبّت

محبت ایک پاک جذبہ ہے جو ہر متنفس کے دل میں خدا کی خاص ودیعت ہے۔
محبت کو حبیب اور محبوب سے ایسا تعلق ہے جیسے تاگے کو موتیوں سے۔
محبت ایک ایسی الٰہی سلطنت کے قلم سے زیادہ طاقتور ہے جس کی ایک جنبش کسی ویرانہ کو آباد اور کسی آبادی کو برباد کر دینے کیلئے کافی ہے
محبت دو دلوں کے درمیان ایک واسطہ ہے، شیشہ سے زیادہ نازک اور لوہے کی کڑیوں سے زیادہ مضبوط۔
محبت کا امتحان ہر وقت، ہر گھڑی، ہر آن ہوتا ہے۔
محبت ہوتی ہے کی نہیں جاتی۔
محبت ایک بیش بہا جوہر ہے جو باوجود پاس رہنے کے ہر وقت دستیاب نہیں ہوتا۔
محبت کی مستحق وہی ذاتِ لازوال ہے جس نے محبت کو پیدا کیا اور جس نے سب سے پہلے انسان سے محبت کی۔
محبت تکمیلِ انسانیت ہے۔

(ترجمہ) **عبد الاحد شرف الدین پوری**

لُولُو کی فتح

سوفیا نے نگاہیں اپنے کام سے نہ اُٹھائیں اور اُس کی نازک اُنگلیاں باریک لیس پر بدستور اُڑتی چلی گئیں۔ لیکن لولو کمرے میں گھوم رہی تھی۔ کبھی وہ طاقچوں میں پڑی ہوئی چیزوں کو اِدھر اُدھر سرکاتی، اور کبھی کوئی دراز کھول کر بلا ضرورت اس میں جھانکنے لگتی۔ یہ ظاہر تھا کہ وہ یا تو کچھ کرنا چاہتی ہے یا کچھ کہنا، لیکن اپنی بہن کے سنجیدہ انداز کو دیکھ کر ہچکچاتی ہے۔ اُس نے ایک گیت گنگنانا شروع کیا ایک شعر بلند آواز سے پڑھا لیکن سوفیا تو گویا سن ہی نہیں رہی تھی۔ اب لولو نے جسے فطرت سے صبر کا کچھ زیادہ حصہ نہیں ملا تھا بے باکانہ سوال کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی بہن کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اُس نے کہا:۔

"سوفیا، تمہیں معلوم ہے مادامیزل ژانت نے مجھ سے کیا کہا ہے؟"

"یقیناً کوئی بڑی دلچسپ بات نہیں ہوگی۔"

"اب یہ ایک ایسا خشک اور سرد جواب ہے کہ انسان کو گرمی کے موسم میں بھی شل کر دینے کے لئے کافی ہے! برفانی آپا، تم یہ سرد مہری کہاں سے لاتی ہو؟"

"لولو تم سچ مچ ایک بچی ہو!"

"میرے دل کی ملکہ، اسی معاملہ میں تم غلطی پر ہو۔ میں بچی نہیں ہوں، کیونکہ اب میری شادی ہونے والی ہے۔"

"کیا؟"

"اور یہی بات تھی جو ژانت نے مجھ سے کہی۔"

"کیسی مہمل باتیں کرتی ہو! میں تو خاک بھی نہیں سمجھی کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"بہت اچھا، اب میں تمہیں ایک ڈرامے کی شکل میں ساری بات سناتی ہوں۔ یہ ایک "بیانیہ" ہے۔ لیکن کیا تمہاری سنجیدہ آپا اپنی پوری توجہ منعطف فرمائے گی؟"

"ہاں، ہاں، مگر جلدی کرو۔"

"وقت گھوڑ دوڑ کا دن۔ جگہ: زحل کا میدان۔ تم وہاں نہیں تھیں۔ تم اپنی "جادودانی" کتابوں میں منہمک تھیں۔"

"اگر تم موضوع سے اس قدر دُور جانے لگیں تو بس، میں نہیں سنوں گی۔"

"سوفیا خدا کے لئے سنو۔ یہ راز مجھے ہلکان کئے دیتا ہے، مجھے مارے ڈالتا ہے۔"

"کیا تم پھر شروع کر رہی ہو؟"

"ہاں، اب میں ٹھیک سناؤں گی۔ اچھا، تو گھوڑ دوڑ کے دن ہم سب سے اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پاؤلو ودیلو آیا اور اُس نے رابرٹو مانٹی فرینکو نامی ایک وجیہ نوجوان سے ہمارا تعارف کرایا۔ رسمی تسلیم و تعظیم کے بعد وہ دونوں ہمارے بالکل پیچھے بیٹھ گئے۔ دوڑ شروع ہونے سے پہلے ہم نے آپس میں مختصر سی گفتگو کی۔ تمہیں معلوم ہے میں "گارگن" کے حق میں تھی، حالانکہ میں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ بڑی حق ناشناس ہے اور سچ تو یہ ہے کہ انسان کو حق ناشناس حیوانوں سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔ گرد و غبار کے ایک بادل نے گھوڑوں کو بالکل چھپا دیا۔ میں نے کہا "گارگن جیت گئی"۔ مانٹی فرینکو مسکراتے ہوئے بولا "نہیں، لارڈ لودیلو!" اُس کی تردید پر مجھے بڑا غصہ آیا، لیکن وہ مُسکراتا رہا اور تردید کرتا گیا؛ یہاں تک کہ ہم نے شرط لگالی۔ کوئی آدھ گھنٹے کی پریشانی اور دھڑکے کے بعد آخر مجھے معلوم ہوا کہ گارگن دھوکا دے گئی ــــــ کہ میں ہار گئی اور مانٹی فرینکو جیت گیا۔ میں کس وہم میں تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں شرط کا روپیہ ابھی ادا کرتی ہوں، لیکن اُس نے کہا آپ کی نوازش ہے ابھی اس کے لئے بہت وقت پڑا ہے۔ جب دوسری مرتبہ وہ مجھ سے ملا تو میں نے اُس پر ایک مستفسرانہ نگاہ ڈالی اور وہ ایک عجیب پُراسرار انداز میں جھکتے اور مسکراتے ہوئے خاموش رہا۔ غرض کہ تھیئٹر ہو یا کوئی اور جگہ اس کا یہی طرزِ عمل تھا۔ مجھے بڑی حیرانی لاحق ہوئی۔ رابرٹو خوبصورت ہے، اُس کی عمر چھبیس سال ہے، اور آج صبح اُس کا باپ جو میرا خسر ہونے والا ہے تقریباً دو گھنٹے تک تنہائی میں اماں سے باتیں کرتا رہا۔"

"اچھا!"

"اوہو، حاضرین توجہ فرما رہے ہیں؟ ہاں، تو مجھے اُس کے آنے کی خبر ژانت سے معلوم ہوئی۔ چنانچہ شادی کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ صرف ایک ذرا سی بات کا فیصلہ باقی ہے کہ مجھے میربلد کے دفتر میں کب جانا ہے، اور میرے گون کا رنگ آسمانی ہو یا سفید؟ اور میں طرہ دار ٹوپی پہنوں یا دوسری؟"

"تم تو بھاگی جاتی ہو!"

"بھاگی؟ کیوں، تم ہی بتاؤ رکنے کی کونسی بات ہے؟ رابرٹو اور میں ایک دوسرے سے بے حد محبت

کریں گے۔ ہمارے والدین مطمئن ہیں کہ ــــــــ"

"اور یوں تم ایک شخص سے شادی کر لو گی؟"

"یوں کے کیا معنی؟ یہ تو ذرا وسیع المعنی سا لفظ ہے"

"یعنی اُس کو جانے بغیر، اُس سے محبت کئے بغیر؟"

"لیکن میں تو اُس کو جانتی ہوں، میں اُسے گھوڑ دوڑ کے موقع پر اور اس کے بعد کئی بار سیر میں ملی ہوں میں اُس سے محبت کرتی ہوں اپرسوں ابھی مجھ سے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا گیا کہ میں اس کے دیدار سے محروم رہی اور خودکشی کی کوشش میں کھانے کے بجائے کافی کی تین پیالیاں پی گئی"

"اور وہ؟"

"وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس لئے ظاہر ہے کہ مجھ سے محبت کرتا ہے!" لولو نے یہ بات ایک فاتحانہ انداز میں کہی لیکن اُس نے دیکھا کہ سوفیا کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ اُسے اپنی اس بے باکانہ طرزِ گفتگو پر سخت ندامت ہوئی اور بہن پر جھکتے ہوتے اس نے پیار کے لہجے میں کہا:

"کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے؟"

"نہیں بہن، نہیں، تم ٹھیک کہتی ہو۔ جب کوئی محبت کرتا ہے تو وہ شادی ہی کرتا ہے۔ محبت کو بیدار کرنا مشکل ہے۔" یہ کہہ کر سوفیا نے زیر لب ایک آہ کی۔

لولو نے ذرا برافروختہ ہو کر کہا "محبت کو بیدار کرنا، محبت کو بیدار کرنا! سوفیا، بہت آسان ہے۔ لیکن تمہاری طرح جب کسی کے ماتھے پر شکن ہوں، آنکھیں اُداس ہوں، ہونٹ بے تبسم ہوں، جب کوئی ایک کونے میں دبک کر سوچنا شروع کر دے حالانکہ ساری دنیا تفریح و تفنن میں مشغول ہو، جب کوئی ہنسنے کھیلنے اور مسرتوں کے خواب دیکھنے کی بجائے کتابوں میں سر مارتا پھرے! اور جب کوئی جوانی ہی میں بوڑھا بن بیٹھے اور اپنے دل میں تفکرات کی پرورش شروع کر دے تو اُس سے محبت کرنا واقعی مشکل ہو جاتا ہے۔"

سوفیا نے اپنا سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کے ہونٹوں میں ایک خفیف سی لرزش پیدا ہوئی جیسے وہ ایک سسکی کو ضبط کر رہی تھی۔

لولو نے پوچھا "کیا میں نے پھر تمہیں رنج پہنچایا ہے؟ یہ میں نے اس لئے کہا تا کہ دیکھوں کہ تم سے بھی کسی کو پیار ہے، دیکھوں کہ ہر طرف سے تمہیں محبت گھیرے ہوئے ہے۔ دیکھوں کہ تم دُلہن بنی ہوئی ہو ــــــ آہ، کیا ہی اچھا ہو کہ ہم دونوں کی شادی ایک ہی دن ہو جائے!"

"لولو تم بھولے پن کی باتیں کرتی ہو، میں ہمیشہ تنہا رہوں گی۔"

میری جان نہیں، ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ تمہارا یہ خیال نہایت ظالمانہ ہے۔ اگر رابرٹو ایک محبوب انسان ہے تو ممکن ہے اُس کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہو۔ کم از کم میری یہ آرزو ہے!"

اُسی وقت اُن کی ماں سیر کا لباس پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ لولو نے پوچھا "اماں تم کہیں باہر جا رہی ہو؟"

"ہاں بیٹی میں وکیل کے ہاں جا رہی ہوں"

"اوہو! وکیل کے ہاں۔ اماں تمہیں تو ہر وقت کاروبار کی پڑی رہتی ہے"

"بیٹی تمہیں اِس کاروبار کے متعلق جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ سوفیا تم تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ آؤ"

"اور کیا سوفیا کو بھی وکیل کے ساتھ کوئی بڑا ضروری کام ہے؟"

"لولو، تم متانت کب سیکھوگی؟"

"بہت جلد، اماں، تم دیکھ لوگی"

اس نے اپنی ماں اور بہن کے گزرنے کے لئے دروازہ کھول دیا، اور جھک کر نہایت ادب سے کہا "مادام! مادامیزل!" جب وہ کمرے سے نکل گئیں تو دہلیز میں کھڑے ہو کر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا:

"تم چھپ چھپ کر باتیں کرو۔ میں یہی سمجھوں گی کہ مجھے کچھ علم نہیں"

رابرٹو مانٹی فرنیکو کو غور و فکر کی عادت نہ تھی، غور و فکر کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہ تھا۔ اُس کے دن دعوتوں، ملاقاتوں اور تفریحی اشغال میں صرف ہو جاتے اور راتیں لولو کی خوشگوار معیت میں گذر جاتیں۔ اسی کے ساتھ بعض غیر دلچسپ فرائض کی طرف بھی اسے توجہ نہ دینی پڑتی: مثلاً وکیل سے گفتگو، معاہدوں کی تکمیل، بعض پرانے قرضوں کا تصفیہ، پھر ان کے علاوہ گھر بار کی ترتیب اور شادی کے سفر کی تیاریاں۔ اُسے بمشکل آدھ گھنٹہ مطالعہ کے لئے اور پندرہ منٹ "اپنے کانفے" کے دروازے پر ٹہلنے کے لئے ملتے سو رابرٹو کو کبھی کسی نے گہری سوچ میں پڑے ہوئے نہیں دیکھا، نہ اُسے کسی نے کسی معاشرتی مسئلہ کو حل کرنے میں مصروف پایا۔ اُس کی فطرت نہ غم سے مانوس تھی نہ شہرت کی آرزومند، بلکہ ایسی چیزوں سے بہت بالاتر تھی اور بہت سوں کے لئے قابلِ رشک

لیکن آج وہ ہاتھ میں ایک کتاب لئے آرام کرسی میں کچھ اس انداز سے لیٹا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اس نے پڑھنے کا پختہ ارادہ کر رکھا ہے۔ کتاب بھی دلچسپ تھی لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ بالکل کھویا کھویا سا نظر آتا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی حالت کچھ اس سے بھی بُری تھی۔ اُس پر ایک کیفیتِ اضطرار و اضطراب طاری تھی۔ کتنی ہی دیر گذر گئی مگر اس نے کوئی ورق نہ الٹا، کیونکہ دو ہی سطریں پڑھنے کے بعد اُسے الفاظ اپنی

جگہ چھوڑتے، رقص کرتے، درہم برہم ہوتے اور غائب ہوجاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ایسی بے اختیاری کے عالم میں رابرٹو نے خیالات کی ایک نامعلوم سرزمین کا سفر کر لیا۔

"ابا مطمئن ہیں، خالاؤں نے مجھے دعا لکھ بھیجی ہے، میری عمزاد بہنیں ناراض ہیں، میرے کالج کے دوست مجھے طنزیہ پیرائے میں مبارک باد دیتے ہیں، میرے سچے دوست خوش ہو کر میرے ہاتھ کو دباتے ہیں۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ میرے لئے یہ شادی اچھی ہے۔ میں انکار نہیں کرسکتا: لولو نہایت خوبصورت ہے۔ جب وہ اپنی شریر آنکھیں مجھ پر گاڑ دیتی ہے اور جب وہ ہنستی ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے سفید دانت نظر آنے لگتے ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے ننھے سے خوبصورت سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لوں اور پے در پے چومتا ہی جاؤں۔ اور اس کی طبیعت بھی کتنی اچھی ہے کیسی زرّیں سیرت کی وہ مالک ہے! ہر وقت مسرور، ہر وقت خوش ہنسی مذاق کے لئے تیار، زندہ دل، شوخی اور شرارت سے بھری ہوئی، کبھی اداس نہ ہونے والی۔ ہم دونوں کی خوب گزرے گی۔ زیادہ متانت مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتی، خصوصاً اُن لوگوں میں جن سے مجھے محبت ہو۔ مجھے ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو کوئی نامعلوم روگ ہے روگ جس سے میں ناواقف ہوں، جس کا مداوا مجھ سے نہیں ہوسکتا، یا جس کا باعث نادانستہ طور پر میں خود ہوں۔ لولو کی بہن سونیا ہی کو لے لیجئے، میری طبیعت اُس کی متانت اور بے حسی کو دیکھ کر گھبرانے لگتی ہے۔ جب کبھی وہ سامنے آتی ہے میری ساری شگفتگی مفقود ہوجاتی ہے اور مسکراہٹ کا نشان تک میرے ہونٹوں پر باقی نہیں رہتا۔ اور خواہ بہار کی سُہانی دھوپ ہی کیوں نہ نکل رہی ہو میرے لئے خزاں کا بزخانی منظر پیدا ہوجاتا ہے۔ اُس وقت مجھ میں اتنی جرات بھی باقی نہیں رہتی کہ لولو سے مذاق کے طور پر ہی کہوں کہ سونیا کی متانت نے ہماری ساری مسرت کو لُوٹ لیا۔ میرے چہرے سے وہ اپنے ناخوش گوار تاثرات مطالعہ کرچکی ہوگی، کیونکہ جب وہ مجھ سے باتیں کرتی ہے تو میری طرف دیکھتی نہیں۔ مجھ سے مصافحہ نہیں کرتی اور میرے سوالات کا جواب کم از کم الفاظ میں دیتی ہے۔ وہ سمجھ گئی ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا۔ شاید وہ میری موجودگی میں بیزار رہتی ہے۔

لولو ہمیشہ ہنستی رہتی ہے۔ وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اُس نے کبھی کوئی سنجیدہ بات مجھ سے نہیں کی، اور اگر کبھی وہ کرنا بھی چاہتی ہے تو ہمیشہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ تکلف برطرف مجھے اُس سے کوئی اندھی محبت نہیں ہے، اور یہ بہتر ہے۔ ادھر میرا یہ حال ہے کہ میں نے دو نظریے اپنے دل میں مستقل طور پر قائم کر لئے ہیں۔ اول تو یہ کہ میاں بیوی کی طبیعتیں آپس میں ملنی چاہئیں، دوسرے یہ کہ محبت کو از خود زندگی کے ساتھ شروع نہ کیا جائے۔ ہم دونوں کی یہی حالت ہے، اس لئے لولو کی اور میری شادی نہایت خوشگوار ثابت ہوگی۔ شادی کے بعد ہم اٹلی کے چپے چپے کی سیر کریں گے، ہمیں کسی قسم کی جلدی نہ ہوگی، جہاں جی چاہے گا ٹھہر

جائیں گے، ہر مقام کو دیکھیں گے، ہر چیز سے لطف اٹھائیں گے۔ ہم تین مہینے اسی طرح سیر و تفریح میں گزار دیں گے، نہیں، مگر تین مہینے کافی نہ ہوں گے بلکہ چار مہینے، میں لولو کو سونیا کی غم انگیز صحبت سے ایک خاصی مدت تک دور رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں، اس لڑکی کو اس عمر میں اتنی متانت سجتی ہے؟ وہ تئیس برس کی ہوگی۔ وہ کچھ بدصورت بھی نہیں۔ اُس کی آنکھیں نہایت خوبصورت ہیں، اور وضع قطع سے وہ ایک ملکہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ ذرا خوش اخلاق بھی ہوتی تو اُس سے مل کر طبیعت کتنی خوش ہوتی۔ میں دعوے سے کہتا ہوں وہ تمام عمر ہی تنہا رہے گی۔ شاید اسے کوئی پوشیدہ غم ہے، شاید کوئی محبت کا معاملہ ہے، ناکام محبت کا۔ میں اُس کی اس سنجیدگی کی وجہ ضرور معلوم کروں گا۔ کبھی تنہائی میں لولو سے اس کے متعلق ضرور پوچھوں گا۔

"لولو کھانڈ کے کھلونوں کی بہت شائق ہے، اس نے یہ بات مجھے اُسی دن بتا دی تھی جب میں دوسری دفعہ اُن کے گھر گیا تھا۔ وہ ان کو کس مسرت سے کھاتی ہے! کس طرح وہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں کے درمیان غائب ہوتے چلے جاتے ہیں، اور کچھ دیر کے بعد جب وہ ختم ہو جاتے ہیں تو وہ کس طرح جھوٹ موٹ منہ بسورنے لگتی ہے۔ آہ وہ کتنی پیاری لڑکی ہے، پیاری، پیاری، پیاری! ایک دن کس طرح دبی ہوئی سی آواز میں وہ مجھے بتا رہی تھی کہ جب بادل گرجتا ہے تو میں ڈر جاتی ہوں اور اپنا منہ تکیوں کے نیچے چھپا لیتی ہوں، پھر کہتی تھی بڑی دیر سے میری خواہش ہے کہ میرے پاس ایک بہت لمبا سیاہ مخمل کا گون ہو جس کے گریبان اور آستینوں پر سفید جھالر لگی ہوئی ہو۔ ایک دفعہ کہنے لگی کہ میں اپنے دل میں نہایت شدید رشک رقابت پیدا کر دوں گی۔ اور میں ایک چھوٹا سا خنجر خریدوں گی جس کے دستے میں سونا لگا ہوا ہوگا۔ اور اُس کے ساتھ میں انتقام لوں گی جب بچوں کی طرح ایک فیصلہ کن انداز میں وہ ایسی بے تکی باتیں کرتی ہے تو کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر بعض اوقات سونیا بھی ہنسنے پر مجبور ہو جاتی ہے، اور اُس کا چہرہ بھی روشن ہو جاتا ہے۔ سونیا وہ سونیا جس کو لولو کی اصلیت کبھی معلوم نہ ہو سکے گی۔"

کتاب اُس کے ہاتھ سے فرش پر گر پڑی، گرنے کی آواز سن کر وہ چونک پڑا اور حیران ہو کر اس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے وہ اپنے آپ کو پہچاننے کے ناقابل ہو۔ یہ حقیقت میں وہی تھا، رابرٹو مانٹی فرینکو، جو تصورات میں کھو گیا تھا۔

شام ایک تیرہ فام بادل کی طرح چھائے جا رہی تھی، سونیا بالاخانے کی کھڑکی میں کھڑی پُرشور بازار میں ہجوم کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ یہ ایسا وقت تھا جب وایا ٹولیڈو گزرنے والوں کے لئے ذرا دشوار ہو جاتا ہے، کیونکہ چھوٹی بڑی گاڑیاں اُس وقت اس طرح چلنے لگتی ہیں جیسے ایک دریا بہہ رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ یکایک اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا، اس نے اپنے سر کو ذرا سا جھکایا، پھر اس کے منہ پر زردی

چھاگئی اور وہ پلٹ کر کمرے میں آگئی۔ ایک منٹ کے بعد لولو دروازوں کو بجاتی، کرسیوں کو الٹ پلٹ کرتی جلد جلد اندر داخل ہوئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو، ڈونا سوفیا سینٹ انجیلو؟ پڑھ رہی ہو؟"

"ہاں میں پڑھ رہی تھی۔"

"اور کھڑکی تک آنے کی تم نے تکلیف گوارا نہیں فرمائی؟"

"اور اگر میں فرماتی؟"

"چلو چھوڑو! البسینا میرا نیا گون لے کر آئی ہوئی تھی۔ اس لئے مجھے اوپر رہنے کی مجبوری تھی، ورنہ میں سچ کہتی ہوں اس تمام عرصے میں بے صبری سے میں کانپتی رہی کیونکہ میں یہاں موجود رہنا چاہتی تھی۔ کل شام میں نے رابرٹو سے کہا تھا کہ اپنا سیاہ اوورکوٹ پہننا، اور "سیلام" کو گاڑی کے آگے جوت کر ساڑھے چھ بجے یہاں سے گزرنا اب کیا معلوم ہے کہ اس نے میری بات مانی بھی یا نہیں!"

"رابرٹو اپنی گاڑی میں یہاں سے گزرا تھا اور وہ سیاہ اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا۔

شاباش! تم نے یہ کیسے معلوم کیا؟ میرا تو خیال ہے تم پڑھ رہی تھیں؟"

"میں کھڑکی میں تھی۔"

"اور تم نے اُس کو پہچان لیا۔ حالانکہ تم کبھی اس کی طرف دیکھتی تک نہیں! تعجب ہے! ۔۔۔ اُس نے تم کو سلام کیا تھا؟"

"ہاں۔"

"اُس نے کس طرح اپنی ہیٹ اُٹھائی تھی؟"

"جس طرح عام طور پر اٹھایا کرتا ہے۔"

"اور تم بھی جواب میں ضرور جھکی ہو گی؟"

"کیا تم مجھے اتنا ہی بد اخلاق سمجھتی ہو کہ میں نے سلام کا جواب نہ دیا ہو گا؟"

"کم از کم تم نے مسکرا کر تو ضرور جواب دیا ہو گا؟"

"نہیں، مسکرانا میں نہیں جانتی۔"

"سوفیا تم بڑی ظالم ہو۔ اور کل رابرٹو بھی تمہارے متعلق باتیں کرتا رہا۔"

"کیا کہتا تھا کہ میں بڑی ظالم ہوں؟"

"نہیں، بلکہ وہ تمہاری اِس متانت کی وجہ مجھ سے پوچھتا تھا، اور کہتا تھا کہ دونوں بہنوں کے مزاج

میں اتنا فرق کیوں ہے۔ اس پر میں بہت دیر تک تمہاری مدح سرائی کرتی رہی۔ میں نے کہا کہ سوفیا مجھ سے زیادہ نیک، زیادہ شریف اور زیادہ محبت کرنے والی ہے، اور اُس میں نقص صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی اِن صفات کو چھپاتی ہے۔ رابرٹو نہایت دلچسپی سے میری باتیں سُنتا رہا، پھر کہنے لگا سوفیا کو مجھ سے نفرت کیوں ہے؟"

"نفرت!"

"ہاں، اُس نے یہی کہا تھا، اور سچ پوچھو تو اُس نے بالکل غلط بھی نہیں کہا، تم اُس کی طرف توجہ ہی بہت کم کرتی ہو لیکن اس معاملے میں بھی میں نے تمہاری حمایت کی۔ میں نے کہا کہ حقیقت میں سوفیا تمہیں بہت پسند کرتی ہے، اور تمہاری بہت ہی عزت کرتی ہے ——"

"لولو!"

"میں جانتی تھی کہ یہ صحیح نہیں۔ لیکن یہ میں نے اس لئے کہا کہ رابرٹو تمہیں بہت ہی اچھا سمجھتا ہے۔ سوفیا کیا یہ بات انصاف سے بعید نہیں کہ تم اُس سے ایک اجنبی کا سا سلوک کرو؟"

سوفیا نے اپنی باہیں اپنی بہن کے گلے میں ڈال دیں اور اس کا منہ چوم لیا۔ لولو نے ایک لمحے کے تامل کے بعد شفقت آمیز لہجے میں کہا:

"کیا تم رابرٹو سے تھوڑی سی محبت نہیں کر سکتیں؟"

سوفیا کوئی لفظ منہ سے نکالے بغیر یک بیک پیچھے ہٹ گئی۔

لولو نے اپنے کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے گفتگو کا موضوع بدل کر کہا "اچھا یہ تو بتاؤ، آج شام کو تم ہمارے ساتھ چلوگی یا نہیں؟"

"نہیں، مجھے تو سر میں درد ہے، تم اماں کے ساتھ چلی جانا۔"

"حسبِ معمول، میں بھی حسبِ معمول چلی جاؤں گی، کیونکہ وقت خوب گزرے گا۔"

"کیا —— رابرٹو تمہارے ساتھ جا رہا ہے؟"

"نہیں، وہ کلب جا رہا ہے جہاں آج ڈائرکٹروں کا جلسہ ہونے والا ہے۔ میں اُس کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر ڈبلینو کی رقص گاہ میں جا رہی ہوں، اور صبح تک وہیں رہوں گی۔"

"اور اگر اُسے معلوم ہو گیا؟"

"تو بہت اچھی بات ہے۔ وہ ابھی سے مجھے آزادی دینا سیکھے گا، میں اُسے کوئی بُری عادت ڈالنا نہیں چاہتی۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اُس سے بہت تھوڑی محبت ہے۔"

بہت زیادہ، مگر اپنے طریق پر۔ اچھا اب مجھے کپڑے پہننے کے لئے جلدی کرنی چاہئے۔ اس میں مجھے کم از کم دو گھنٹے لگ جائیں گے۔"

سوفیا کھڑی اُس گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سُن رہی تھی جو اُس کی ماں اور بہن کو رقص گاہ کی طرف لے جا رہی تھی۔ وہ اکیلی رہ گئی، بالکل اکیلی، جیسا کہ وہ ہمیشہ رہا کرتی تھی۔ بچپن میں جب اُس سے کوئی سختی یا نا انصافی کا سلوک کیا جاتا تھا تو وہ اپنے بستر میں چھپ کر آہستہ آہستہ رویا کرتی تھی۔ اُن کی یہ عادت اب تک نہ گئی تھی۔ اپنے وسیع ڈرائنگ رُوم میں جو بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا اب وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ بے حس و حرکت تھے۔ اس کا سر کُرسی کی پشت پر گرا ہُوا تھا۔ اس کے چہرے پر سخت غم چھا رہا تھا جس سے کسی زبردست اندرونی کشمکش کا اظہار ہوتا تھا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس کامل تنہائی کے وقت میں ایک غم عظیم کا احساس اُس پر چھا گیا تھا۔ وہ حقیقت جس کا اُس نے مدتوں انکار کیا تھا صاف، صریح اور عریاں ہو کر اس کی نظروں کے سامنے آ رہی تھی۔

کسی کے پاؤں کی آہٹ سُن کر وہ چونک پڑی۔ یہ رابرٹو تھا۔ سوفیا کو اکیلا پا کر وہ ذرا ہچکچایا اور رک گیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ گھر کے دوسرے لوگ کسی اور کمرے میں ہونگے وہ آگے بڑھا۔ سوفیا گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"شام بخیر، سوفیا"

"شام بخیر"

دونوں پر اضطراب طاری تھا۔

"رابرٹو نے اپنے دل میں کہا "یا الٰہی، یہ سوفیا کیسی عجیب لڑکی ہے!"

اس اثنا میں سوفیا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اس کے چہرے پر اب اضطراب کے آثار نمایاں نہ تھے۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔

"تمہاری اماں اچھی ہیں؟"

"ہاں، اچھی ہیں۔"

"اور لولو؟"

"وہ بھی بہت اچھی ہے۔"

اس کے بعد دونوں پر خاموشی چھا گئی۔ رابرٹو نے مسرت کی ایک عجیب کیفیت محسوس کی جس میں کچھ تلخی بھی ملی ہوئی تھی۔

اُس نے پوچھا "کیا لولو مصروف ہے؟"

سوفیا کے جسم میں بے چینی سے ایک ہلکی سی جنبش ہوئی۔

اس نے جلدی سے گویا مزید سوالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے جواب دیا "وہ اماں کے ساتھ ڈیلینو کی رقص گاہ میں گئی ہے۔"

اب چونکہ سوفیا اکیلی تھی اس لئے رابرٹو نے ازراہِ اخلاق کچھ دیر اُس کے پاس ٹھہرنے اور باتیں کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن اس خیال کے آتے ہی اُس کے دل میں وہاں سے بھاگ جانے کی ایک ناقابلِ ضبط خواہش پیدا ہوگئی۔ لیکن وہ بیٹھا رہا۔ آخر اُس نے اپنی اس بے وقت آمد کی معذرت کے طور پر کہا "میں اس لئے آگیا کہ کلب میں ڈائرکٹروں کی تعداد ضرورت سے کم تھی۔"

"لولو کو تمہارے آنے کی امید نہ تھی، اس لئے وہ چلی گئی، ورنہ ——"

رابرٹو نے قطعِ کلام کرتے ہوئے کہا "کوئی مذائقہ نہیں۔"

لیکن یہ وہ اتنی جلدی کہہ گیا کہ محض ایک رسمی سی بات معلوم ہوئی، اور لولو کی غیرحاضری کو اس سے کوئی تقویت نہ پہنچ سکی۔

"اور تم نہیں گئیں؟"

"نہیں، میں نہیں گئی۔ مجھے رقص وغیرہ سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں۔"

"تم کتابیں پڑھتے رہنے کو ترجیح دیتی ہو؟"

"ہاں بہت زیادہ۔"

"لیکن اس سے تمہاری صحت پر تو اثر نہ پڑے گا؟"

"صحت پر کیا اثر پڑے گا، میری آنکھیں بہت اچھی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے سوفیا نے اپنی آنکھیں اٹھا کر رابرٹو کی طرف دیکھا۔

رابرٹو کے دل میں خیال آیا "کتنی خوبصورت آنکھیں ہیں، لیکن کیفیت سے خالی ہیں۔" پھر اُس نے کہا "میرا مطلب ہے ——"

"غالباً اخلاقی نقصان۔ میرا یہ خیال نہیں۔ جو کتابیں میں پڑھتی ہوں، اُن سے مجھے سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے؟"

"کیا تمہیں سکونِ قلب کی ضرورت ہے؟"

"ہر شخص کو سکونِ قلب کی ضرورت ہے۔"

سوفیا کی آواز میں متانت اور سنجیدگی تھی۔ رابرٹو کو اس میں لطف آرہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس آواز کو پہلی مرتبہ سُن رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی عورت کے رُوبرو پاتا تھا جس سے وہ اب تک ناواقف تھا، اور جواب اپنی ہر حرکت اور ہر لفظ سے اُس پر منکشف ہو رہی تھی۔ سوفیا کی بے پروائی اور سرد مزاجی بھی رخصت ہو چکی تھی۔ وہ اب اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر اور مُسکرا مُسکرا کر ایک دوست کی طرح باتیں کرتی تھی۔ اب تک اُن کے درمیان کونسا پردہ حائل تھا؟ اور اب کیا ہونے والا تھا؟

رابرٹو نے کہا جب مجھے کوئی کتاب پسند آتی ہے تو پھر ضرور مجھے اُس کے مصنف یا مُصنفہ سے واقفیت حاصل کرنے کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے، کہ آیا وہ اچھے لوگ تھے اور آیا انہوں نے خود بھی تکلیفیں اٹھائی ہیں اور محبت کی ہے ـــــ"

لیکن یہ معلوم کرنا شاید سخت مشکل ہے۔ مُصنفین اپنی محبت کبھی بیان نہیں کرتے، ہمیشہ دوسروں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔"

"غالباً غرت کے خیال سے؟"

"نہیں، رشک کے خیال سے۔ کیونکہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ محبت کرنے والوں نے محبت کو اپنی روح میں ایک گنج مخفی کی طرح چھپائے رکھا ہے۔"

ان الفاظ کو ادا کرنے وقت سوفیا کی آواز میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ اُس کے چہرے پر ایک آزادانہ کیفیت تھی، اور اُس کا لہجہ اس قدر سادہ، اس قدر پاکیزہ اور اس قدر دلنشین تھا کہ رابرٹو نے اسے محبت پر اس یقین کے ساتھ بحث کرتے ہوئے دیکھ کر کوئی تعجب محسوس نہ کیا۔ اب اُسے کسی بات پر تعجب نہ ہوتا تھا۔ اُسے ہر بات قدرتی اور متوقع معلوم ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ آج کی شام بھی جو تنہا اس عجیب لڑکی کے ساتھ گزر رہی تھی آسے ایک مقدر اور منتظر شے معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ جدا ہونے لگے تو انہوں نے کچھ اس طرح ایک دوسرے کی طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا جیسے وہ یقین کر لینا چاہتے ہیں کہ جب وہ پھر ملیں گے تو ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ سوفیا نے اپنا ہاتھ بڑھایا، رابرٹو نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس پر جھک گیا . . . .

وہ چلا گیا اور دروازے کا پردہ آنکھ جھپکتے میں ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا۔

جب سوفیا کی موجودگی اور گفتگو کا سحر ٹوٹ گیا تو رابرٹو نے اپنے دماغ میں ایک عجیب ہیجان سا محسوس کیا۔ وہ مسرور بھی تھا اور مغموم بھی، اُسے موت کی خواہش بھی تھی اور زندگی بھی اُس کے جسم میں رواں دواں تھی وہ نہ جانتا تھا کہ لولو کے متعلق اور اپنے متعلق اور اپنے مستقبل کے متعلق کیا خیال کرے۔

سوفیا خوش تھی، نہایت خوش۔ فرطِ مسرت سے وہ اپنے سرہانے کے نیچے منہ کو چھپا کر روتی رہی اُسکیاں

لے لے کرزار قطار روتی رہی۔

تین مہینے گزر چکے تھے، لیکن لولو کی شادی اب بھی ملتوی ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس کی ماں جس کی سمجھ میں یہ تاخیر کسی طرح بھی نہ آتی تھی، بار بار اپنی لڑکی کو الگ بلاکر اس کی وجہ پوچھتی تھی۔ لیکن لولو ہمیشہ یہی جواب دیتی تھی کہ "میں ابھی اور انتظار کرنا چاہتی ہوں۔ میں رابرٹو کے مزاج سے ابھی اور زیادہ واقف ہونا چاہتی ہوں"۔

دراصل لولو کی طبیعت میں کچھ سوچ پیدا ہوگئی تھی۔ اگرچہ اس کے اُٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے میں وہی پہلی سی شوخی موجود تھی اور وہ پہلے ہی کی طرح ہنستی، گاتی اور مذاق کرتی تھی۔ لیکن اپنی بہن کا مطالعہ کرنے کے لئے یا رابرٹو کے ایک ایک لفظ کو غور سے سننے کی کوشش میں اکثر اس کی ان مسرت اندوزیوں کا سلسلہ منقطع ہوجایا کرتا تھا سوفیا کے دونوں ہونٹ آپس میں پیوست ہوتے تھے۔ دونوں بھویں ملی ہوئی ہوتی تھیں اور اس کے چہرے سے بڑی توجہ ظاہر ہوتی تھی۔

لولو نے اپنے آس پاس نگاہ ڈالی۔ اور اس کے آس پاس عجیب وغریب واقعات رونما ہو رہے تھے۔ رابرٹو میں وہ زندہ دلی اور شگفتگی باقی نہ رہی تھی جو اس کا خاصہ تھی، بلکہ وہ فکرمند اور متردد ہوگیا تھا، اور اس کے چہرے پر زردی چھاگئی تھی۔ وہ باتیں کم کرتا تھا اور کھویا ہوا سا رہتا تھا۔ بہت سی باتوں کی طرف جن سے پہلے اُسے دلچسپی تھی اب وہ بالکل توجہ نہ کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ بڑی کوشش سے اپنے اوپر قابو حاصل کرکے پہلے کی طرح زندہ دل بن جایا کرتا تھا، لیکن یہ کیفیت دیرپا نہ ہوتی تھی۔ بناوٹ سے وہ آشنا ہی نہ تھا اس لئے بمشکل کامیاب ہوتا تھا۔ اُس کے جذبات اور اُس کی روحانی اذیت اُس کی آنکھوں میں صاف نمایاں ہوتے تھے۔

پرانی سوفیا کی جگہ اب ایک اور سوفیا نے لے لی تھی، ایک مضطرب اور بے قرار سوفیا نے، جو کبھی تو حالتِ اضطرار میں اپنی بہن سے بغلگیر ہوجاتی تھی اور کبھی گھنٹوں اُسے شکل تک نہ دکھاتی تھی۔ اُس کے رُخسار اکثر تمتما اُٹھتے تھے، ایک آتشِ مستور سے تمتما اُٹھتے تھے، اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ چمکتا ہوا نظر آتا تھا، اس کی آواز کبھی گہری اور پُرجذبات ہوجاتی تھی اور کبھی خشک اور درشت، اُس کے ہاتھ لرزتے تھے۔ رات کو اسے نیند نہ آتی تھی لولو اکثر ننگے پاؤں اٹھ کر اس کے دروازے تک جاتی اور کان لگا کر سوفیا کے رونے تلملانے کی آواز سنتی۔ اگر سوفیا سے اس کی وجہ دریافت کی جاتی تو وہ انکار کردیتی، اور کبھی نہ بتاتی۔

جب رابرٹو اور سوفیا ملتے تھے ـــــ اور یہ اتفاق روز ہی ہوتا تھا ـــــ تو وہ تبدیلی جو ان میں ہوچکی تھی نمایاں ہوجاتی تھی، بحث مباحثے کم ہوتے، بات کا جواب بلاتوقف دیا جاتا، اور اکثر مبہم سا ہوتا، بار بار نگاہیں ڈالی جاتیں بعض اوقات گھنٹوں وہ گفتگو نہ کرتے لیکن ہر ایک دوسرے کی حرکات کا بغور مطالعہ کرتا رہتا، وہ کبھی ایک دوسرے کے قریب نہ بیٹھتے کبھی رابرٹو کسی نہ کسی حیلے سے اس چیز یا اُس کتاب کو ہاتھ لگانا چاہتا جس کو سوفیا نے چھوا ہو بعض اوقات جب سوفیا کمرے میں نہ

ہوتی تو رابرٹو کی بیتاب نگاہیں بار بار اُس کے بند کمرے کی طرف اُٹھ جاتیں اور اس حالت میں وہ باتوں کا جواب بھی عجب بےدلی سے دیتا۔ بعض اوقات سوفیا کی آمد کے پانچ منٹ بعد ہی وہ اپنی ہیٹ اُٹھاتا اور چل دیتا۔ سوفیا کا رنگ زرد ہوتا جارہا تھا اور اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ رہے تھے۔ آخر اُس نے تنہائی اختیار کرلی ہر شام وہ اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بند کرلیتی اور غم کے طوفان کو روکنے کی کوشش کیا کرتی۔ لیکن اُسے کسی طرح قرار نہ آتا اور وہ گھنٹوں تڑپتی تلملاتی رہتی۔

ایک شام لولو اُس کے کمرے میں آئی، اور کہنے لگی "کیا تم مجھ پر ایک مہربانی کروگی؟"

سوفیا نے پوچھا "کیا؟"

لولو نے کہا "مجھے کچھ لکھنا ہے، اور رابرٹو باہر اکیلا کھڑا ہے۔ کیا تم تھوڑی دیر اُس کے پاس ٹھہروگی؟"

"لیکن میں ــــــ"

"تم یہیں بند رہنا چاہتی ہو؟ کیا تمہیں اِس قید میں اُتنی ہی خوشی حاصل ہوتی ہے جتنی مجھ پر احسان کرنے میں ہوگی؟"

"کیا تم جلد آجاؤگی؟"

"مجھے صرف چار سطریں لکھنی ہیں۔"

سوفیا اپنے سارے حوصلے کو مجتمع کر کے دروازے کی طرف مڑی صحن میں آکر وہ کھڑی ہوگئی۔ رابرٹو اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا، وہ آگے بڑھی آہستہ آواز میں اس نے کہا "مجھے لولو نے بھیجا ہے۔"

"تم مجبور ہو کر آئی ہو؟"

"مجبور؟ نہیں۔"

سوفیا کا سارا جسم کانپ گیا، رابرٹو اُس کے بالکل قریب تھا اور اُس کا چہرہ جذبات کے ہجوم سے بدل رہا تھا۔

"سوفیا میں نے تمہیں کیا کہا ہے؟"

سوفیا نے ڈر کر ملتجیانہ انداز میں کہا "تم نے کچھ نہیں کہا۔ مگر میری طرف اِس طرح مت دیکھو۔"

"سوفیا، آہ سوفیا، تمہیں معلوم ہے مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟"

"خاموش، رابرٹو، خدا کے لئے خاموش رہو! اگر لولو سُن لے تو کیا کہے!"

"مجھے لولو سے محبت نہیں ہے، سوفیا، مجھے تم سے محبت ہے۔"

"یہ غداری ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ یہ غداری ہے۔ مگر مجھے تم سے محبت ہے۔ میں کہیں ــــــــ

لولو نے ایک دوسرے دروازے سے آتے ہوئے دُور ہی سے کہا "اچھا! اچھا، تم دونوں نے صُلح کر لی؟"

لیکن اس کا کچھ جواب نہ ملا۔ سوفیا اپنا منہ اپنے ہاتھوں میں چھپاتی ہوئی بھاگ اٹھی۔ اور رابرٹو بے حس و حرکت اور خاموش یوں کھڑا رہ گیا جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

لولو بولی "رابرٹو!"

"لولو۔"

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں؛ میں جا رہا ہوں۔"

اور لولو سے اجازت لئے بغیر وہ بھی چلا گیا۔ اُس کے چہرے پر مایوسی چھا رہی تھی۔ لولو خیالات میں گم کھڑی اس کو جاتے ہوئے پیچھے سے دیکھتی رہی۔

لولو نے آہستہ سے کہا "ایک یہاں بیقرار ہے اور ایک وہاں؛ اور اس سے پہلے کیا حالت تھی! بس! اب مجھے اس معاملے میں دخل دینا چاہئے۔"

آخر لولو نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ وہ رابرٹو سے شادی نہیں کرے گی، اور اس کے لئے کچھ وجوہ بھی پیش کیں۔

اُس کی ماں نے اپنے سر کو ہلاتے ہوئے جواب دیا "یہ وجوہ بے معنی ہیں میری بیٹی۔"

"تو کیا مجھے آزادی سے صاف صاف طور پر کہہ دینا چاہئے کہ مجھے رابرٹو پسند نہیں ہے اور میں اُس سے شادی نہیں کروں گی؟"

"ہاں یہ جواب کم از کم صاف ہے، لیکن یہ تمہارا وہم ہے۔ رابرٹو کو تم سے محبّت ہے۔"

"وہ اپنے دل کو تسلّی دے لے گا۔"

"تم دونوں شادی کا وعدہ کر چکے ہو۔"

"ہم اپنے وعدے واپس لے سکتے ہیں۔ ہمارا زمانہ آزادی کا زمانہ ہے۔ جس میں کسی کو شادی کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔"

"دنیا کیا کہے گی؟"

"امّاں، ذرا دنیا کی تعریف تو کرو۔"

"لوگ۔"

"اور یہ لوگ صاحب کون ہیں؟ میں تو ان کو نہیں جانتی، اور میں اِن لوگ صاحب کے لئے اپنی خوشی کو بھی قربان نہیں کرنا چاہتی۔"

"لولو، تم نہایت خوفناک لڑکی ہو! بھلا میں رابرٹو سے اب کیا کہوں گی؟"

"جو تم چاہو۔ تم میری ماں کس لئے ہو؟"

"یقیناً میں تمہاری ماں اِسی لئے ہوں کہ تم الجھاؤ اور میں سلجھاؤں۔ رابرٹو تو اسے اپنی سخت ہتک سمجھے گا"

"میرا یہ خیال نہیں ہے۔ تم اسے نہایت نرمی اور خوش اسلوبی سے سمجھا سکتی ہو۔ تم اُس کے آگے مجھے جتنا برا بھی چاہو کہہ سکتی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ لولو نہایت متلون المزاج، غیر متین اور بے وقوف ہے، کہہ دینا کہ وہ نہایت بُری بیوی بنے گی، اُس میں سنجیدگی نام کو نہیں، اپنے عزت و وقار کا اُسے خیال تک نہیں اِس کے برعکس اُس کی بہن ـــــــــ" "بس! لولو ہوش کی باتیں کرو۔"

"کیوں؟ تم بڑی آسانی سے یہہ کہہ سکتی ہو۔ فی الحال رابرٹو اور سوفیا ایک دوسرے سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو ایک دوسرے کو پسند کریں گے اور لوگ بھی تمہاری تعریف کریں گے کہ تم نے پہلے بڑی لڑکی کی شادی کی۔"

"سچ بھی ہے کہ ـــــــــ"

"اور میری شادی کہیں رہ جائے گی؟ ابھی میری عمر ہی کیا ہے: اٹھارہ سال۔ ابھی میں آزادی کا لطف اٹھانا چاہتی ہوں، اپنی پیاری اماں کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

ماں نے فرطِ محبت سے اپنی بیٹی کو گلے سے لگا لیا اور کہنے لگی "لولو تم بڑی شریر ہو۔"

"تو گویا ہم نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا؟ اب تم یہ بری خبر رابرٹو کو نہایت نرمی کے ساتھ سنا دینا، اور کہہ دینا کہ ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری دوستی ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی اور ہم آپس میں ملتے رہیں گے۔ اگر اِن دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہونی ہے تو ہو کر رہے گی، یہ مقدر ہو چکا ہے۔"

"لیکن لولو کیا تمہیں یقین ہے کہ معاملات اچھی طرح طے ہو جائیں گے؟ تم جانتی ہو کہ میں لڑائی جھگڑے سے بہت ڈرتی ہوں۔"

"ہاں، او بے یقینی اماں، ہاں، میں تمہیں اپنے وسیع تجربے کی بنا پر یقین دلاتی ہوں کہ تمہیں قطعاً پریشانی نہ اٹھانی پڑے گی۔ رابرٹو ایک شریف انسان ہے، اور وہ محبت کے بغیر مجھ سے شادی کی توقع ہرگز نہ رکھے گا۔"

"مگر جو بات مجھے ناممکن نظر آرہی ہے وہ سوفیا کا معاملہ ہے۔"

لو لو نے فلسفیانہ انداز میں کہا "ناممکن سے زیادہ ممکن اَور کوئی چیز نہیں"

"بیٹی تم مسلّمات کا ایک دفتر وضع کرنے لگ گئیں! اچھا چھوڑیں اب اس بحث کو۔ ہمارے معاملات کو شاید اب وقت ہی سلجھا سکے گا۔ لیکن جو حقیقت کبھی بدلنے والی نہیں وہ یہ ہے کہ تم پاگل ہو"

"اور نہایت متلون مزاج"

"قوتِ فیصلہ سے محروم"

"اور وہمی، اور جو تم چاہو میں وہ بننے کو تیار ہوں، جو تم کہو میں اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتی ہوں کہو کچھ اَور کہنا چاہتی ہو؟

ماں نے بیٹی کا منہ چُوم کر کہا "جاؤ اب سو رہو۔ خدا حافظ"

"خدا حافظ، اماں۔ میں تمہاری ممنون ہوں"

ماں نے اپنے دل میں کہا "یہ بہتر ہے۔ واقعی لو لو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ ان شادیوں کے رنج دہ نتائج ہر روز ہم دیکھتے ہیں۔ خدا ہمیں ان سے بچائے۔ یہ بہتر ہے"

لو لو نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا "اُف! کتنی عیاری مجھے کرنی پڑی ہے، اماں کو قائل کرنے کے لئے کتنا فریب میں نے کیا ہے! کیسی شاندار فتح ہے! محبّت کی فتح نہ سہی یہ لو لو کی فتح ہے!"

وہ جاتے جاتے اپنی بہن کے کمرے کے پاس کھڑی ہوگئی اور دروازے سے لگ کر سننے لگی۔

بار بار اندر سے دبی ہوئی آہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ غریب سوفیا اپنا سکونِ قلب کھو چکی تھی،

لو لو نے دروازے کے قفل کو اس طرح چُوم لیا جیسے وہ اپنی بہن کی پیشانی کو چوم رہی ہو، پھر زیرِ لب کہنے لگی، "سوجا، سوفیا، سوجا۔ اپنے دل کو تسکین دے اور آرام کر۔ میں نے آج تیرا کام کر دیا ہے"

اور فیاض لو لو اپنی پیاری بہن کی راحت کے خیال سے خوش اور مطمئن ہو کر سو گئی۔

وقت، نیک دل دانشمند بڑھے وقت نے اپنا کام کیا۔ لو لو نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ بن بیاہی بہن جو دُلہن کی سہیلی بن کر برات کے ساتھ ہوگی آسمانی رنگ کا ریشمی گون پہنے یا صوفیانہ رنگ کا کوئی سادہ گون پہن لے۔ اُس نے رابرٹو سے پوچھا کہ آج اُسے کھانڈ کے کتنے کھلونے ملیں گے؟ اور سوفیا سے کہا کہ کیا وہ اُسے وہ خوبصورت کڑھا ہوا رومال دے گی جس کی شکل بادِ نسیم کے ایک جھونکے کی طرح ہے یا ایک ہلکے سے بادل کی طرح۔ رابرٹو اور سوفیا لو لو کے طفلانہ خیالات اور اُس کی مسرّت آمیز بے پروائی پر مُسکرا دیتے، اور ہمیشہ اُس سے محبت کرتے رہے، اور اُسے اپنی قسمت کا چمکتا ہوا ستارہ سمجھتے رہے۔

رابرٹو مانٹی فرینکو نے ایک دوست سے اپنی شادی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا "میں نے ہمیشہ اس

خیال کی تائید کی ہے کہ میاں بیوی کے مذاق میں تخالف ہونا چاہئے۔ انتہا انتہا سے مل جایا کرتی ہے۔ اسی طرح وہ بھی ایک دوسرے کو سمجھ لیں گے، مل جائیں گے۔ ایک کُل کی تکمیل کریں گے۔ اِس کے برخلاف جن کے مذاق میں مطابقت ہوتی ہے۔ اُن کی مثال دو متوازی خطوط کی سی ہے جو پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ لیکن کبھی نہیں ملتے اور پھر جب محبّت بھی ہو ——— ! میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے۔"

ترجمہ

منصور احمد

یادِ وطن

ہمیں بھی یاد کرنا جب ہنسیں کلیاں گلستاں کی
قسم ہے تجھ کو اے صبحِ وطن شامِ غریباں کی

بہار آئی، اڑا دیں دھجیاں پھولوں نے داماں کی
خبر ہے تو بھی اے سنتِ جنوں اسیرِ گریباں کی

کہیں حسرت کا مدفن ہے کہیں تربت ہے ارماں کی
ترے عاشق کا دل تصویر ہے گورِ غریباں کی

اِدھر دیکھو او دلِ مضطر کی حالت پوچھنے والے
رقم ماتھے پہ ساری داستاں ہے دردِ پنہاں کی

کبھی اک تیر نادانستگی میں دل نے کھایا تھا
خلش اب تک نہیں نکلی جگر سے اُس کے پیکاں کی

وہی ظالم مرا قاتل ہے ان محشر خراموں میں
حنا سے جس کی بُو آتی ہے یارب خونِ ارماں کی

نقابِ رُخ اٹھا دی جس نے اُس کو بھی تو کچھ کہیئے
یہ مانا بزم میں ساری خطا تھی چشمِ حیراں کی

صدق جائسی

غزل

تم خوش رہو، گر مجھ کو جلاتے ہو تو کیا ہے

جنّت کو جہنّم ہی بناتے ہو تو کیا ہے

میرا بھی اُسی میں ہے بھلا جس میں تمہارا

طُوفان مرے سر پہ اُٹھاتے ہو تو کیا ہے

وُہ چشمِ مروّت ہی سدا یاد رہے گی!

آنکھیں بھی تم اب مجھ کو دکھاتے ہو تو کیا ہے

پتھر پہ مرا نام کھُدا ہے نہ مٹے گا

تم دِل سے اگر مُجھ کو بھُلاتے ہو تو کیا ہے

جاؤ گے مرے دِل سے تو کہنا کہ گئے ہم

پیمانِ وفا توڑ کے جاتے ہو تو کیا ہے

حامد علی خاں

الہامات

اب یاد کر رہے ہو مجھے بار بار کیا
پہلے نہیں تھے واقفِ انجامِ کار کیا؟

کیوں کھو رہے ہو اپنی جفا کا بھی اعتبار
اپنے کئے پہ ہوتے ہو اب شرمسار کیا!

کر کر کے یاد اپنی تغافل شعاریاں
تم کر رہے ہو دل کو مرے بیقرار کیا؟

عذرِ جفا سے دل کو دُکھانے سے فائدہ؟
کم ہے مرے لئے ستمِ روزگار کیا؟

مانا کہ تم کو میری وفا کا ہے اعتبار
عمرِ گریز پا کا مگر اعتبار کیا؟

دل سرد مہریوں سے بجھایا کئے سدا
روشن کرو گے اب مری شمعِ مزار کیا؟

زنہار تم کو حاجتِ عذرِ جفا نہیں
اے جانِ آرزو مجھے کوئی گلہ نہیں

حفیظ
ہوشیارپوری

شُعاعیں

آپ کو معلوم ہے کہ اب تک جو اسرارِ کائنات بے نقاب ہو چکے ہیں وہ غیر دریافت شدہ حقائق کے مقابلہ میں عشرِ عشیر بھی نہیں ہیں، علماء نے اب تک شعاعوں کے متعلق جو کچھ دریافت کیا ہے وہ بہت کم ہے اور اس سے ذوقِ جستجو کی تشنگی رفع نہیں ہوتی۔ اس مقالہ میں بعض ایسی "شعاعوں" کے متعلق مختصراً بحث کی گئی ہے جو حال ہی میں دریافت ہوئی ہیں، اور معالجۂ امراض وغیرہ خصوصاً معالجۂ سرطان میں ان کی وجہ سے جو سہولت پیدا ہوگئی ہے اُس پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک حد تک ان کے خواص و تاثرات کی تشریح کی گئی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے تک عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ بالائے بنفشی اور پائیں سُرخ شعاعیں دریافت کر کے ہم طیفِ شمسی کی انتہا تک پہنچ گئے ہیں، لیکن بعد میں واضح ہوا کہ بہت سی ایسی شعاعیں بھی موجود ہیں جن کے متعلق ہمیں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں ہے۔ البتہ قیاس یہ ہے کہ وہ مختلف ستاروں سے یا ان فضاؤں سے آتی ہیں جو ستاروں اور سیاروں کے مابین حائل ہیں۔ اس بنا پر طیف کی سات بنیادی شعاعوں کے علاوہ اور بھی شعاعیں ہیں جو یا تو سورج سے نکلتی ہیں یا دوسرے کروں سے خارج ہوتی ہیں ان میں زیادہ اہم یہ ہیں۔ بالائے بنفشئی شعاعیں، پائینِ سُرخ شعاعیں، لاشعاعیں، جہ شعاعیں، کائناتی شعاعیں اور برقی شعاعیں جنہیں لاسلکی شعاعیں بھی کہتے ہیں۔

یہاں ہم ان سب کے علاوہ بعض جدید قسم کی شعاعوں کے متعلق اور خصوصاً حیاتی شعاعوں کے متعلق بھی بحث کرنا اور ان کے کچھ خواص بیان کرنا چاہتے ہیں۔

آج سے نصف صدی پیشتر اگر کوئی شخص ان شعاعوں کے متعلق جو اب تک دریافت ہو چکی ہیں پیشین گوئی کرتا تو وہ "وہمی" اور "خبطی" سمجھا جاتا، اس کے باوجود یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اب تک جو شعاعیں دریافت کی جا چکی ہیں ان کو تحقیق و جستجو کی آخری منزل قرار نہیں دے سکتے اور یقیناً ان کے علاوہ بھی اور شعاعیں کائنات میں موجود ہیں۔

حیاتی شعاعیں۔ جن شعاعوں کا علماء نے حال میں انکشاف کیا ہے ان میں سے جدید ترین شعاعوں کو "حیاتی شعاعیں" کہتے ہیں۔ ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ یہ بعض نباتات مثلاً پیاز کے ذی حیات خلیوں کے زندہ جال میں سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی دریافت کا سہرا ایک روسی عالم ڈاکٹر الگزنڈر گورو چ (Dr. Alexander Gurwich) کے سر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ شعاعیں سرطان کے معالجہ میں بہت مفید ہیں اور غالباً علماء اُس کے استیصال میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس رائے میں آسٹروی ڈاکٹر پولیٹیزر (Dr. Gpolitzer) بھی جو مرض سرطان کے معالجہ میں خاص دستگاہ اور شہرت رکھتے ہیں ان کے ہم خیال ہیں۔

ان شعاعوں کے تحقق وجود کے لئے تجربہ کے طور پر سبز پیاز کی جڑ لے لیجئے اور اسے ایک ایسے تاریک کمرے میں رکھ دیجئے جہاں روشنی کا گزر قطعاً ناممکن ہو اس کے ساتھ ہی ایک عکسی پلیٹ رکھ دیجئے چند گھنٹے بھی نہیں گزریں گے کہ اس میں سے نکلنے والی غیر مرئی شعاعوں کی تاثیر سے پلیٹ پر اس کی تصویر اتر آئے گی

اکثر علماء نے اس قسم کے تجربات کئے ہیں اور انہیں ان شعاعوں کا وجود تسلیم کرنا پڑا جو زندہ نباتات کے اجسام میں سے خارج ہوتی ہیں۔ ابتداء میں بعض علماء کا خیال تھا کہ وہ بالائے بنفشی یا پائین سرخ شعاعوں کی ایک قسم ہے لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کے خواص ان دونوں قسموں کی شعاعوں کے خواص سے قطعاً مختلف ہیں۔

ان شعاعوں کی حقیقت کے متعلق ہنوز کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں، لیکن ان کے متعلق پوری تن دہی اور کاوش سے تحقیق و جستجو کی جا رہی ہے اور اس امید پر ان کے خواص کا تجربہ کر رہے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے سرطان کا مکمل علاج دریافت ہو سکے۔

لیکن ان کا سرطان کے ساتھ کیا تعلق؟

ان شعاعوں کے مکتشف ڈاکٹر گورو چ کہتے ہیں کہ اب تک ان شعاعوں کے متعلق جس قدر تجربات کئے گئے ان سے متفقہ طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ شعاعیں صرف خلیوں کے اس زندہ جال سے خارج ہوتی ہیں جو کامل نمو کی حالت میں ہو۔ یہ آپ کو معلوم ہو گا کہ خلیوں کا جال بعض وقت انسان کی موت کے بہت عرصہ بعد تک زندہ رہتا ہے اور ایک کافی مدت گزرنے سے پہلے فنا نہیں ہوتا لیکن اسے حالت نمو میں شمار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح نباتات کو اگر زمین سے اکھاڑ لیا جائے تو وہ کچھ عرصہ تک زندہ رہیں گے لیکن اگر انہیں دوسری موزوں مٹی میں نہ بویا جائے تو ان کا سلسلۂ نمو منقطع ہو جائے گا۔ یہ بیان کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرطان بظاہر خلیوں کے زندہ جال کے ایک ٹکڑے سے عبارت ہے جو نموئے کامل کی حالت میں ہو۔

اس لحاظ سے وہ اس ٹکڑے کی ابتدائے تکوین ہی سے حیاتی شعاعوں کا مصدر و مخزن ہوتا ہے اور چونکہ یہ شعاعیں اُسی وقت سے خارج ہونے لگتی ہیں جب سے جسم میں سرطان کا مادہ پیدا ہوتا ہے اس لئے مادۂ سرطان کے محلِ وقوع کی تعیین اور قوت پکڑنے سے پہلے اس کے استیصال میں بہت زیادہ آسانیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ حیاتی شعاعیں سرطان کی چغلی کھا دیتی ہیں اور مادہ پیدا ہوتے ہی اس کا راز فاش کر دیتی ہیں، معالج کے لئے اتنا اشارہ کافی اور غنیمت ہوتا ہے اور وہ فوراً انسدادی تدابیر عمل میں لے آتا ہے۔

ذمہ دار لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خلایا جن سے سرطان کے جال کی تالیف ہوتی ہے بعینہٖ ان خلایا کے مماثل ہوتے ہیں جن پر زندہ نباتات کا مادۂ جسمیہ مشتمل ہوتا ہے۔ تمام قرائن بتاتے ہیں کہ حیاتی شعاعیں سرطان اور نباتات دونوں سے یکساں طور پر خارج ہوتی ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ سرطان کے خلایا حیرت انگیز سرعت سے نشوونما پاتے ہیں اور یہی نموئے سریع سرطان سے پیدا ہونے والے خطرات کا موجب بن جاتا ہے۔ کیونکہ اُس کے خلایا سرعت کے ساتھ صورت پذیر ہوکر خلایا کے معمولی جال کی جگہ لے لیتے ہیں جس کے نتیجے میں موت واقع ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر گورویچ اور ڈاکٹر پوپیٹر دونوں کا خیال ہے کہ جب کوئی ایسا دقیق آلہ ایجاد ہوجائے گا جس کے ذریعے سے حیاتی شعاعوں کا انکشاف و انتقاط آسان ہوجائے تو اطباء کو اس سے بہت زیادہ امداد ملے گی اور وہ سرطان کا محلِ وقوع معلوم کر کے صورت حال نازک ہونے سے پہلے اس کے تدارک کی تدابیر عمل میں لاسکیں گے۔ امید ہے کہ اطباء عملِ جرّاحی کی امداد کے بغیر اس کے استیصال میں کامیاب ہونے کے قابل بن جائیں گے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ مادۂ سرطان کے ظہور سے پہلے ہی، اس کا تدارک کر دیا جائے۔

لیسی شعاعیں۔ لیسی شعاعیں (Lesi Rays) حیاتی شعاعوں سے کم حیرت انگیز نہیں ہیں یہ شعاعیں بھی نوادر دہیں اور اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ تمام فضائے کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں انہیں کی وجہ سے "جوہر مادّہ" وجود پذیر ہوتا ہے اور مختلف امواجِ نور پیدا ہونے کا سبب بھی ـــــــ بعض علماء کے قول کے مطابق ـــــــ لیسی شعاعوں کی موجوں کا باہمی تصادم اور ایک دوسرے میں تفاعل ہے۔

اب تک صحیح طور پر یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ یہ امواج جوہر مادّہ کو کس طرح پیدا کرتی ہیں۔ ہم صرف اس حد تک قیاس کر سکتے ہیں کہ سطح آب پر دو موجوں کے تصادم کے وقت جو ابھار اور ارتفاع پیدا ہوجاتا ہے اسے پیشِ نظر رکھ کر ایک سادہ نظریہ قائم کرلیں۔ جس طرح یہ ابھار، جو تصادم کا نتیجہ ہوتا ہے، ایک مخصوص شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح جب لیسی شعاعوں کی دو موجوں میں تصادم واقع ہوتا ہے تو نقطۂ تصادم پر

جوہر فرد کا ایک دُلدار ٹکڑا پیدا ہو جاتا ہے

یہ بیان کرنا غیر ضروری ہے کہ امواج لپسی اور امواج بحر کی تشبیہ قطعاً مجازی ہے اس کا مفاد صرف اس قدر ہے کہ ناظرین کے دماغ میں ایک تقریبی تصویر قائم ہو جائے۔ چونکہ لپسی شعاعیں فضا کے ان تمام حصّوں کو پُر کرتی ہیں جو کائنات کے مابین بصورت خلا واقع ہوں۔ اس لئے وہ دواماً و استمراراً متصادم رہتی ہیں اور اُن کے تصادم سے مادّہ کی تخلیق عمل میں آتی رہتی ہے۔

اگرچہ اس نظریہ کی صحت کی بہت دلیلیں موجود ہیں لیکن علماء مزید بحث و استقراء میں مسلسل مصروف ہیں اور اس نظریہ کے اثبات کے لئے مزید تجربات کرتے رہتے ہیں۔

پائین سُرخ یا حرارتی شعاعیں۔ یہ شعاعیں ان تمام اجسام سے خارج ہوتی ہیں جن میں حرارت کا دوران موجود ہے۔ نیز دوسرے زندہ اجسام سے بھی خارج ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں کا دعوےٰ ہے کہ چند ایسی شعاعیں بھی موجود ہیں جو انسان کے جسم یا اس کے دماغ سے خارج ہوتی ہیں اور انہیں سے وہ مادّہ بنتا ہے جو رُوح کا قوام ہے اور جس کا نام "اکٹو پلازم" رکھا گیا ہے۔ ان کے نزدیک ظہور ارواح کی یہی تعلیل ہو سکتی ہے۔ مگر ان شعاعوں ـــــــ یا امواج ـــــــ کا اخراج علمی طریقہ پر ثابت نہیں ہو سکا ہے اور پائین سُرخ شعاعوں کا اجسام حیّہ سے خارج ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو علمی حیثیت سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ اکثر لوگ اجنبی اشخاص سے ملاقات کے وقت انقباض و انبساط کی جو غیر ارادی کیفیات محسوس کرتے ہیں اُس کا سبب بھی صرف یہی ہے کہ یہ شعاعیں بعض اجسام سے خارج ہو کر دوسرے اجسام سے ٹکراتی ہیں اور مختلف حالات میں مختلف اثرات کا موجب بن جاتی ہیں

نامعلوم شعاعیں۔ بعض ایسی شعاعیں بھی ہیں جن کی ماہیت اور کیفیتِ انبعاث کا اب تک انکشاف نہیں ہو سکا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ وہ مختلف قسم کے پروانوں کے بازوؤں سے خارج ہوتی ہیں۔ یہ شعاعیں کافی قوی ہوتی ہیں یہاں تک کہ اُن کے ذریعہ سے نہایت باریک اشیاء کی تصویر بھی عکسی پلیٹ پر اتر آتی ہے حیرت انگیز یہ امر ہے کہ یہ شعاعیں پروانوں کے مرجانے کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے بازوؤں سے خارج ہوتی رہتی ہیں۔ بعض علماء نے اس قسم کے تعجب خیز تجربات کئے ہیں۔ ایسے پروانوں کے بازو مہیا کئے گئے جو تیس سال پہلے مر چکے تھے انہیں ایسے تاریک کمرے میں رکھا گیا جہاں روشنی کا قطعاً گزر نہیں تھا۔ ان پر ایک عکسی پلیٹ رکھ دی چند گھنٹوں کے بعد ان شعاعوں کے نور کی وجہ سے جو بازوؤں سے نکل رہی تھیں پلیٹ پر بازوؤں کی تصویر منطبع ہو گئی۔

ان عجیب و غریب شعاعوں کی دریافت کا سہرا واشنگٹن کے قومی عجائب خانہ کے ایک عہدہ دار ڈاکٹر آسٹن کلارک کے سر ہے۔ وہ اس کے متعلق اب تک وسیع پیمانہ پر تجربات کر رہے ہیں تاکہ ان

شعاعوں کی حقیقتِ واقعی دریافت ہو سکے۔ اُنھوں نے بہت سی قسم کے پروانوں کے بازوؤں کی اس طرح دیکھ بھال کی کہ انہیں بالکل بند صندوقوں میں مقفل کر دیا جن میں کہیں سے کسی طرح روشنی کا گزر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود ثابت ہوا کہ تمام بازو ان نامعلوم شعاعوں کو خارج کرتے رہے ہیں اور یہ عکسی پلیٹوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔

ابتدا میں خیال تھا کہ یہ شعاعیں بالائے بنفشئی شعاعوں کی قسم ہی سے ہیں، کیونکہ جس طرح بالائے بنفشئی شعاعیں خواہ کتنی ہی لطیف و شفاف کیوں نہ ہوں گا پتھر میں سے نہیں گزر سکتیں۔ اسی طرح یہ شعاعیں بھی نہیں گزر سکتیں لیکن بعد میں تجربہ سے ثابت ہُوا کہ یہ شعاعیں گار پتھر میں سے گزر سکتی ہیں اور یہی ایک دلیل اس امر کے اثبات کے لئے کافی ہے کہ وہ بالائے بنفشئی قسم کی شعاعوں میں سے نہیں ہیں۔

طیف کی شعاعیں۔ رنگ کیا ہے؟

حقیقت میں رنگ کوئی بیرونی وجود نہیں رکھتا، جو چیز بیرونی وجود رکھتی ہے وہ شعاعیں یا روشنی کی امواج ہیں، مختلف رنگوں کی روشنی میں جو فرق ہے وہ محض طولِ موج کا فرق ہے۔ جب خاص طولِ موج کی شعاعیں آنکھ پر پڑتی ہیں تو غالباً آنکھ سے ملحقہ اعصاب کے ذریعے سے ہمارے دماغ میں ایک خاص قسم کا احساس پیدا ہوتا ہے جسے "رنگ" کہتے ہیں۔

اب ہم طیفِ شمسی کی شعاعوں یا سات بنیادی رنگوں کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ سات رنگ یہ ہیں۔ ۱ بنفشئی ۲۔ نیلا ۳۔ آسمانی، ۴۔ سبز ۵ زرد، ۶ نارنجی اور ۷ سُرخ۔ ان رنگوں کو قوسِ قزح میں بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن آسان ترکیب یہ ہے کہ دھوپ میں ایک مثلث الاضلاع منشور رکھ دیں، روشنی منشور میں سے گزر کر دوسری جانب مذکورہ بالا سات اصلی رنگوں میں منقسم نظر آئے گی اور رنگوں کی ترتیب اوپر سے نیچے کی جانب وہی ہوگی جو ہم نے بیان کی یعنی سب سے اوپر بنفشئی اور سب سے نیچے سُرخ۔ مگر جدید معلومات بتاتی ہیں کہ ان رنگوں یا شعاعوں پر تمام طبعی شعاعیں ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ ان کے علاوہ بھی کئی قسم کی شعاعیں ہیں جنہیں اگرچہ محض چشمِ ظاہری کی امداد سے نہیں دیکھ سکتے لیکن ان کے تاثرات محسوس کر کے انہیں موجود تسلیم کر لیتے ہیں۔

مثلاً پائیں سُرخ شعاعوں کو لے لیجئے جنہیں ڈاکٹر ہرشل نے محض بر سبیلِ اتفاق دریافت کیا تھا اس کی صورت یہ ہوئی کہ وہ طیفی شعاعوں کو "الوانِ ہفتگانہ" میں تحلیل کر رہے تھے۔ اتفاقاً تپش پیما دھوپ میں سُرخ شعاعوں کے نیچے کی جانب رکھا گیا، اس سے یہ عجیب نتیجہ نکلا کہ تپش پیما کا درجہ حرارت کم ہونے کی

بجائے اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ دوسرے ساتوں رنگوں کی شعاعوں میں سے کسی ایک کے نیچے بھی تپش پیما کے درجۂ حرارت میں اتنا اضافہ نہیں ہوا تھا، اس تجربہ کا مکرر سہ کرر کئی مرتبہ اعادہ کیا گیا اور ہر مرتبہ یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ جب تپش پیما کو شعاع سُرخ کے نیچے کی جانب رکھا جاتا تو درجۂ حرارت میں اضافہ ہو جاتا متواتر بحث و استقرار سے ثابت ہوا کہ طیفِ شمسی کے نچلے حصّہ میں خاص قسم کی شعاعیں موجود ہوتی ہیں گو وہ بظاہر نظر نہیں آتیں، انہیں اب "پائیں سُرخ" شعاعیں کہنے لگے ہیں۔

سورج کی حرارت بلکہ جسمِ انسانی سے خارج ہونے والی حرارت کا سبب بھی یہی شعاعیں ہیں۔ اور باوجودیکہ آنکھ انہیں دیکھنے سے قاصر ہے لیکن جسم کی جلد اُن کی حرارت کو محسوس کرتی رہتی ہے۔ یہ شعاعیں جسمِ انسانی میں نفوذ کر جاتی ہیں اور اسی بنا پر اطبا ان کے ذریعہ سے خلایا کے جالوں میں جن سے جسم کی تالیف ہوتی ہے، اور خون میں حرارت پیدا کر کے بعض امراض کے معالجہ میں امداد لینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے جنگ کے موقع پر غیر مرئی خفیہ اشارات ارسال کرنے میں اور دوسری بہت سے اغراض میں بھی امداد لی گئی ہے۔

بالائے بنفشئی شعاعیں طیف کے دوسرے سرے پر پائی جاتی ہیں۔ بعض امراض میں خصوصاً کساح الاطفال میں ان کے ذریعہ سے علاج بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ ان شعاعوں کا طولِ موج دوسرے الوانِ ہفتگانہ کے طولِ موج سے بہت کم ہوتا ہے۔ بخلاف پائیں سرخ شعاعوں کے جن کا طول سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

دوسری شعاعیں۔ بالائے بنفشئی شعاعوں سے بھی کم طول موج کی بعض شعاعیں موجود ہیں جنہیں شومیں (Shuman) کی شعاعیں کہتے ہیں۔ اسی قسم کے خواص کی بعض اور شعاعیں بھی پائی جاتی ہیں جنہیں لیمین (Lyman) کی شعاعیں کہتے ہیں۔ ان دونوں قسم کی شعاعوں کو ان کے مکتشفین کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

جدید ترین شعاعیں وہ ہیں جنہیں حال میں ایک جرمن عالم ڈاکٹر بکی (Dr Bucky) نے دریافت کیا ہے اور ایک دوسرے امریکن عالم ڈاکٹر جوزف ایلر نے بھی اسی عرصہ میں اپنی ذاتی تحقیقات کی بنا پر ان کے اکتشاف کی خبر دی ہے۔ ان دونوں نے بالاتفاق ان کا نام (Border Line Rays) یعنی "خطِ فاصلہ کی شعاعیں" تجویز کیا ہے۔ خیال ہے کہ یہ بعض جلدی امراض کے معالجہ میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔

لاشعاعیں (X Rays) اور جیم شعاعیں (Gamma Rays یا y Rays) بھی نو دریافت شعاعوں میں کافی اہمیت رکھتی ہیں خصوصاً سرطان کے علاج میں بہت مفید ثابت ہوئی ہیں۔ کیونکہ وہ بعض قسم کے زندہ خلیوں اور خصوصاً سرطان کے خلیوں کو فی الفور ہلاک کر دیتی ہیں۔

ایک قسم کی شعاعیں کائناتی شعاعیں (Cosmic Rays) کہلاتی ہیں جنہیں حال ہی میں امریکن

پروفیسر ملیکن نے دریافت کیا ہے۔ یہ شعاعیں ابھی تک علماء کے لئے رازِ سربستہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان کا سرچشمہ یقینی طور پر دریافت نہیں ہوسکا ہے۔ خیال یہ ہے کہ وہ کائناتِ بعیدہ یا فضائے بسیط سے نکلتی رہتی ہیں ان شعاعوں کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ بہت شدید النفوذ ہیں اور اس لحاظ سے انہیں جہ شعاعوں پر بھی فوقیت حاصل ہے جو سرعتِ نفوذ اور شدتِ تاثیر میں خاص امتیاز رکھتی ہیں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کائناتی شعاعیں کائناتِ بعیدہ کے بعض عناصر کے انحلال سے پیدا ہوتی ہوں۔ غالباً اُن کا مصدر ان متعدد ستاروں یا آفتاب کے جوف کو قرار دینا زیادہ قرینِ صواب ہوگا جن میں غیر معمولی طور پر انتہائی حرارت پائی جاتی ہے۔ بعض علماء ـــــ مثلاً ڈبلن یونیورسٹی کے اساتذہ پروفیسر جولی اور پروفیسر ڈکسن ـــــ کا خیال ہے کہ کائناتی شعاعوں کا ایک حصہ ہمارے عالمِ ارضی تک سورج سے خارج ہوکر پہنچتا ہے۔ اور وہی انواع کی مختلف نسلوں کے تطوّر و انقلاب کا باعث ہے یعنی قانونِ نشو و ارتقا کا حقیقی سبب یہی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مستقبل میں دوسری شعاعوں کے انکشاف کی بھی توقع ہے نیز اگرچہ اُن کے دریافت شدہ خواص بکثرت ہیں لیکن وہ خواص جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں ان سے بہت زیادہ ہیں حقیقت میں ہمیں اسرارِ موجودات کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ بہت کم ہے اور دریا کے مقابلہ میں قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے، انسان کی حالت کمسن بچے کی سی ہے جو اپنے گرد و پیش کی اشیاء اور ماحول کے مناظر دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے۔ علم اگرچہ کمال کی جانب تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے لیکن اُس کی رفتارِ ترقی خواہ کتنی ہی تیز تر کیوں نہ ہو جائے مگر منزلِ مقصود تک پہنچنا ہنوز محض ایک خواب ہے جس کی تعبیر کے لئے انسان بے تابی سے منتظر ہے۔

کیا مستقبل اس خواب کی صحیح تعبیر پیش کر سکے گا؟

(ماخوذ)

منظور سروش

(بھوپالی)

فرہنگ اصطلاحاتِ مستعملہ

طیف	Spectrum	تپش پیما	Thermometer	برقی شعاعیں	Radio Rays
طولِ موج	Wave length	پائین سرخ	Infra Red	عکسی پلیٹ	Photographic plate
بنفشی	Violet	بالائے بنفشی	Ultra Violet	کا ر پتھر	Quartz
نیلا	Indigo	لاشعاعیں	X Rays		
آسمانی	Blue	جہ شعاعیں	Gamma Rays		
منشور	Prism	کائناتی شعاعیں	Cosmic Rays		

راحت کدہ

(۱)

رات کا گہرا سکوت اک جوئبارِ نغمہ ہے
چودھویں کے چاند کا نور آبشارِ نغمہ ہے
نغمہائے شوق سے ہوں آتش بجاں بیتاب ہوں میں
سازِ دل کا تار تار اک شعلہ زارِ نغمہ ہے

(۲)

تمہارے غمزہ ہائے جلوے عیاں ہیں لالہ زاروں میں
نشہ میں نغمے رواں ہیں آبشاروں میں
تمہارے رخِ رخشاں کی چمک ماہِ تاباں میں
تمہاری مسکراہٹ رقص کرتی ہے ستاروں میں

(۳)

ترا حسن بہار آرا گلستانوں پہ چھایا ہے
ترے جلووں نے دامانِ بیاباں کو بسایا ہے
نہاں رہتی ہے یوں جیسے رگِ گل میں بوئے جاں پرور
ترا سوزِ محبت میری رگ رگ میں سمایا ہے

(۴)

گلشنِ تمنائے دل میں اب خس و خاشاک ہے
شعلہ زارِ آرزو اب ایک مشتِ خاک ہے
اک جوانِ مست جو بے پروا تھا صہبا سے کبھی
ترے ہجر میں افسردہ و غمناک ہے

از صہبائی

فنِ تنقید

مارچ ۱۹۳۱ء کے آخری دن تھے اور ۱۴ اپریل کو ہمارا امتحان تھا۔

شام تھی کوئی چھ بجے ہونگے کہ میرے ایک کرمفرما میرے پاس تشریف لے آئے اور ازراہِ "پند و نصائح" ارشاد فرمایا "تم گدھے ہو یقیناً! تمام دن تم ایک جگہ بیٹھے پڑھتے رہتے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ آدمی اِدھر اُدھر کہیں نہ جائے اور یہ سمجھے کہ ہم ہمہ دان ہیں میاں علم سیکھو علم۔ اور یاد رکھو کہ علم اقوامِ عالم کے نزدیک ایک بہت بڑی نعمت ہے، گویا جیسے روٹی ہوتی ہے . . . . . یا تصوّف . . . . . فلسفہ"

میں اس "عمیق فلسفہ" سے کچھ نہ سمجھ سکا سوائے اس کے کہ یہ صاحب "کچھ" فرما رہے ہیں "جی ہاں" میں نے جواباً عرض کیا "درست ہے لیکن ذرا اس وقت معاف کیجئے میں جناب کی "فلسفیانہ" گفتگو کو زیادہ نہیں سمجھ سکا" لیکن وہ حضرت تھے کہ کوّے کی طرح میرا دماغ چاٹ رہے تھے۔ ایک دھواں دھار تقریر ہو رہی تھی جس میں اُن کے "جذباتِ شعریت" کا عنصر غالب تھا اور کچھ نہایت زبردست "دلائل" پیش کئے جا رہے تھے جن کا مقصد غالباً یہ تھا کہ علم [illegible] ہے۔ درخت ہے پانی ہے حتیٰ کہ کسی کی نیم باز آنکھ کی مستانہ وار نگاہ ہے!

دفعتہ وہ بڑبڑا اٹھے "آج ایک لکچر ہے . . . . . . دیکھو ایک لکچر ہے . . . . تنقید (criticism) پر۔ تمہیں تنقید کرنا نہیں آتا سیکھ جاؤ گے . . . . فلاں صاحب کا . . . . . کالج ہال میں . . . . وہ جو چھوٹے سے ہیں . . . . اچکن پہنا کرتے ہیں دُبلے سے . . . . . بہت لائق ہیں . . . . سنا! . . . بہت سی کتابیں انہوں نے لکھ ماری ہیں . . . ." اور انہوں نے مجھے کرسی سے اٹھا کر اس زور سے پھینکا کہ میں نے آٹھ نو فٹ کا فاصلہ ہوا میں طے کیا اور کمرے میں پہنچ گیا . . . . . اس وقت خدا شاہد ہے مجھے حضرتِ آدم کی حالت پر رحم آ رہا تھا . . . . .

بہرحال ہم لکچر سننے گئے . . . . . ہم نے ہال میں قدم رکھا ہی تھا کہ بتیاں گل ہوگئیں۔ شامِ صحرا کا سماں طاری ہو گیا۔ ہر قسم کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ اسی "طبع آزمائی" کے دوران میں ایک "ہنگامہ زار گرم" ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک شریف انسان (روشنی ہونے پر وہ لکچرار ہی نکلے) اندھیرے میں سٹیج پر چڑھ گیا تھا اور اسے نیچے اتارنے کے لئے کشمکش ہو رہی تھی۔

آخر کار لکچر شروع ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لکچرار صاحب اپنے آنسو پونچھ چکے تھے۔ لیکن آپ کی شکل پر وہی نقشہ طاری تھا۔ آپ نے افتتاحی طور پر مسکرانے کی کوشش کی لیکن واللہ میرے آنسو نکل آئے میں یہ سمجھا کہ وہ پھر رونے لگے ہیں لیکن میرے کرمفرمانے فوراً تنبیہ کی کہ "ہوں۔ وہ تو ہنس رہے ہیں" جس پر میں نے ضبط کر لیا۔

ہاں تو لکچر شروع ہوا "حضرات! نمستے۔ آج ہم اس لئے اکٹھے ہوئے ہیں کہ تنقید پر لکچر سنیں"۔ ایک آواز "تو آپ لکچر سننے کے لئے تشریف لائے ہیں؟" "نہیں نہیں میرا مطلب ہے کہ ہم تنقید پر لکچر کریں۔ ۔ ۔" ایک اور آواز "تو میرا لکچر نہایت فصیح ہوگا" لکچرار صاحب (خفت ہٹاتے ہوئے) "۔ ۔ ۔ ۔ ہی۔ ہی۔ ہی ۔ ۔ ۔ ہاں تو تنقید ایک "فن" ہے۔ جیسے پارچہ بافی! جس طرح پارچہ بافی میں "تخیل" اور "انفرادی کوشش" نہایت ضروری ہیں ٹھیک اسی طرح تنقید میں بھی یہ اجزا لابدی ہیں ۔ ۔ ۔ ہاں لیکن ایک اور چیز نہایت ضروری ہے اور وہ قلم اور دوات ہے کیونکہ ارسطو کے وقت سے یہ روایت چلی آتی ہے کہ لوگ قلم اور دوات سے لکھیں (تالیاں) اور کاغذ بھی! کیونکہ قلم اور دوات کا فلسفہ بالکل وہی ہے ـــــ یعنی اظہارِ مقصد! تو اس سے ثابت ہوا کہ مقصد کے اظہار کے لئے نقطۂ نگاہ کی ضرورت ہے۔ لیکن محض اسی سے آدمی انسان نہیں بنتا ۔ ۔ ۔ ۔ اسے آپٹمسٹک ہونا چاہئے چنانچہ میں بھی آپٹمسٹ ہوں ہاں تو یا آدمی آپٹمسٹک ہوتا ہے یا پیسیمسٹک ۔ ۔ ۔ ۔" ایک نہایت کریہہ منظر شخص "لیکن جناب یہ آپٹی میسی کس جانور کا نام ہے!" لکچرار صاحب (علمیت کے جوش میں) "تو آپ آپٹمزم اور پیسیمزم نہیں جانتے! ہی۔ ہی۔ ہی۔ اچھا تو سنئے لیکن آپ سچ مچ نہیں جانتے [illegible] اچھا ـ جب آپ مال پر جا رہے ہوں۔ لارنس کی طرف ۔ ۔ ۔ تو۔ حضرات! آپ دائیں جانب کیا دیکھتے ہیں! بلند اور عالیشان عمارتیں۔ یہ آپٹمزم ہے! لیکن آپ بائیں جانب ملاحظہ فرمائیے۔ مٹی کوڑا کرکٹ گرا ہے یہ ہے پیسیمزم! یا مثلاً آپ موٹر میں بیٹھے ہوئے الف لیلہ پڑھ رہے ہوں تو یہ آپٹمزم ہے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ایک آواز "اگر الف لیلہ کی جلدیں پھٹی ہوں تو؟" دوسری آواز "اگر الف لیلہ نہ ہو تو؟" تیسری آواز "اگر آپ موٹر کی چھت پر بیٹھے ہوں تو؟" لکچرار صاحب (منہ پھلا کر اکڑتے ہوئے) خاموش! بیٹھ جاؤ۔ تینوں حالتوں میں ایک ہی قصہ ہے! ہاں۔ اگر آپ موٹر کے گرد و غبار میں پھنسے ہوں تو یہ پیسیمزم ہے!" ایک آواز "لیکن چسٹرٹن ۔ ۔ ۔" لکچرار صاحب (گویا اس کے سیاہ چیچک کے داغوں والے چہرے سے اس کا مقصد پڑھ کر) "ہاں چسٹرٹن میرے جیسا ایک آدمی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ایک اور آواز "تو آپ ہندوستانی چسٹرٹن ہیں؟" لکچرار صاحب (نہایت سنجیدگی سے اور متانت کی تیوری چڑھائے ہوئے) نہیں فرق صرف رومانٹیسزم کا (romanticism) ہے ایک اور آواز "تو یہ کیا ہوتی ہے؟" لکچرار صاحب "تم سب نالائق اکٹھے ہو رہے ہو۔ تم کچھ نہیں جانتے رومانٹسزم

گدھے کے سر پر سینگ اُگنے کو کہتے ہیں . . . ." ایک نہایت شریر گروہ کی ہم آہنگ آواز: "تو صاحب آپ کے سر پر تو سینگ نہیں ہیں؟" لکچرار صاحب بارودی گولے کی طرح پھٹ پڑے اور فرمایا "بکو مت! یہاں سے نکل جاؤ. . . . . . "وغیر ذالک من الخرافات

لکچر ختم ہو گیا اور میں اور میرے کرمفرما باہر نکلے۔ انہوں نے کہا "دیکھا! لکچر کتنا عالمانہ تھا! کتنی نئی چیزیں بتائی ہیں۔ میں نے پوچھا "مثلاً" فرمایا "یہ کہ تنقید پارچہ بافی کے اصولوں پر ہونی چاہیئے۔ اور نقطۂ نگاہ . . . . . اور اور ۔ بتاؤں؟ اگر گدھے کے سر پر سینگ نہ ہوں تو اس کا نام رومانٹیسزم نہیں اور مال پر . . . . ." مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور ہنس دیا۔ اتنے میں ایک اور ہم جماعت مل گئے۔ ہم دونوں کو ہنستے دیکھ کر میرے مشفق چراغ پا ہی تو ہو گئے "کتنی منحوس ہنسی ہے (میری طرف دیکھتے ہوئے) خصوصاً تیری ۔ تجھے برگساں کا "قہقہہ" پڑھنے کے بعد بھی ہنسنا نہیں آیا۔ شرم نہیں آتی۔ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ لکچرار صاحب پر ہنس رہے ہیں۔ تمہیں اپنی انسانیت پر رحم کرنا چاہیئے۔ دیکھو میں نہیں ہنس رہا۔ . . . . . " اور رونی صورت بنائے اور منہ پھلائے آپ ایک طرف چل دئے۔ . . . .

اور اب جو ان کی رونی صورت اور اخلاقیات کی تبلیغ کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو مجھے اس گدھے کی کہانی یاد آتی ہے جو جنگل میں "شیر" کی کھال پہن کر ہنہناتا پھرتا تھا کہ اپنی حکومت کا سکہ رائج کرے لیکن مجھے افسوس آرہا ہے کہ حالات نادرست تھے!

مجھے لکچرار صاحب سے ہمدردی ہے اور تھی جو محتاج بیان نہیں، کہ ان کے لکچر کے بعد ایک لکچروں کے دلدادہ اور امتحانات کے مارے ہوئے بزرگ غمناک سروں میں ارشاد فرما رہے تھے: "نہیں منظور مغز سر کا آماس!"

(ڈم۔ ڈم)

غم کے یہ لمحے مجھے کیوں اتنے عزیز ہیں؟

کیا گریز پا مسرت کی طرح یہ بھی مجھ سے چھن جائیں گے؟

یہ بیش قیمت لمحے پھر کبھی نہ آئیں گے؟

پیماں

اغیار میں ذکر اُن کی وفا کا نہ کریں گے
گر اُن کو تقاضا ہے تو اچھا نہ کریں گے

سنبل سے کسی زلفِ گرہ گیر کی باتیں
اے بے خودیٔ جوشِ تمنا نہ کریں گے

نرگس کو کسی چشمِ فسوں گر کے بیاں سے
ہم اک نگہِ ناز کا شیدا نہ کریں گے

اے سرو و گل و یاسمن و لالہ و نسریں
باتیں جو ہوئیں تم سے وہ افشا نہ کریں گے

کہتے ہیں وہ کس طرح یقیں آئے کسی کو
کیا کیا نہ کیا آپ نے کیا کیا نہ کریں گے

رسوائے جہاں ہو کے بھی اے کم نظرو ہم
عہدِ کرمِ دوست کو رسوا نہ کریں گے

حامد علی خاں

اسلام اور اشتراکیّت

مغربی ممالک میں اشتراکیّت کا ظہور اُس منافرت کا نتیجہ ہے جو پیشہ ور اور مزدور جماعتوں کے دلوں میں سرمایہ داروں کے ظلم وستم کی وجہ سے راسخ ہوگئی ہے چونکہ سرمایہ دار برسرِ اقتدار ہیں اور کلیسیا ہمیشہ سے ان کا ساتھ دیتا رہا ہے۔ ساتھ ہی مزدور طبقہ کی استدعاؤں کے باوجود اصلاحِ حال سے غفلت برتتا رہا ہے۔ اس لئے بتدریج اشتراکی مسیحیت کو سرمایہ داری کا مترادف سمجھنے لگے اور مذہب سے سخت متنفر ہوتے گئے۔ ان کا یہ رجحانِ خاطر ایک بڑی حد تک برسرِ حق تھا۔ کیونکہ ان کی ساری معلومات صرف کلیسائی مذہب تک محدود رہی ہیں۔ وہ حضرتِ مسیح کے سچے مذہب سے بھی جیسا کہ وہ فی الحقیقت ہے واقف نہیں رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب ان کی واقفیت کے معیار سے اب تک اس مسئلہ کا خاطر خواہ حل پیش نہ کرسکا تھا ان کی پیدائش مغربی ممالک میں ہوئی اور انہوں نے اسی سرزمین میں ہوش سنبھالا تھا۔ اسلام کی تعلیمات سے بے خبر تھے اور جو کچھ علم انہیں اسلام کے متعلق حاصل ہوسکا تھا وہ تمام تر عیسائی ذرائع ہی سے حاصل ہوا تھا اور اس پر تعصب کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اشتراکی ہر مذہب کے مخالف ہوگئے۔ اور مذاہب کو تباہ کرنا ان کے لائحہ عمل کا ایک جزو قرار دیا گیا۔ ان کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اسلام حقیقی اشتراکیت کا معلّمِ اوّلیں ہے۔ اب بتدریج تاریکی کا پردہ اٹھتا جارہا ہے اور انہیں معلوم ہو رہا ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی دنیا کا ایک ایسا مذہب ہے جس کے وسیلہ سے حقیقی اشتراکیت ——— نہ آج کل کی اشتراکیت جیسی کہ روس میں رائج ہے ——— دنیا کو نجات دلاسکتی ہے۔ اس بیان کی تصدیق کے لئے چند مثالیں کافی ہیں۔

اسلام کا قانونِ وراثت ایک ایسا حکیمانہ اور عادلانہ قانون ہے کہ جس کی وجہ سے ملک دار امیر طبقہ اور سرمایہ دار کروڑپتی کا وجود ہی کالعدم ہوگیا ہے ہر متوفی مسلمان کی ملک اُس کے ورثا میں تقسیم کردی جاتی ہے حقِ افضیلت واکبریتِ اولاد جیسا کہ دیگر مذاہب میں ہے اسلام میں نہیں یعنی متوفی کی ملک کسی خاص وارث یا ورثا کو نہیں مل جاتی۔ بلکہ جملہ ورثا میں تقسیم اور اولاد در احفاد میں بٹتی چلی جاتی ہے بیوی کو اپنا حصۂ رسدی تو ملتا ہے۔ مگر بعض صورتوں میں بیوی کے والدین کو بھی حصہ ملتا ہے کوئی شخص بھی

اپنی مِلک کا ایک تہائی سے زیادہ حصّہ کسی اپنے رشتہ دار یا غیر کو دے نہیں سکتا۔ البتہ خیرات اور وقف کی صورت میں اپنی ساری ملک اُسے دے دینے کی اجازت ہے۔ عرب کے اس مقنّنِ اعظم کا مقصدِ عظیم یہ تھا کہ مال و دولت کو اپنے ملک میں یکساں تقسیم کر دیا جائے تاکہ افرادِ انسانی مراتب کے اعتبار سے کم و بیش ایک ہی حالت پر ہوں اور ہر فرد کو یکساں موقع حاصل ہو۔ اسی غرض کو مدِ نظر رکھ کر مالداروں پر اسلامی قانون نے سالانہ زکواۃ فرض کر دی ہے۔ اشتراکیت کی آخری حد اسلام میں یہ ہے کہ اگر کسی کی زمین ایک مدّت تک غیر مزروعہ پڑی رہے تو اُس کے ہمسایہ کو یہ حق حاصل ہے کہ بحقِ ملّت اُس میں زراعت کرے۔ اِس اصُول کی بنا پر کہ تمام افرادِ انسانی آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور ایک کے لئے دوسرے کی مدد کرنا لازم ہے۔ اسلام نے سود خواری سے منع کر دیا ہے اِس ممانعت کی وجہ سے انسان میں تجارت اور محنت کرنے اور کفایت شعار بننے کی رغبت پیدا ہوتی ہے اور بنکوں میں مال و دولت جمع کرنے کی حرص کم ہوتی ہے۔ اور سود خواروں کا وجود جو انسانی سوسائٹی کی خوشحالی کے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتا ہے، غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ مزید بریں یہ ایک ضربِ کاری ہے سرمایہ داری کے جسم پر۔ روپیہ اور دوسری اشیاء حاجت مندوں کو بلا سود قرض دی جاسکتی ہیں۔ قرآن کا حکم اس بارے میں حسبِ ذیل ہے :-

"دوسروں کے ساتھ ناانصافی سے پیش نہ آؤ تو تمہارے ساتھ بھی ناانصافی نہ کی جائے گی۔ اگر کوئی مقروض سخت تکلیف میں ہو تو اُسے اُس کی حالت سنبھل جانے تک مہلت دو۔ اگر تم قرض معاف کر دو تو تمہارے حق میں یہ بہتر ہوگا۔ اگر تم سمجھو۔ قرانِ حکیم میں ایک اور جگہ دولت جمع کرنے کے بارے میں امتناعی حکم آیا ہے" اے ایمان والو! سچ ہے کہ اکثر عالم اور زاہد فخر سے لوگوں کا مال کھا جاتے ہیں اور انہیں راہِ خدا سے منحرف کر دیتے ہیں۔ مگر اُن سے کہہ دیا جائے کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور راہِ خدا میں نہیں دیتے وہ سخت عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے"۔

اسلام میں قمار بازی کی سخت ممانعت ہے اور غالباً اس حکم کی غرض و غایت یہ ہوگی کہ کوئی فردِ واحد اپنے کسی غریب بھائی کی کمائی سے دولت مند نہ بن جائے۔ قرآن میں گراں فروشی اور احتکار کی بھی ممانعت کی گئی ہے اور قرآن ایسوں پر لعنت بھیجتا ہے۔ اگر عیسائی دنیا اسلام اختیار کر لیتی اور اُسے معاشری زندگی میں اپنا خضرِ راہ بنا لیتی تو یقیناً اجارہ داری کی لعنت سے جو اصولِ مساوات کی دشمن ہے اور جس پر انفرادی حقوق کی عمارت قائم ہے، بچ جاتی۔ اجارہ داری درحقیقت ایک دوسرا طریقہ ہے قلیل التعداد طبقۂ امراء کے پیدا کرنے کا جو باقی افرادِ ملت کی قربانی اور ایک فرد کی خون آشامیوں سے پیدا

ہوتا ہے۔ رسولِ مقبولؐ نے فرمایا ہے کہ اجارہ داری گناہ گاری ہے۔ مغربی تہذیب نے جس کی دایہ گری نام نہاد مسیحیت کر رہی ہے وہ سر بفلک مگر سرگراں قصر کھڑے کئے ہیں جن کا جاہ و جلال دنیا کی غریب اقوام کی مسلسل خوں ریزیوں کا نتیجہ ہے۔ اگر یہی تہذیب اسلام کو اپنا سنگِ بنیاد قرار دیتی تو نظامِ زکوٰۃ کے ذریعہ سے ان دونوں باتوں کے درمیان کہ انسان کیا ہے۔ اور اُسے کیا ہونا چاہیئے حقیقی توازن قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتی اس کے متعلق گبن اپنے مشہور الفاظ میں یوں کہتا ہے رسولؐ عربی شاید دنیا کے ایک ہی ایسے مقنن ہیں جنہوں نے خیرات کی ٹھیک ٹھیک مقدار بتادی ہے۔ مقدارِ خیرات مال و دولت کی نوعیت اور درجہ پر موقوف ہے۔ چاہے وہ جنس کی صورت میں ہو یا روپیہ اور مویشی کی صورت میں مگر مسلمان اُس وقت تک قانون سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے جب تک کہ عشر ادا نہیں کر دیتے" حقیقی اشتراکی زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس مادی دنیا میں ہم توقع نہیں کر سکتے کہ کوئی انسان اپنی ذاتی منفعت کو چھوڑ کر کسی صورت میں قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔ خیرات پہلے گھر سے شروع ہوتی ہے یہ ہے ہماری ذہنیت۔ مگر اسلام اور صرف اسلام ہی وہ محرک مہیا کرتا ہے جو ایمان والوں کو قربانی کرنے کی ترغیب دیتا ہے کہ اپنے مال و دولت کو محض رضائے الٰہی اور ثوابِ عقبیٰ کے لئے تقسیم کر دیں۔

ہمیں امید ہے کہ ہماری اِس مختصر تحریر کو غور سے پڑھا جائے گا۔ ممکن ہے اشتراکیت جس کا شعلہ حتمی طور پر بجھ جانے والا ہے وہ صحیح اور مضبوط بنیاد پر قائم ہو جائے، تو پھر زندہ رہے اور دنیا کو مادہ پرستی اور سراج کے آہنی پنجہ سے نجات دِلا دے۔

ترجمہ **ایم عبد القادر**

تمہاری زندگی تمہارے خیالات کا پرتو ہے۔ اگر تم اپنے موجودہ حالات سے مطمئن نہیں ہو یا تمہاری سابقہ زندگی کے امتحان کا نتیجہ ناتسلی بخش ہے

تو اپنے خیالات کو بدل دو

میر زمان خاں فائق

ڈاکو

وارڈ کے جنوب میں راتب کی جانب دو شکستہ حال ٹیلے دکھائی دیتے ہیں جو "ڈاکوؤں کے تہ خانے" کہلاتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی وقت ڈاکوؤں کا ایک گروہ وہاں قیام رکھتا تھا۔ اُس زمانے میں تقریباً ناممکن تھا کہ کوئی مسافر ڈاکوؤں کی لوٹ مار سے بچ کر سٹرک پر سے گزر سکے۔ مزدوروں اور بساطیوں پر توخصوصاً ان ڈاکوؤں کی نظر عنایت رہتی تھی۔ حکام کے لئے اس گروہ کا کھوج لگانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے گیلرپ اور اردگرد کے دوسرے دیہات میں اپنی کمینگاہیں بنا رکھی تھیں۔

شام ہوتے دیر ہو چکی تھی کہ ایک نوجوان انڈروفوم پہنچا۔ انڈروفوم وارڈ کے نزدیک ایک رئیسندار نائٹ کی پُرانی حویلی تھی۔ اس نے وہاں رات بسر کرنے کی اجازت طلب کی اور کہنے لگا کہ کچھ ڈاکو جو میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے میرا تعاقب کر چکے ہیں اس لئے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ آج رات سفر کروں۔ ایک ویران جگہ میں ڈاکوؤں نے مجھ پر حملہ کر دیا میرا گھوڑا ایک ایسے رستے سے جو سٹرک کے آرپار پھیلایا گیا تھا الجھ کر گر پڑا اور میں بمشکل تمام پیدل بھاگ کر انڈروفوم پہنچ سکا ہوں۔

صاحب خانہ اور اس کی حسین بیٹی نے نہایت اخلاق و مروت سے اجنبی کا خیر مقدم کیا اور ڈاکوؤں کے حادثہ کی وجہ سے اجنبی کے دل پر جو ناخوشگوار اثر پڑا تھا اس کے دور کرنے کے لئے پوری توجہ صرف کر دی اس ناگوار واقعہ کے اثر کو زائل کرنا باپ کے لئے اور بھی زیادہ آسان ہو گیا کیونکہ دوران گفتگو میں اجنبی نے ایک سلجھے ہوئے اور شائستہ دماغ کی لطافتِ احساس اور نزاکتِ فہم ظاہر کی۔ اسی طرح لڑکی کے لئے بھی اس وجہ سے مسافر کی دلجوئی زیادہ آسان ہو گئی کہ وہ ایک خوبصورت آدمی تھا اور اس نے اس نازنین کو مخاطب کرنے کے پہلے ہی لمحہ میں پوری پوری کوشش صرف کر دی کہ اس کے حسن اور جوانی نے جو حیرت افزا مسرت اس کے دل میں پیدا کر دی تھی وہ اس پر ظاہر ہو جائے۔ پس یہ ایک قدرتی امر تھا کہ وہ دونوں کی دلچسپی کا موجب ہو سکے۔

نوجوان کہنے لگا میرے باپ کا نام کیلڈ ہے ہم کولڈنگ سے پرے رہتے ہیں۔ میں سیر و تفریح کے لئے تمام موسم خزاں ملک میں سفر کرتے گذار آیا ہوں۔

رات ختم ہو چکی تھی اب دن بھی گذر گیا لیکن اجنبی اب بھی اندرد قوم ہی میں تھا۔ گھروالوں کو اس کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی نظر آنے لگی۔ نوجوان نے بڑے شوق سے زمیندار نائٹ کے شکار اور تاش کی پارٹیوں میں حصہ لیتا۔ اس کی موجودگی نے خاتون کی بے کیف زندگی کے تسلسل کو بھی توڑ دیا۔ وہ اُسے ان ملکوں اور شہروں کے حالات سناتا جن کی سیر وہ کر چکا تھا اور وہ نہایت شوق اور توجہ سے سنتی۔ جب وہ اُس کی خوشامد کرتا اور سرگوشیوں میں اس کے حسن کی تعریفیں کرتا تو وہ شرما کر نظریں نیچی کر لیتی۔

اس طرح کیلڈ نے اس مکان میں ایک مہینہ گذار دیا۔ ہر روز وہ اپنی روانگی کا دن مقرر کرتا لیکن اُسی طرح ہر روز میزبان کی التجائیں اُسے کچھ دیر اور وہیں ٹھہرنے پر مجبور کر دیتیں اور لگاتار اُس کی روانگی ملتوی ہوتی رہی۔ آخر کار ایک دن ایسا بھی آگیا کہ جب اُس نے اپنے میزبان کو خیرباد کہی۔ اب نوجوان دوشیزہ اس سے منسوب ہو چکی تھی وہ گھر کے مالک اور اپنی منسوبہ کو رنج وغم میں چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو گیا لیکن جانے کی اجازت اُسے اس وقت ہی ملی جب اُس نے جلد پھر واپس آنے کا وعدہ کر لیا اُس نے کہا کہ میں جا کر اپنے گھروالوں کو مطلع کرآتا ہوں اور اگر ممکن ہوا تو اپنے باپ کو ساتھ لانے کی کوشش کروں گا۔ اندرد قوم کے رہنے والوں کو اس کی غیر موجودگی بہت ہی لمبی اور تھکا دینے والی معلوم ہوتی تھی۔ آخر کار جب وہ وہاں سے واپس آیا تو نہایت خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ وہ اپنے ساتھ نہ صرف اپنے باپ کی اجازت لایا بلکہ گھر والوں کے بہت سے پرخلوص پیغام۔ اس کے باپ نے اس بات کے لئے بہت معذرت کی تھی کہ وہ بیماری کی وجہ سے بیٹے کے ہمراہ نہیں آسکا۔

نوجوانوں کی شادی کے لئے بہار کا موسم مقرر ہوا اس دوران میں کیلڈ اسی بڑی حویلی میں مقیم رہا اور روز بروز باپ بیٹی کے دل میں گھر کرتا گیا۔ باپ کا خیال تھا کہ شکار کے تعاقب کرنے میں کوئی کیلڈ کا ثانی نہیں۔ اگرچہ وہ خود بھی ایک اعلیٰ درجہ کا شکاری تھا۔ کیلڈ کا رجحانِ طبیعت میدان کے کھیلوں کی طرف زیادہ تھا اور بجائے اس کے کہ وہ زیادہ وقت اپنی منسوبہ سے دلچسپی لینے میں بسر کرتا وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ یا تو پہاڑی وادیوں میں گذارتا یا جنگل میں ڈاکوؤں نے ان دنوں غیر معمولی لوٹ مار مچا رکھی تھی لیکن نہ تو ڈاکوؤں کا خوف اور نہ خاتون کی التجائیں کیلڈ کو اس شوق سے مانع رکھ سکتیں۔

ایک روز کیلڈ حسبِ معمول شکار کے لئے نکلا۔ اس کے واپس آنے سے پہلے شفق کی سُرخی غائب ہو چکی تھی۔ نوجوان دوشیزہ کا خطرہ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا گیا۔ آخر کار اُس نے اپنے باپ کو مجبور کیا کہ وہ باہر جا کر کیلڈ کو ڈھونڈھ لائے۔ باپ بیچارہ گھوڑے سے گر پڑنے کی وجہ سے اپنے پسندیدہ شغل میں حصہ نہ لے سکا تھا بوڑھا آدمی چلا گیا اور بہت دیر تک جنگل میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن کہیں بھی کیلڈ کا پتہ نہ چلا۔ دفعتہً

اس نے سُنا کہ قریب ہی کوئی شخص اس کا نام لے رہا ہے اور وہ شکلیں اُس کو اپنی طرف آتی دکھائی دیں۔ وہ ان اجنبی شکلوں سے پوشیدہ رہنے کے لئے احتیاطاً ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ لوگ لگاتار باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتیں سُن کر بوڑھے آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کو ذرا بھی شک نہ رہا کہ وہ ڈاکوؤں کے کمینگاہوں کے بہت قریب ہے۔ اب وہ چپکے سے نتیجہ کا منتظر رہا۔

چند منٹ باتیں کرنے کے بعد بولنے والے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ ایک تو بڑی سڑک کے کنارے کے پار ہو گیا اور دوسری جو اس دُھندلکے میں بھی ایک بوڑھی عورت معلوم ہوتی تھی اُس کے پاس سے گذر کر جھاڑیوں میں داخل ہو گئی۔

گھنی جھاڑیوں سے گھرے ہوئے ٹیلے کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحہ کے لئے بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چاروں طرف نظریں دوڑا رہی ہے۔ پھر اُس نے صاف صاف بغیر کسی دقت کے ایک بڑا سا پتھر اپنی جگہ سے سرکایا جو ٹیلے کے دامن میں پڑا تھا اور رینگ کر اس سوراخ میں داخل ہو گئی جو اس پتھر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ پھر اندر سے اس نے پتھر سرکا کر پھر پہلی جگہ کر دیا۔

بوڑھے آدمی نے ایک ہی لمحہ میں سوچ لیا کہ اسے اب کیا کرنا چاہئیے۔ اس نے اپنی تلوار میان سے نکالی اور پتھر کو ایک طرف ہٹا کر اس عورت کے پیچھے ہو لیا۔ جب سُوراخ ختم ہو گیا تو اُس کا پاؤں ایک ڈھلوان زینے پر پڑا۔ اس زینے کی مدد سے وہ نہایت دبے پاؤں نیچے اتر گیا۔ سوراخ بتدریج کھلا ہوتا گیا۔ جب اس کے پاؤں دوبارہ زمین سے لگے تو وہ ایک تہ خانے میں تھا۔ یہ تہ خانہ ناتراشیدہ پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ اس کی بھورے رنگ کی دیواریں دو شمعوں سے روشن کی گئی تھیں۔ غاریں کچھ ہتھیار اور کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ اور ایک لمبی سی میز کھانے کی چیزوں اور شراب کی بوتلوں سے بھری پڑی تھی۔ چھت کے ساتھ ایک بڑا گھنٹہ آویزاں تھا جو چھت سے اس طریق پر پیوست کیا گیا تھا کہ جب کوئی مسافر یا سوار اوپر کی سڑک سے گذرتا تو یہ ٹن ٹن کرنے لگتا۔ انڈرو فوم کے آقا کی خوش قسمتی تھی کہ جب وہ تہ خانے میں پہنچا تو بوڑھی عورت کے سوا اور کوئی وہاں موجود نہ تھا۔ لیکن اسے اس کی موجودگی کا علم کیسے ہو سکتا تھا بلکہ وہ تو ایک طرح اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ وُہ سڑک کے نیچے سے گذر کر مقابل کے دوسرے ٹیلے کی طرف جا رہی تھی۔ جو آواز بوڑھے نائٹ کے داخل ہونے سے پیدا ہوئی ہو گی اس نے نہ سُنی۔ جب وہ واپس آ گئی تو نائٹ نے اُس کی نہایت آہستہ اور محتاط چال سے اور جس انداز سے وہ اپنے ہاتھ سامنے پھیلا پھیلا کر چلتی تھی اندازہ لگایا کہ وہ اندھی ہے۔

جب وہ خوف اور حیرانی سے کچھ منٹ یہ نظارہ دیکھ چکا تو دفعتہً چھت والا گھنٹہ بجنے لگا۔ بوڑھی نے ایک اطمینان کا قہقہہ لگایا اور بڑبڑا کر کہنے لگی۔ "وہ آ گئے! دیکھئے آج رات وہ اپنے ہمراہ کیا لاتے ہیں۔"

بوڑھے نائٹ نے جب دیکھا کہ وہ سخت خطرے میں ہے تو چھپنے کے لئے کوئی جگہ ڈھونڈنے لگا۔ جب ڈاکوؤں نے اوپر کا بڑا پتھر سرکایا تو وہ ایک چارپائی کے نیچے جا چھپا جو غار کے ایک کونے میں بچھائی گئی تھی۔ اُسے بہت سے لوگوں کا شور سنائی دیا اور آٹھ دس ڈاکو غار میں اتر آئے۔ ان میں سے ایک ڈاکو ایک نوجوان عورت کی لاش بازوؤں میں اٹھائے ہوئے تھا۔

بوڑھی ماں! دیکھنا!! اس نے چلا کر کہا یہ ہمارا آج رات کا تحفہ ہے جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ میں نے آج تک اس قدر حسین عورت نہیں دیکھی۔ میں تو اس کے حاصل کرنے کے لئے بھیانک کام کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ ہاں صرف اگر میں وقت پر پہنچ سکتا تو وہ زندہ رہ سکتی اور میری بیوی کہلاتی۔ اب جو کچھ کرنا باقی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے جواہرات اتار لئے جائیں اور پھر اس کو دوسروں کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔

یہ سُن کر کچھ ڈاکوؤں نے لاش کے تمام زیورات اتار لئے۔ اب تک وہ بجز ایک بڑی سی وزنی انگوٹھی کے ساری لاش پر ہاتھ صاف کر چکے تھے لیکن انگوٹھی کافی کوشش کے باوجود بھی انگلی سے نہ اتری۔ ایک آدمی نے ایک چھوٹی سی کلھاڑی لی اور لاش کا ہاتھ چارپائی کے ایک کنارے پر رکھ کر ایک وار میں انگلی کاٹ پھینکی چونکہ وار تیزی سے کیا گیا تھا اس لئے انگلی کٹ کر چارپائی کے نیچے جا گری اب ڈاکوؤں نے اپنا تحفہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ اور بوڑھے نائٹ کے پکڑے جانے کا قوی اندیشہ ہو گیا خوش قسمتی سے ایک آدمی بول اُٹھا "چلو رہنے بھی دو یارا! میں پھر کسی وقت اسے ڈھونڈ لوں گا۔ بہتر ہو گا اگر ہم پہلے لاش کو "دوسرے ٹیلے" کے نیچے دفن کر دیں اور فارغ ہو کر کھانا کھائیں۔

یہ تجویز مان لی گئی اور تھوڑی دیر میں ڈاکو ایک میز کے اردگرد اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور انہوں نے شام کے کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ بوڑھا نائٹ چارپائی کے نیچے سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جوں جوں وہ زیادہ شراب پیتے جاتے فرار کا موقعہ حاصل ہونے کی امید بڑھتی جاتی۔ شراب کے بے پناہ استعمال نے انہیں بالکل مدہوش کر دیا تھا۔ اب وہ میز سے اٹھ کر آرام کرنے لگے۔ رات کافی گذر چکی تھی جونہی کہ روشنی گل کی گئی، بوڑھے نائٹ نے اپنی جگہ چھوڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے آہستہ آہستہ چارپائی کے نیچے سے پنجوں کے بل رینگ کر نکلنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ زینے کے قریب جا پہنچا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا جب وہ زینے پر چڑھنے لگا تو اس کا پاؤں اکھڑا اور وہ دھم سے زمین پر آن گرا اس آواز نے سونے والوں میں سے ایک کو جگا دیا وہ بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا کہ کون ہے؟ جب اُسے جواب نہ ملا تو وہ سیڑھیوں کی طرف لپکا کیا دیکھتا ہے کہ کوئی آدمی پتھر ہٹا کر سوراخ سے باہر نکل رہا ہے۔ ایک ہی لمحہ میں باقی کے تمام ڈاکو بھی چوکنے ہو گئے اور پکار کر بولے رات کے وقت کس نے یہاں برہمی ڈالی ہے جب ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو سیڑھیوں

کی طرف دوڑے اور بھاگتے ہوئے نائٹ کے پیچھے ہولئے۔ لیکن رات اس قدر تاریک تھی کہ بہت تھوڑے فاصلہ سے بھی یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ مفرور نے کونسی راہ اختیار کی ہے۔ نائٹ جب جھاڑیوں والے رستے کو طے کرکے باہر نکلا تو اُسے ایک گھوڑا ملا۔ یقیناً یہ ڈاکوؤں میں سے کسی ایک کا ہوگا۔ نائٹ اس پر چڑھ گیا اور اسے سرپٹ دوڑا دیا۔ لیکن اس نے یہ نہ سوچا کہ جو سڑک اُس نے اختیار کی ہے وہ اسے انڈرو فوم سے دور سے دُور لے جا رہی ہے۔

ڈاکوؤں نے بھی برابر تعاقب جاری رکھا۔ بوڑھا نائٹ گھوڑے پر سوار تو تھا ہی اور اس وجہ سے اس نے فاصلہ بھی کافی طے کر لیا تھا لیکن پھر بھی وہ اس سڑک سے دور نہ نکل سکا کیونکہ یہ سڑک جھاڑیوں کے اردگرد کی تمام پگڈنڈیوں کو حلقے بنا کر اور گھوم گھوم کر کاٹتی تھی۔ اس کا تعاقب کرنے والے ہر پگڈنڈی سے واقف تھے۔ انہوں نے نزدیک ترین رستہ اختیار کیا اور چند ہی منٹوں میں ایک ڈاکو نے نائٹ کو آلیا۔ اس نے نائٹ کے گھوڑے کی دُم اپنے ہاتھ کے اردگرد مضبوط لپیٹ لی اور اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔

نائٹ نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور دیکھا کہ اسکی زندگی کا دارومدار کسی فوری تدبیر پر منحصر ہے۔ اُس نے اپنی تلوار کھینچ کر باہر نکالی اور ڈاکو پر وار کیا۔ تاریک اندھیرے میں یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ ضرب کہاں لگی ہے لیکن یہ ضرور سنائی دیا کہ تعاقب کرنے والا ایک کرخت چیخ مار کر زمین پر گر پڑا ہے۔

اب وہ پھر آزاد تھا۔ اس نے گھوڑے کو مہمیز لگائی اور واٹرڈ کے قصبے کی طرف گھوڑا سرپٹ دوڑایا۔ اب وہ دیس کے قریب پہنچ گیا تھا جو ایک وسیع وادی تھی۔ لیکن اس نے دیکھا کہ دریا میں اس قدر طغیانی آگئی ہے کہ سڑک سے گذرنا مشکل ہے۔ یہ سڑک وادی سے گذرتی ہوئی شہر کے جنوبی دروازے سے جا ملتی تھی۔ اس نے سوچا کہ محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ میں گیلرب کی طرف جاؤں اور صبح تک وہیں رہوں۔

اگرچہ اس نے کچھ دیر سے تعاقب کرنے والوں کی کوئی آہٹ نہ سنی تھی۔ لیکن اس کو یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ پھر اسی پگڈنڈی کے رستہ سے واپس جائے جس سے خطرہ تھا کہ وہ پھر اسی ٹیلے کے نزدیک ڈاکوؤں کے قریب جا پہنچے گا۔ تاہم اس نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑ لی اور تھوڑی ہی دیر میں گیلرب پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ تمام دروازے بند ہو چکے ہیں یہاں تک کہ سرائے کے دروازے بھی بند ہو چکے تھے۔ بیچارہ نائٹ واپس جانے ہی والا تھا کہ اُسے روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی، جو ایک جھونپڑی کی کھڑکی سے دکھائی دے رہی تھی۔ یہ جھونپڑی باقی تمام مکانوں سے علیحدہ واقع تھی۔ اس نے فوراً اپنے تھکے ماندے گھوڑے کو اس طرف موڑا اور جا کر دروازے پر دستک دی۔ ایک نوجوان خاتون اور ایک لڑکے نے اس کا خیر مقدم کیا اور بڑی خوشی سے اُسے رات بسر کرنے کی اجازت دے دی۔ لڑکی نے ایک شمع ہاتھ میں لے لی تاکہ اصطبل میں گھوڑا

باندھنے کے لئے نائٹ آسانی سے رستہ دیکھ سکے۔

جب وہ گھوڑا باندھ کر اصطبل سے باہر نکلنے لگے تو چھوٹا لڑکا جو ان کے پیچھے پیچھے آرہا تھا دفعتہً چلا اُٹھا "ہیں یہ کیا؟ اس گھوڑے کی دُم سے کیا لٹک رہا ہے" یہ الفاظ کہہ کر لڑکے نے گھوڑے کی دُم کے الجھے ہوئے بالوں سے ایک انسانی ہاتھ کھینچ کر باہر نکالا جو بازو سے کٹ کر جدا ہو گیا تھا۔ وہ اُسے شمع کے قریب لے جا کر دیکھنے لگا۔ جب لڑکی کی نظر اس پر پڑی تو ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ بوڑھا نائٹ اس ہاتھ کو دیکھ کر ذرا بھی حیران نہ ہوا کیونکہ اُسے فوراً خیال آ گیا کہ یہ ہاتھ اسی ڈاکو کا ہے جس پر اس نے وار کیا تھا۔

"دیکھو تو جین" لڑکے نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ تو میرے بھائی کا ہاتھ ہے۔ انگوٹھے پر جو نشان ہے اس سے میں اسے پہچانتا ہوں اور یہ سونے کی انگوٹھی بھی اسی کی ہے"۔

لڑکی نے قہر آلود نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھا اور اسے خاموش رہنے کے لئے آنکھ سے اشارہ کیا۔ اب بوڑھے آدمی کو سخت خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اس نے سوچا کہ بلاشک وشبہ جھونپڑی کے رہنے والوں کا ڈاکوؤں سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس لئے بغیر کوئی لفظ کہے نائٹ نے اپنا گھوڑا اصطبل سے نکالا اور اس پر سوار ہو کر وارڈو کی طرف واپس پھرا۔ ہر لحظہ اسے خطرہ تھا کہ ڈاکو اسے آ نہ لیں۔

جب ویلس کی وادی تھوڑے فاصلہ پر رہ گئی تو بوڑھے نے منت مانی کہ اگر میں نے بخیر و عافیت پانی عبور کر لیا تو میں وارڈ کے قریب ایک گرجا تعمیر کراؤں گا۔ اُس نے اپنے گھوڑے کا رُخ موڑا اور پانی کے پار بخیر و عافیت پہنچ گیا۔

صبح نمودار ہو چکی تھی۔ وہ ابھی واپس گھر جا رہا تھا علی الصباح اسے کیلڈ ملا جو انڈر وفوم کو جا رہا تھا۔ کیلڈ اس سے کہنے لگا جناب شکار کے دوران میں میرا گھوڑا ایک کھائی میں گر گیا۔ میں سخت زخمی ہو گیا اور وہیں بیہوش پڑا رہا۔ آخر کار وہاں سے کچھ کسان گذرے جب انہوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو وہ مجھے ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچا آئے جس نے میری مرہم پٹی کی اب میں کچھ چل پھر سکتا ہوں۔

باپ اور منگیتر کی فکر میں کیلڈ کی منسوبہ نے نہایت خطرے اور بے اطمینانی سے رات گزاری تھی۔ لیکن بوڑھے نائٹ کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ رات کے ناخوشگوار حادثہ کی یاد تک اس کے دل سے محو ہو چکی ہے وہ حسب معمول مسرور اور خوش طبع معلوم ہوتا تھا۔ اس نے تمام رات غائب رہنے کیلئے معذرت پیش کی اور کہا جب میں کیلڈ کو تلاش کر رہا تھا تو میری ایک ہمسایہ سے مُلاقات ہو گئی جو اپنے دوستوں کے ہمراہ شکار سے واپس آ رہا تھا اور میں نے ان کی معیت ہی میں رات گذار دی۔

ان تمام مہمات کے بعد کے دن دوشیزہ کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ پرانے رسم و رواج کے مطابق اس تقریب

پر شاندار دعوت منائی جاتی تھی۔ دوپہر سے پہلے ہی مہمان گھر میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ہر طرف خوشی اور مسرت چھا گئی۔ صرف کیلڈ ہی خیالات میں مستغرق اور غمگین سا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ فطری طور پر خاموش ہو گیا ہے۔ لیکن اس کا زرد چہرہ یہ ضرور ظاہر کر رہا تھا کہ حادثہ کی تکلیف ہی نے اس میں یہ تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اپنی منسوبہ کے لیئے اس کا دل پہلے ہی کی طرح محبت سے بھرا ہوا اور مہربان معلوم ہوتا تھا۔ نوجوان جوڑے کی آئندہ خوشی کے لئے میز پر بہت سے جام صحت خالی کیئے گئے۔ کھانے کے بعد کا وقت نہایت خوشی سے کہانیاں اور لطیفے سننے میں گذرا۔

جب ہر ایک اپنی خوشی کا خزانہ ختم کر چکا اور گفتگو کا سلسلہ ذرا ٹوٹا تو میزبان اپنے مہمانوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میں تمہیں ایک عجیب وغریب خواب سناؤں گا جو میں نے گذشتہ رات دیکھا ہے۔ جتنے خواب میں اب تک دیکھ چکا ہوں ان میں سے یہ عجیب ترین ہے"۔

اس تمہید کے بعد اس نے گذشتہ رات کے واقعات بیان کرنے شروع کیئے کہ کس طرح وہ ٹیلے کے قریب کی گھنی جھاڑیوں میں آیا اور کس طرح اس نے کسی کو اپنا نام لیتے ہوئے سنا کس طرح وہ بوڑھی عورت کے پیچھے پیچھے غار میں گیا اور کس طرح اس نے اپنے آپ کو ڈاکوؤں کی آمد پر چھپا لیا۔

بوڑھا نائٹ کہنے لگا "میں اُس لاش کو جو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے دیکھ تو نہ سکا لیکن جب ڈاکوؤں نے انگلی کو کاٹ ڈالا جس میں سونے کی انگوٹھی تھی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس چارپائی کے نیچے آگری ہے جس کے نیچے میں چھپا تھا اگرچہ یہ سب کچھ صرف خواب ہے لیکن اس کے باوجود ــــــ وہ انگشتری یہ ہے"

یہ لفظ کہہ کر اُس نے کٹی ہوئی انگلی باہر نکالی اور اپنے سامنے کی میز پر رکھ دی۔ تمام حاضرین کے منہ سے حیرانی کے کلمے بلند ہوئے لیکن اس کہانی کا کسی پر بھی اتنا گہرا اثر نہ ہوا جتنا کہ کیلڈ پر۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا اور وہ کمرے سے باہر جانے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھا لیکن بوڑھے آدمی نے اسے پکڑ کر پھر بٹھا لیا اور بڑے دوستانہ انداز سے کہنے لگا۔

"میرے داماد! تمہیں ضرور ابھی ہمارے پاس ہی رہنا ہوگا۔ تمہیں میری کہانی اخیر تک سننی چاہیئے ابھی اس کا بہترین حصہ تو سنایا ہی نہیں گیا"۔

پھر اس نے بتایا کہ وہ کس طرح اس جگہ سے بھاگا کس طرح وہ ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور کس طرح اس کا تعاقب کیا گیا اور اُسے دیس کے قریب کون کون سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کی بنا پر وہ پھر سے گیپ جانے پر مجبور ہو گیا۔

بوڑھے آدمی نے سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کہا "بچے نے زخمی ہاتھ پہچان لیا اور کہنے لگا یہ تو میرے بھائی کا ہاتھ ہے ——— مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب میں گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگا تھا تو میں نے وہ ہاتھ بھی اپنے ہمراہ لے لیا تھا۔ اگرچہ جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں یہ سب کچھ صرف ایک خواب ہے لیکن اس کے باوجود میں وہ ہاتھ آپ کے سامنے رکھ سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک انسانی ہاتھ باہر نکال کر میز پر رکھ دیا جو کلائی کے قریب سے کاٹ ڈالا گیا تھا خواب سنانے والے نے اس ناقابل بیان حیرت کی کچھ پروانہ کی جس نے سب حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"میں نے سوچا کہ مجھے اس ہاتھ کی پہچان اس کی انگلی کی انگوٹھی سے کرنی چاہئے اور اس کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہاتھ میرے ہی دوستوں میں سے کسی ایک کا ہے۔"

بوڑھا نائٹ اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ پکڑ کر کیلڈ کی طرف پھینک دیا جس کی حالت مردہ سے بدتر ہو گئی تھی۔ وہ سب کہانی شروع سے اخیر تک سن چکا تھا۔

نائٹ کہنے لگا کیلڈ اپنی انگشتری واپس لے لو!! ذرا دیکھو تو کہ یہ ہاتھ تمہارے کٹے ہوئے بازو کو پورا آتا ہے یا نہیں جس پر تم نے پٹی باندھ رکھی ہے۔"

سب مہمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ تمام نگاہیں کیلڈ پر گڑ گئیں۔ اُس نے اپنا بازو ایک پٹی میں لٹکا رکھا تھا جو اس کے گلے میں بندھی تھی۔ نائٹ جھپٹ کر آگے بڑھا اور کیلڈ کے بازو پر جو پٹی لپٹی ہوئی تھی اُسے کھول دیا اور دیکھا کہ اس کا ہاتھ کٹ چکا ہے۔

نائٹ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کیلڈ سے کہنے لگا "اس وقت تمہاری کمینگاہ کو وارڈ کی پولیس محصور کر چکی ہے۔ تمہارے ساتھی قید کر لئے گئے ہیں اور میں ان لوگوں کے یہاں پہنچنے کی آواز سن رہا ہوں جو تمہیں اس جگہ سے زیادہ موزوں جگہ لے جائیں گے۔"

کیلڈ ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار تھا اس نے نائٹ سے اس لئے دوستی پیدا کی تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو حویلی میں داخل کرنے کے لئے بہتر رہنمائی کرنے کا موقع حاصل کر سکے اور بوڑھے آدمی کی دولت لوٹ لے۔ اس کے بعد اس کے ساتھیوں کا اسی ٹیلے پر قلع قمع کر دیا گیا۔ اور وہ اُسی ٹیلے پر قتل کر دئے گئے۔ جو مدت سے ان کی جائے پناہ بنا رہا تھا۔

بوڑھے آدمی نے اپنی قسم کے مطابق وارڈ میں "چھوٹا گرجا" تعمیر کرا دیا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ جب وہ سنگِ بنیاد رکھنے لگا تو اُس نے یہ الفاظ کہے۔

"جو آدمی اس گرجے کو مسمار کرنے کی ابتدا کرے اس پر ابدی لعنت رہے"۔
چند سال گذرے جب مرمت کے لئے اس گرجے کو اکھیڑنے کی ضرورت پیش آئی تو کوئی بھی مزدور کام کرنے پر رضامند نہ تھا جب تک کہ پادری نے دیوار سے پہلا پتھر خود نہ اکھیڑ دیا۔

ترجمہ ــــ مہدی علی خاں

خیالاتِ پریشاں

دامنِ شوق چاک کر دست کشِ وفا نہ بن ۔۔۔ سر کو خمِ نیاز دے ہمسرِ آستا نہ بن
مجھ سے الم نصیب کو دے نہ فریبِ آرزو ۔۔۔ دشمنِ جاں نہ ہو مرا زیست کا آسرا نہ بن
وضعِ ثبات و خوئے ضبط ہمسرِ دردِ دل نہیں ۔۔۔ صبر و سکوں پہ خاک ڈال یا ستم آشنا نہ بن
دستِ جنوں و بحرِ عشق منزلِ غرق و گمرہی ۔۔۔ منّتِ ناخدا نہ کھینچ پیرو رہنما نہ بن
گوشۂ خلوتِ حرم شرطِ خدا رسی نہیں ۔۔۔ فطرتِ زاہدانہ رکھ رندِ شرابخوا نہ بن
فقر ہے بے تعلقی خاک نشینِ انکسار ۔۔۔ مسندِ زر نہ کر قبول خوگرِ بوریا نہ بن
شیوۂ اہلِ دل نہیں فکرِ مآلِ دردِ دل ۔۔۔ پیروِ خام کاریٔ عقلِ گرہ کشا نہ بن
رہروِ جادۂ جنوں رسم و رہِ وفا نہ بھول ۔۔۔ شکوۂ خارِ غم نہ کر نالہ کشِ جفا نہ بن
راہ گرائے دشتِ شوق دیکھ نہ اپنی جاں گنوا ۔۔۔ عشق کے خارزار میں تجھ سے کچھ آئیگا نہ بن
گردشِ آسماں سے تو سیکھ ادائے زندگی ۔۔۔ برق پہ آشیاں بنا دشمنِ آشیا نہ بن
فکرِ مآل سے گذر چھوڑ خدا پہ عاقبت ۔۔۔ نغمۂ جانفزا سنا مستِ مئے مغا نہ بن
اچھی ہے میری بیکسی کر نہ نگاہِ التفات ۔۔۔ چھوڑ خیالِ دلدہی مجھ سے تو باوفا نہ بن
ایک خیالِ خام ہے کیفِ مدام کی ہوس ۔۔۔ خمکدۂ حیات میں سرخوشِ مدعا نہ بن

حسرتِ زندگی ریاضؔ عشق میں مصلحت نہیں
ہجر میں سخت جاں نہ ہو اپنے لئے بلا نہ بن

ریاضؔ عباسی امروہی

بادام کہ دلیا

تم بادام کھاتے ہو کہ دلیا؟ —

نرم نرم دلیا کہ سخت سخت بادام؟

دلیئے میں شکر ڈالتے ہو اور کچھ دودھ؛ وہ لئی سا بن جاتا ہے میٹھی لسی جھٹ تمہارے حسم کو چمٹنے والی!
اور اسی طرح تم اُس سے لطف اُٹھاتے ہو گے گاؤتکیے کا سہارا لینے والے آرام پسند! دلیئے اور تکیے کی دلدل میں پھنسنے والے یاں کا!
سب جانتے ہیں کہ نرم نرم مصنوعی خوراکوں نے عیش پسند انسان میں حیوانیت کی بہت کم طاقت چھوڑی ہے
پکی پکائی نرم جلد حلق سے اتر جانے والی خوراکیں طاقت آزما نہیں ہوتیں بلکہ ضعف پیدا کرتی ہیں چھنا ہوا آٹا، لئی سا دلیا، حلوے
کھیر، فیرنیاں، انسانی بھینس کے لئے بلا کی دلدلیں ہیں جہاں وہ اپنی سستی میں پڑی ستاتی ہے، اس کا دودھ دوہ لو،
اُس سے کٹڑے حاصل کر لو، بچوں کو دودھ پلواؤ مگر وہ جنگلی بھینسے کا زور وہ پھوے ہوتے نتھنے جنہیں دیکھ کر شیر بھی کنارہ کر جائے
ان کا نام و نشان بھی نہیں۔

انسان کی قدرتی غذا پھل تھی بعض کہتے ہیں اناج تھی۔ جو کچھ بھی تھی اور ہے وہی خوراک انسان پیدا کرنی ہے۔
وہی صحیح انسانیت کو قائم رکھتی ہے۔ جو سخت ہو، نرم بھی ہو تو ذرا سختی مائل ہو، اسے کچھ چبانا پڑے گویا اس سے ہاتھا پائی ہو
کچھ ہاتھوں کو کچھ انگلیوں کو کم از کم دانتوں کو دہن کے لعاب کو اس سے واسطہ پڑے۔

محض نگلنے کے لئے تو صرف پانی قدرت نے بنایا ہے اسی لئے اس کے لئے پینے کا لفظ ہے۔ خوراکیں کھائی جاتی ہیں
پی نہیں جاتیں اور جو خوراک زیادہ نرم پی گئی وہ جزو بدن ہونے سے رہی۔

کوئی کون مشہور جرمن ماہر غذائیات کا خیال ہے کہ مٹر بھی کچے یا ادھ پکے کھانے چاہئیں اس طرح کہ انہیں منہ میں خوب
پھرایا جائے چبایا جائے پھر وہ طاقت دیتے ہیں۔ غرض جتنی کم کوئی خوراک پکائی جائے گی اتنی ہی صحت مند آدمی کے لئے وہ زیادہ صحت
بخش ثابت ہو گی صحت مند آدمی کے لئے! کہ اگر ان باتوں کو پڑھ سن کر کوئی جسم و قلب کا منحنی کچے چنے چبانے لگ جائے اور پھر پیٹ کے
درد سے نڈھال ہو کر لگے راقم کو کوسنے تو الزام بر عقل و نقل منحنی اور بندہ بری الذمہ پرانی عادتیں اور پالی پوسی کمزوریاں جاتے جاتے ہی جاتی ہیں
لیکن کچھ بھی ہو پھر بھی بادام سے صاف انکار نہ کرو اور دلیئے کو دو دو سلام۔ بادام کو کاٹو چباؤ منہ میں لطف اٹھاؤ جسم کا جزو بناؤ دلیا کھاؤ گے تو لئی سی بن کر لیٹ جاؤ گے
زندگی کی نرمیوں سے پیار کرنا چھوڑ دو دنیا کی سختیوں کو اپنا بناؤ سختی تمہاری اپنی کوشش سے نرمی بنے گی تو تمہیں اس کی نرمی کا پورا لطف آئے گا
بادام کھاؤ اور بادام ہی بن جاؤ تمہارے جسم میں تمہاری روح میں اک ذرا سی سختی مضبوطی اک ذرا سی قدرتی مٹھاس ہو اور طاقت ہو اپنے دردو دروں کی سہنے کی!

د ب

لاہور ۱۴ مئی ۱۹۳۲ء

محفل ادب

اے ری سکھی سبیاں ارہر ہیں جھانکیں

شام کا سہانا وقت تھا۔ خوبصورت گدھے ریشمی کھیتوں میں کلیلیں کر رہے تھے۔ ان کی سریلی آوازوں کا پرکیف نغمہ ہوا میں ایک ارتعاش اور ترنم پیدا کر رہا تھا۔ گوبر اور سڑے ہوئے پتوں کی بھینی بھینی بدبو سے ہوا میں گرمی سی تھی۔ کیا ہی خوبصورت منظر تھا۔ ادھر کوڑے کے ڈھیر لگے ہیں۔ ادھر گوبر کے اونچے اونچے ٹیلے پہاڑوں کا منہ چڑا رہے ہیں۔ سامنے کچھ خوبصورت بھینسیں کیچڑ کے ملائم اوورکوٹ پہنے ٹہل رہی ہیں۔ ان کے بچے بھی کیچڑ کی خوبصورت جاکٹیں اور شلواریں پہنے ٹہل رہے ہیں۔ کیا ہی پرفضا اور روح پرور سماں ہے،

سامنے ارہر کے سرسبز کھیت تھے۔ میری گاڑی کے پہیے کی سی خوبصورت آنکھیں اس مخملی کیچڑ کی طرف متوجہ تھیں جو میں اپنی نازک انگلیوں سے، ہاں نازک انگلیوں سے، یعنی ان انگلیوں سے جن پر چکّی کے ملائم دستے کی رگڑ سے گٹے پڑ گئے ہیں۔ وہ انگلیاں جن پر ناخن کا گول تاج ہے۔ وہ ناخن جن کے کناروں میں گائے کا گوبر ٹھنس کر اس طرح وہیں کا وہیں رہ گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ناخن کے تاج پر سینگ کی گوٹ لگی ہے ہاں تو میں اپنی انہیں حسین انگلیوں سے تال میں سے مخملی کیچڑ نکال نکال کر ایک ٹوکری میں رکھ رہی تھی۔ میری نظر ارہر کے کھیت کی طرف کسی سرسراہٹ کی وجہ سے متوجہ ہوئی، کچھ شبہ سا ہوا کہ کوئی گائے یا بھینس پاگتا ہے مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا

میں پھر اپنے دلچسپ کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایک دم سے میری کمر پر کوئی تین پاؤ وزنی مٹی کا ڈھیلا اس زور سے آکر لگا کہ ٹوٹ کر کھیل کھیل ہو گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ غور سے دیکھا کہ کون ہے؟ موٹی موٹی اٹھانوے ایسی گالیاں اس نامعلوم ڈھیلا پھینکنے والے کو نہایت ہی کھری کھری سنائیں مگر وہاں تو کوئی نہ تھا۔ میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد کنوئیں کے رہٹ چلانے کا موٹا سا ڈنڈا میری اس نازک کمر پر آکر لگا جس کی امداد سے میں ڈیڑھ من کی گٹھڑی اٹھا لیتی ہوں۔ میں نے جل کر موٹی موٹی گالیاں دیں۔ وہ لکڑی جو ہوئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہاں تو کوئی اور ہی ہے۔ وہ جو مجھے اپنی بھینس اور تمام بیلوں سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ جو اگر آج مجھ سے کہے تو تمام اپنے وہ اپلے لٹا دوں جو میں نے سال بھر میں سکھا کر رکھے ہیں وہ جس کو کہ میرا جی چاہتا ہے کہ ناشتہ

کے لئے ڈھائی پاؤ پکی مکا کی روٹی پیاز کی دو گٹھیوں کے ساتھ روز کھلاؤں۔ وہ جس کو کہ میرا جی چاہتا ہے کہ بھر بھر کلھیاں روز شیرہ پلاؤں.......... وہاں تو وہ کھڑا ہے جو مجھے بیل سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ کھرپے سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ ہنسیا سے بھی زیادہ بانکا ہے۔ قصہ مختصر وہاں تو سیاں تھے۔ ارہر میں سے جھانک رہے تھے!!

بس اُن کے دیکھتے ہی میری حالت ہی عجیب ہوگئی۔ میری جبین ناز پر جو بھینس کے ماتھے کی طرح خوبصورت اور سجل ہے شرم وحیا کی سراون چل گئی۔ میں نے سیاں کے چہرہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ خوبصورت چہرہ جو گول کدو کی طرح ہے۔ اور جوانی اور محبت کے روپ سے نئے کھرپے کی طرح چمکتا ہے۔

وہ بیل کی سی بڑی بڑی آنکھیں جیسے معلوم ہو کہ اپلے تھاپنے والی ناند میں آج بنیا پانی بھرا ہے۔ اس خوبصورت چہرہ پر کھدر کی دوہری چادر کا پگڑ کیا بہار دے رہا تھا!! گھڑے کے برابر پگڑ یا وہ خوبصورت پگڑ جسکی وجہ سے زمیندار کے جوتے کا روئی کا گالہ بنکر سیاں کے سر کو ضرب پہنچانے کے بجائے گویا سہلاتا ہے۔ وہ پگڑ جسکی بدولت سیاں جب زمیندار کے یہاں پٹنے جاتے ہیں تو لگان کا روپیہ جوں کا توں باوجود مار کھانے کے واپس لے آتے ہیں۔

میں نے کیچڑ اپنے داہنے ہاتھ میں اٹھائی کہ جیسے مارونگی۔ ایک مسکراہٹ سیاں کے چہرہ پر نمودار ہوئی جو چشم زدن میں پھیل کر دونوں کانوں تک پہنچی۔ انہوں نے اپنی آنکھیں کچھ مرکھنے بیل کی طرح مگر شرارتاً جھپکائیں کہ میں پاربتی کی طرف چلائی۔ ــ اے ری سکھی سیاں ارہر میں جھانکیں۔

پاربتی اُپلے تھاپ رہی تھی۔ اس نے کھیت کے کنارہ سے مڑکر مجھے دیکھا۔ سیاں میری طرف لپکے.... اور ادھر سے پاربتی نہایت ہی ملائم بغیر پنے ہوئے اُپلے کا گولا لیکر دوڑی۔

سیاں کو میں نے کیچڑ کی بارش سے روکا۔ مگر جو شخص اتنا بہادر ہو کہ زمیندار کے جوتوں سے نہ رک سکتا ہو وہ کیچڑ کب شمار میں لاتا۔ انہوں نے دُور کر سب سے پہلے میری پیٹھ پر بڑے زور سے گھونسا مارا کہ اس گڑ کی بھیلی کی مٹھاس میرے دل و جگر میں بیٹھ گئی۔ اور پھر میری سیاہ بھینس کے نپچے کی سی خوبصورت کلائی کو پکڑ کر اس زور سے مروڑا ہے کہ میں درد کی تکلیف کی وجہ سے چیخ کر بیٹھ گئی۔ وہ درد جس کی لذت جبتک رہی جبتک بازو درد کرتا رہا۔

اتنے میں پاربتی گوبر کا پورا گولا لئے میری امداد کو پہنچی۔ سیاں ہنس تو رہے ہی تھے۔ بولنے کے لئے جو منھ کھولا ہے۔ تو پاربتی نے گوبر کا پورا گولا سیاں کے چہرہ پر اس زور سے مارا کہ آدھے گوبر سے تو آنکھیں بند ہوگئیں اور آدھا اُن کے حلق کے پار اتر گیا۔

میرا ہاتھ چھوٹ گیا۔ پاربتی اور میں...... ہم دونوں بھاگیں..... دور سے ہم دونوں سکھیاں گا رہی تھیں ــ
اے ری سکھی سیاں ارہر سے جھانکیں۔

اور سیاں تال کے میلے پانی سے کلیاں کر رہے تھے۔ (ندیم)

ہومر اور مصطفےٰ کمال

یونان کے مشہور شاعر ہومر کے متعلق بہت اختلاف ہے - بعض کا خیال ہے کہ وہ خرافیاتِ یوناں کی ایک فرضی ہستی ہے - اور بعض کا گمان ہے کہ وہ حقیقتاً ایک شاعر تھا - اور الیڈ کی رزمیہ داستان اس نے لکھی تھی -

مصطفےٰ کمال پاشا صدر جمہوریہ ترکی کی رائے ہے - کہ ہومر یونانی الاصل نہ تھا - بلکہ وہ ترکی الاصل تھا ایشیائے کوچک میں پیدا ہوا تھا - اور اس کا نام عمر تھا جو بعد کو ہومر ہو گیا تھا -

رہا یہ امر کہ ایک ترک نے یونانی زبان میں کتاب کیوں لکھی - سو یہ کوئی عجیب بات نہیں - کیونکہ بہت سے ترکوں نے دوسری زبانوں میں کتابیں تصنیف کی ہیں اور لسانیات کی جدید تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے - کہ یونانی زبان کے بہت سے الفاظ ترکی زبان سے لئے گئے ہیں -
(نگار)

میرے محبوب

اگر تم مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو - تو صرف محبت ہی کی خاطر محبت کرو -

پھر یہ نہ کہو کہ میں تم سے صرف اس لئے محبت کرتا ہوں کہ تمہارا تبسم روح پرور ہے ،

یہ بھی نہ کہو کہ میری نگاہیں اپنے اندر جادو کا اثر مستور رکھتی ہیں ،

یہ بھی نہ کہو کہ میرا طرزِ تکلم یا میرا نرم سلوک اپنے اندر محبت کا پیغام لئے ہوئے ہے ،

اور یہ بھی نہ کہو کہ میرے کسی خیال نے تمہارے خیال سے موافقت کی تھی - یا کسی خاص موقع پر میں نے تمہارے ساتھ نہایت محبت آمیز برتاؤ کیا تھا -

میرے محبوب! اس لئے کہ یہ سب عارضی ہیں - اور انقلابِ زمانہ کے ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہیں - اور یہ بھی ممکن ہے - کہ میں صرف تمہاری خاطر اس محبت کا ایک بالکل نئے طور پر اظہار کروں - اور اس لئے یہی محبت جو پہلے "محبت" تھی - شاید اب "محبت" باقی نہ رہے ،

ہاں اگر تم مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہو - تو صرف محبت ہی کی خاطر محبت کرو !

میرے محبوب تمہاری محبت اس امر پر مبنی نہ ہونی چاہیئے - کہ تم نے کسی مصیبت کے وقت میری اعانت کی تھی اور میری پُرنم آنکھوں سے آنسو پونچھے تھے ،

کیونکہ جب میں اس بلا سے رہائی پا جاؤں گی اور پرسکون حالات میرے لئے پیدا ہو جائیں گے تو میں اپنی مصیبت اور غم بھول جاؤں گی !

پھر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اس کے ساتھ تمہاری محبت کو فراموش کر دوں ؟

میرے محبوب صرف محبت ہی کی خاطر مجھ سے محبت کرو - تاکہ آئندہ بھی یونہی محبت کرتے رہو - اور محبت کی ابدی فضا میں تمہاری محبت کا نغمہ کبھی خاموش نہ ہو -
(جہانگیر)

مطبوعات موصولہ

معراج صدق وصفا مع صداقت معراج علا۔ حضرت صدیق اکبر کی ولادت وخدمات خلافت کا مختصر منظوم مرقع۔ شعر خوب ہیں۔ حجم بڑی تقطیع کے ۱۸ صفحات قیمت ۴ر ناشر ہیرالال پریس ہوامحل بازار جے پور

میلاد النبی پروجکٹ۔ بچوں میں مذہبی شوق پیدا کرنے کے لئے بہت اچھی اور نئی قسم کی کتاب ہے۔ ۶۴ صفحات۔ قیمت ۸ر ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

تکمل ہندسہ عملی۔ یہ کتاب ابتدائی جماعتوں کے لئے محمد منیرالدین صاحب بی۔اے۔ نے تالیف کی ہے اردو زبان میں ہندسۂ عملی کے متعلق یہ بہت اچھی کتاب ہے۔ ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

توبہ ستم۔ گولڈ سمتھ کے ایک منظوم افسانے کا منظوم ترجمہ از مولوی مختار احمد صاحب بدر مچھلی شہری۔ ترجمہ بہت اچھا اور دلچسپ ہے۔ قیمت ۳ر ناشر حکیم برہم صاحب گورکھپور۔

مغنمات معروف بہ خزینۂ صنعت حصۂ اول کپڑوں پر بیل بوٹے کاڑھنے کی آسان ترکیبیں درج ہیں بیلوں اور پھولوں کے کئی نمونے اس کتاب میں ہیں قیمت ۱۲ر ناشرہ محترمہ بلقیس جہاں بیگم۔ بر مبیں دلہن بیگم سید محمد صابر حسین بی اے۔ گلاب خانہ آگرہ۔

گلزار شمس یہ جناب شمس الحق صاحب شمس رام نگری کا مجموعۂ کلام ہے۔ زبان صاف ہے۔ چار آنے کے ٹکٹ بھیج کر مصنف سے رام نگر بنارس کے پتے سے منگوائیے۔

یادگار شارب۔ یہ خوبصورت چھوٹی سی کتاب نواب زادہ حامد علی خاں صاحب شارب کی یادگار کے طور پر نہایت نفیس آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔ اس میں مرحوم کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور ان کا تمام کلام جمع کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر ہے جو زیادہ نہیں۔ ناشر راؤ بہادر عبدالحمید خاں منظر باغپت ضلع میرٹھ۔

بچیوں کا قاعدہ یہ قاعدہ تصویردار ہے۔ اور اس لئے بچے اسے دلچسپی سے پڑھ سکتے ہیں۔ قیمت درج نہیں معمولی ہوگی۔ مکتبہ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے منگوائیے۔

قاعدۂ فارسی یہ نئی طرز کا فارسی قاعدہ ہے۔ تصویروں نے اسے اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ قیمت ۶ر۔ ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔